صبحِ بہار

اختر شیرانی کی نظموں کا پہلا مجموعہ

مکتبہ انوکھا جاسوس، کلاں محل دہلی

قیمت قسم دوم آٹھ روپے

مندرجات

صبح بہار حصّہ اوّل

اختر ستان حصّہ دوم

لالۂ طور حصّہ سوئم

طیورِ آوارہ حصہ چہارم

گیت

شہناز حصہ پنجم

ماہیے

شہرود حصہ ششم

نغمۂ حرم حصّہ ہفتم

نذر

"س"

شاہِ شمشاد قداں، خسروِ شیریں دہناں — کہ بمژگاں شکند قلبِ ہمہ صف شکناں
مست بگذشت و نظر بر منِ درویش انداخت — گفت کاے چشم و چراغِ ہمہ شیریں سخناں
تا کے از سیم و زرت کیسہ تہی خواہد بود — پندِ ما بشنو و برخور ز ہمہ سیم تناں
کمتر از ذرّہ نہ ای، پست مشو، مہر بورز! — تا بخلوتگہ خورشید رسی چرخ زناں
دامنِ دوست بدست آر و ز دشمن بگسل — مردِ یزداں شو و ایمن گذر از اہرمناں
بر جہاں تکیہ مکن، ور قدحے می داری! — شادیِ زہرہ جبیناں خور و نازک بدناں

گفت حافظ من و تو محرمِ ایں راز نہ ایم
از مئے لعل حکایت کن و سیمیں ذقناں

تقریب!

کہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پہ نازاں
ہزاروں جنّتیں آباد ہیں تخئیلِ اختر میں!

(آغا حشر کاشمیری)

پیش لفظ

یک دست جامِ بادہ و یک دست زُلفِ یار
رقصِ چنیں "بہ صحنِ گلستانم" آرزو است!

(مولانا رومی)

سن اشاعت ۱۹۵۷ء
مقام اشاعت دہلی
ادارہ اشاعت "مکتبہ انوکھا جاسوس" کلاں محل دہلی
مطبع اشاعت :۔ محبوب المطابع دہلی

قیمت برائے ہند و پاکستان
قسم اوّل مع تصاویر ۔ دس روپے
قسم دوم — آٹھ روپے

اُردو کی رومانی شاعری اور اختر شیرانی

ایک مقالہ جو پٹنہ کالج میں پڑھا گیا

پروفیسر سید اختر احمد اختر اورینوی ایم اے

اُردو شاعری کا موجودہ دور عہد رومان کہا جا سکتا ہے۔ دورِ جدید کی شاعری اپنے تمام اختلافات کیساتھ ایک مشترک روح رکھتی ہے۔ جو رومانیت کے سرچشمے سے سیراب ہو رہی ہے۔

شاعری کیا ہے؟ یہ بھی زندگی کی مختلف کیفیتوں کی طرح ایک کیفیت ہے اور رومانیت ایک خاص انداز کیفیت زندگی ہے۔ نفس کی ایک مخصوص حالت کو رومانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس میں جذباتی کیفیات عقلی کیفیات سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں اور تخیل کے سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ لگ جاتا ہے۔

تخیل و جذبات کا اُبھر جانا رومانیت کی روح رواں ہے۔ رومانیت کی ایک خصوصیت "انفرادیت" ہے، مگر انفرادیت، رومانیت کا سبب نہیں نتیجہ ہے۔ رومانی تخیل کائنات کو ایک نئے طور پر دیکھتی ہے اور رومانی جذبات عالم کو ایک جدید رنگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں، اور اُس کا لازمی نتیجہ انفرادیت ہے۔

رومانی شاعری زندگی کی تعمیرِ نو ہے۔ یہ روح کا ارمان بہشت آفرینی ہے انسانی دل کی ازلی تشنگی کی بے قراریاں اس کی رگِ جاں میں پھڑکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ رومانیت برنائی حیات کا خواب بیداری ہے جب نفس پہ رومانی رنگ چڑھتا ہے تو

دل ایک بالیدگی محسوس کرتا ہے اور روح کا افق وسیع تر ہوتے ہوتے لامحدود ہو جاتا ہے اور اس افقِ بے کراں کی آغوش میں آفتاب ہائے تازہ انوار فشاں ہوتے ہیں۔ رومانی شاعر جب مناظر فطرت اور مظاہر حیات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ تو وہ لطف اندوزی باطنی ہوتی ہے اس وقت حسن و صداقت ہم آغوش نظر آتے ہیں۔

موجودہ رومانی شاعری نفسیاتی اثر کے ماتحت ظہور پذیر ہوئی ہے۔ یہ تجدید ہے اردو شاعری کی رومانیت اولیں کی جس طرح انگریزی شاعری میں ایک شیکسپیر کا رومانی دور تھا اور دوسرا ورڈزورتھ اور شیلے کا اسی طرح اردو شاعری کا پہلا رومانی دور میر و مرزا کا عہد تھا۔ اور دوسرا رومانی دور عہد حاضر ہے۔ رومانیت کے عروج ہی کے زمانہ میں یعنی غالب و مومن کے دور میں "کلاسیت" نے جڑ پکڑ لی تھی حالات کا اختلاف یا بزبان دیگر ماحول کا اختلاف دونوں رومانی دوروں میں مابہ الامتیاز ہے جو ذہنی۔ اقتصادی سیاسی حالات آج موجود ہیں وہ اس وقت نہ تھے۔ لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں ہیں۔ کیوں کہ دونوں پر جذبات و تخئیل کی حکومت ہے۔

قبل اس کے کہ موجودہ رومانی شاعری کی تخلیق و تاسیس اور ارتقاء و عروج پر نظر ڈالوں۔ نفسی حیثیت سے ادب میں انقلابات کے وجوہ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں ادب حیات کا "نبض پیما" ہے۔ زندگی کو اگر آپ ایجاز بلیغ کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہوں تو ادب کو دیکھئے۔ عروس حیات آئینہ ادب میں اپنی صورت دیکھتی ہے۔

پہلے نفس میں انقلاب ہوتا ہے۔ پھر اس کا اثر زندگی کی مختلف کیفیتوں میں عریاں نظر آتا ہے۔ اگر انقلاب نفسی کے اظہار کی اور راہیں مسدود ہیں تو انقلاب کا اثر ادب میں بہت گہرا نظر آئے گا۔ اب آیئے حقیقتِ انقلاب کا تجزیہ کیا جائے۔

انسان کی روح بھی اس کے جسم کی طرح " اجزائے مختلفہ" سے بنتی ہے۔ گو "کل" کی طرح یہ مختلف "جز" بھی لطیف، غیر مرئی اور غیر مادی ہوتے ہیں۔ جب جسم میں کسی عنصر کی کمی ہو جاتی ہے، تو اس کی شدید خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ اگر میٹھا کھاتے رہیئے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ نمک کی طرف آپ کو ناقابل برداشت رغبت ہوگی۔

حیوانی دنیا میں بھی امر مذکور کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ہرنوں کا گروہ ناگاہ، امریکہ کے جنگلوں کے شاداب سبزہ زاروں کو چھوڑ کر سوکھی ہوئی بھیلوں کی طرف دیوانہ وار دوڑ جاتا ہے۔ تاکہ وہاں جا کر نمک چشی کرے۔ جب نمک کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو سارا گلہ چراگاہوں کو واپس آجاتا ہے۔ سیاسی، معاشی، مذہبی و معاشرتی انقلابوں کی بنیاد بھی نفس ہی میں پڑتی ہے۔

انسانی روح کے اجزائے تعمیری کی کمی و بیشی نفسی انقلاب کا سبب اولیں ہوتی ہے۔ اگر انسانی نفس کو صرف عقلی فضائیں ملتی رہیں۔ تو ایک وقت وہ جذبات سے سیراب ہو جاتا ہے تو نفس عقل کی بھوک محسوس کرتا ہے ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

موجودہ رومانی رجحان مظہر ہے۔ اس نفسی انقلاب کا جو معاشرہ کی روح میں آیا اور یوں تو ظاہراً رد عمل ہے لکھنؤ اسکول کی "کلاسی" Classicism شاعری کے خلاف مگر باطناً خود کلاسی شاعری مظہر تھی۔ اس دور کی نفسی حالت کی معاشرہ کا "نفس اجتماعی Collective Soul" ادب کے ذریعے ظہور کرتا ہے۔

اب آئیے، سرراہے، ذرا کلاسیت" Classicism اور اردو کی کلاسی شاعری کا جائزہ لے لیا جائے۔

لکھنؤ کی کلاسیکل شاعری

دہلی کی بربادی کے بعد لکھنؤ کا عروج ہوا، اور آرزوئے جدت میں لکھنؤ اسکول کی بنا پڑی یوں تو مصحفی دہلوی نے خالص کلاسی شاعری کے نمونے پیش کئے۔ مگر اس صنف کو ناسخ اور ان کے پیرووں نے تکمیل کے ساتھ برتا۔ لکھنؤ نے دہلی سے الگ ہوکر ایک جدید تہذیب کی ابتدا کی۔ مگر اس جدت میں زندگی نہیں تھی ہندوستان کے اردو نواز طبقہ پر اضمحلال طاری ہو چکا تھا۔ ہر سو پسپائی تھی۔ ہر جانب موت لکھنؤ کی نئی تہذیب حیات سے ہم کنار نہ تھی۔ بلکہ وہ ایک سوانگ تھی زندگی کا۔

صرف ادب و شاعری میں نہیں بلکہ تہذیب کے ہر شعبہ میں لکھنؤ پر ایران کی کلاسیت کا اثر پڑا جس طرح پوپ اور ڈرائیڈن کے زمانہ میں لاطینی کلاسیت کا انگریزی ادب، و تمدن پر اثر پڑا تھا۔

کلاسیت کی خصوصیات یہ ہیں کہ نفس شعر سے زیادہ قواعد و ضوابط کی پابندی الفاظ کی تراش خراش، آرائش و زیبائش اور صنائع و بدائع پر زور دیا جاتا ہے۔

ایسی شاعری کی مثال حنوط شدہ لاشوں کی سی ہے۔ خارجی شوخی و طرحداری پر تو کافی وقت صرف کیا جاتا ہے۔ مگر روح کا فقدان ہوتا ہے۔

کلاسی شاعری میں انفرادیت کا فقدان تھا۔ کیونکہ انفرادیت نتیجہ ہے زندگی کا۔ اور کلاسی شاعری ایک دم توڑتی ہوئی تہذیب کی زبان تھی۔ دبستان لکھنؤ نام ہے بےچارگی کی تقلید کا۔ بیمار جذبات کا۔ مدفون تخیل کا!

کلاسیت کی خوبی یہ ہے کہ اس دبستان میں بےراہروی خودسری و جنوں پسندی نہیں، جذبات کی باگ کامل طور پر عقل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کلاسیت ناکاروں کے ہاتھوں میں فرسودگی اور موت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ مگر باکار شخصیتوں کے قبضے میں آکر تناسب فن کی بہترین مظہر ہوتی ہے۔ اردو کی خوش بختی سے لکھنؤ میں ایک نابغہ "Genius" پیدا ہوا جس نے کلاسیت اور رومانیت کو ہم دست کر دیا۔ نابغہ قواعد کا پابند نہیں ہوتا۔ بلکہ قواعد کو پابند کر لیتا ہے۔ وہ کسی دبستان (School) کا پیرو نہیں بلکہ دبستان اسکی پیروی کرتے ہیں۔ وہ ماحول سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے، مگر ماحول پر بھی اپنی عظمت کی مہر لگا جاتا ہے۔ نابغہ اپنے زمانے کا فرزند تو ہوتا ہے، مگر آنے والے زمانے کا باپ بھی۔

انیس کلاسیت کے تقلیدی دور میں رہ کر بھی کلاسیت سے بلند تھا۔ اسکی شاعری میں ہمیں کلاسیت اور رومانیت کی خوبیاں نظر آتی ہیں اور ان کی برائیاں وہاں ناپید ہیں۔ انیس کا آرٹ یونان کے مشاہیر ادب شعر کے فن سے مشابہ ہے

اس استثناء کے علاوہ دورِ کلاسیت کی شاعری ایک فرسودہ مضمحل۔ بیمار۔ بے جان اور غیر فطری شاعری تھی۔

جس طرح نا امیدی کے قلب میں امید کی چنگاری روشن ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح کلاسیت کی تاریکیوں میں افقِ بہار پہ ایک تابندہ ستارۂ صبح طلوع ہوا ہر چند کہ شاد کلاسی سکول کی پیداوار تھے۔ مگر ان کی شاعری میر اور مومن کی یاد دلاتی ہے۔ یہ تھی رومانیت کی صبح صادق۔ اس کے بعد رومانیت کے شفق زاروں میں نظیر اکبر آبادی اور حالی نے لالہ کاریاں کیں۔

اردو شاعری سے نظیر کا وہی تعلق ہے جو برنس Burns کا انگریزی شاعری سے ہے۔ دونوں نے رومان کی بانسریاں بجائیں مقامی لے کے ساتھ نگران کے نغمہ بلا کے دلفریب تھے۔ کبھی پرستان سے آنے والے گیتوں کی طرح اور حالی کی مثال ورڈز ورتھ (Wordsworth) اور کولرج Coleridge سے دی جا سکتی ہے۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری "لیریکل بلاڈز" Lyrical Ballads کے دیباچہ Preface کی طرح ہے۔ دونوں دیباچوں نے اپنی اپنی شاعری میں انقلاب برپا کر دیا۔ غرض نظیر۔ حالی اور شاد۔ رومانی شاعری کے علم بردارانِ اولیں ہیں۔

اب میں رومانی شاعری کے

اُردو میں رومانی شاعری کا دوسرا دور۔ پس منظر (Back Ground) اور ماحول Environment اور ان ہیجانات و تحریکات

کی طرف رجوع کرتا ہوں جنہوں نے اس پر اپنا اثر ڈالا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سارے ہندوستانی معاشرے پر ایک تشائم اثر تھا۔ ایک اعلیٰ تمدن کی سر بفلک عمارت کے کھنڈروں کی اینٹیں بٹ رہی تھیں ہر طرف تخریب۔ ہر سو تباہی تھی۔ فطرت ایک ایسی نسل کو مٹا رہی تھی جس نے اپنے مٹنے کا سامان خود کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں لوگوں نے اپنی قبریں کھودلی تھیں اور اب غیر ان کی لاشیں دفن کر رہے تھے۔ ان بدبختوں کو تو اپنی تباہی کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔ نوزائیدہ نسل جو اگرچہ آدم کے گناہ کی وارث تھی، اپنے دل میں ایک بے اطمینانی محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ فردوس گم شدہ میں اس سے تو خطائیں سرزد نہیں ہوئی تھیں۔ وہ کیوں سزائیں بھگتے۔ بیٹا اپنے باپ سے مختلف بھی ہوتا ہے اور مشابہ بھی۔ جدید نسل کی روح نیم معصوم ضرور تھی۔ لہٰذا یہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن نہ تھی۔ اسے جنت کی بازیافت کی آرزو ستانے لگی تھی۔ لوگ چاہتے تھے کہ حالات بدلیں۔ یہی حالت تھی کہ مغربی تہذیب کے اقدام نے معاشرہ کو اور چونکا دیا۔ مغربی تعلیم و تہذیب اور معاشرت کا اثر ہوا جس کے چراغ کاشانۂ اغیار میں جلتے نظر آئے۔ عیسائی مشنریوں کی تگ و دو نے آرام سے سوئے ہوئے عقائد تک کو جھنجھوڑ کر تحت الشعور کے گوشہ عافیت سے جگایا۔ یہ بے اطمینانی کا دور تھا۔ جو اپنا دامن ہمارے زمانے تک وسیع کئے ہوئے ہے اور یہی رومانیت کا بیج ہے۔ رومانیت نام ہے روزمرہ کی بےکیفی سے اجتناب کا۔

عین اس وقت دو تحریکیں آگے آئیں۔ ایک تو علیگڑھ کی تحریک اور دوسری پنجاب کی۔

علی گڑھ کی تحریک یہ تھی کہ فرسودگی کے خیال کو معاشرے سے رفع کرنا چاہیئے اور جدید بنیادوں پر تہذیب کی عمارت اٹھانی چاہیئے۔ اس تحریک سعد کا یہ نتیجہ ہوا کہ سماج میں ایک روشن خیال طبقہ پیدا ہو گیا۔ جو نئی تعلیم سے آراستہ تھا۔

دوسری تحریک کا مرکز پنجاب تھا۔ اس تحریک کی یہ کوشش تھی کہ لوگ پھر تہذیب حجاز کی طرف رُخ کریں۔ پھر وہی اگلے ولولے پیدا ہوں۔ پھر وہی سادگی ہو۔ اور روح کی بیداری۔ اس تحریک کی بنیاد جذبات پر تھی اور یہ عقل کے میدان میں بھی جذبات کے گل بوٹے اگانا چاہتی تھی۔

لازماً دوسری تحریک کا اثر پنجاب کی رومانی شاعری پر پڑا۔ موجودہ بے کیفی سے انحراف اور ایک نئی دنیا کی تعمیر یہ تھی بنیاد رومانی شاعری کی۔ زندہ دلانِ پنجاب نے اس بے کیفی کا علاج ماضی میں تلاش کیا۔ اور تہذیب کا نمونہ تہذیب حجاز کے پرشکوہ آثار میں ڈھونڈا۔ اس گروہ کے سالارِ کارواں اقبالؔ ہیں۔

پہلی تحریک کا اثر صوبہ متحدہ میں ہوا۔ اس گروہ کے علمبردار جوشؔ ملیح آبادی ہیں۔ ان کی رومانیت ایک نئی دنیا کی تعمیر چاہتی ہے۔ یہ انقلاب کے رجز خواں ہیں۔ اس جماعت پر یورپ کی جدت نے اپنا اثر ڈالا۔ یہ مغرب پر مغرب کے جدید ترین ہتھیاروں سے ہی فتح پانی چاہتے ہیں۔ اور اوّل الذکر گروہ عربی نیزوں پر بھروسہ رکھتا ہے۔ ایک مستقبل کو ماضی کے آئینہ میں دیکھتا ہے اور دوسرا مستقبل کو مستقبل

کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے۔
جس طرح بائرن اور کیٹس تہذیب یونان کے شیدائی تھے۔ بالکل اسی طرح اقبال تہذیب حجاز کے گرویدہ ہیں اور جوشؔ انقلاب کا قرنا پھونکتے ہیں۔
انقلاب فرانس نے انگریزی رومانی شاعری کو متاثر کیا تھا اور انقلاب روس نے اردو کی رومانی شاعری پر اثر ڈالا۔
ہندوستان میں جنگ عظیم سے پہلے ہی تحریک آزادی شروع ہو چکی تھی حریت کی رگوں میں خون دوڑنے لگا تھا۔ کہ جنگ عظیم کی قیامت برپا ہوئی اور اس کے اختتام پر روس کی زاریت تباہ ہو گئی اور کتنے شہنشاہوں کی کج کلاہیاں خاک میں مل گئیں۔
جنگ کے بعد ہندوستان میں ترک موالات کی تحریک کا عروج ہوا۔ اور پھر پے بہ پے قانون شکنی اور عدم ادائیگی محصولات کی مہمیں شروع ہوئیں۔ دوسرے ممالک میں بھی انقلاب پر انقلاب ہو رہے تھے۔ ترکوں نے فرسودہ جامۂ خلافت کو اتار کر پھینک دیا۔ اور جمہوریت کی بنا ڈالی۔ ایران نے بھی جمہوری نظام کو پسند کیا۔
شہنشاہیت اور جمہوریت کے درمیان والی کڑی "آمریت" (Dictatorship) ہے۔ لہٰذا روس۔ جرمنی۔ ترکی۔ ایران وغیرہ میں بھی نظام سلطنت پسند کیا گیا کہ یہ تربیت ملک و ملت کیلئے نہایت ضروری ہے۔
ان تبدیلیوں کے علاوہ معاشرے میں ذہنی انقلاب بھی ہو رہا ہے۔ پرانے نظریئے بدل رہے تھے۔ ماضی کے قوانین پر نکتہ چینیاں زوروں سے شروع ہو گئی

تھیں فیلسفۂ اخلاق پر منظر ثانی کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ اور "نسائیات" کے متعلق لوگ زیادہ فطری طور پر غور کرنے لگے تھے۔ داعیات شباب اور جنسیات ہر چند کہ پرانے طرز کے لوگوں میں قطعی مردود تھے۔ مگر ایک طبقہ ایسا ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ جو فطرت کی پکار پر کان بند کر لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ "مجنوں" اور "سبزۂ آغاز" بہن زار کی جگہ اب "سلمیٰ" اور "عذرا" لینے لگی تھیں۔

اسی ماحول میں ہماری موجودہ رومانی شاعری پرورش پا رہی ہے۔ اور اب تک پرورش پا رہی ہے۔ ابھی ہمارے ماضیٔ قریب اور حال میں چنداں تفاوت پیدا نہیں ہوا۔

"حجازیت" اور "انقلابیت" کے دو بڑے دھاروں کے علاوہ "نیت" رومانی کی اور سمتیں بھی ہیں جن میں "وطنیت" اور حسن پسندی کو امتیاز حاصل ہے۔ "وطنیت" نے چکبست کو ترجمان بنایا اور "زلیخائے رومان" نے اختر شیرانی کو اپنا "یوسف" بنانے کے لئے چن لیا۔

اگر چکبست۔ بھیشم وارجن۔ کرشن و رام کے قصیدہ خواں ہیں تو اختر سلمیٰ کے حسن صبیح کی یاد میں نغمہ سنج ہیں۔

اقبال۔ جوش اور چکبست تینوں دور زریں (Millennium) کے خواب دیکھتے ہیں۔ اقبال کے خواب کی تعبیر حجاز میں ہے۔ جوش کی انقلاب میں اور چکبست کی ہند قدیم میں۔ یہ تینوں فرسودہ دنیا کو بدل کر ایک نیا عالم رنگ و بو تخلیق کرنا اور حالات کا مقابلہ کر کے اُسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری

پیغام عمل ہے۔ ان تینوں کی رومانیت میں عملیت ہے۔

اختر کی شاعری کا پس منظر

ان کے برخلاف اختر شیرانی کی رومانیت میں گریز و ہجرت کی تمنا کروٹ لے رہی ہے اختر نے امن و سکون کی تلاش عالم حسن میں کی وہ اس دنیا سے دور ایک نئی دنیا بسانی چاہتا ہے۔ اسکی شاعری میں رنگ جہد و عمل نہیں۔ وہ دنیا کو تبدیل کرنے کی آرزو تو رکھتا ہے۔ مگر اس میں تاب مقابلہ نہیں۔ اختر کا کلیجہ بھی ماحول کی بے کیفی اور پستی سے ریش ریش ہے۔ وہ حسن کے تبسم سے اپنے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتا ہے۔ مگر یہ تبسم قاتل اور نمک افشاں ثابت ہوتا ہے۔ اختر اس دنیا سے ہجرت کر کے ایک دوسری دنیا میں، پھولوں سے بسی ہوئی دنیا میں، حسن و رعنائی کی دنیا میں، شراب و شباب کی دنیا میں چلا جانا چاہتا ہے، تاکہ اسکی روح کو چین نصیب ہو۔ غرض حسن کا ایک وسیع تر مفہوم اختر کے لئے پیغام سکون ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اے عشق کہیں لے چل۔ اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہ عالم سے لعنت گہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے۔ اس نفس پرستی سے

دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں تلے پھرتی ہے، اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن، مہتاب نما دنیا

جنت کی طرح رنگیں، شاداب نما دنیا

للّٰلہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اختر کی شاعری کی فضا آیئے! اب ہم اختر کی نوآبادی کی سیر کریں۔ نوآبادی جس کو اس کی رومانیت نے دنیائے مثال میں بسایا ہے۔ اس جہانِ تازہ کے آسمان کے تارے زیادہ روشن اور دلفریب ہیں۔ اس کی زمین زیادہ خوش رنگ اور زیادہ خوشبودار پھولوں سے معطر ہے۔ اس کی خنک ہوائیں سے خانہ بدوش ہیں۔ وہاں کی فضا میں کیف و مستی کی ارزانی ہے۔ وہ ایک دنیائے حسن ہے۔ اختر کے سانیٹس (Sonnets) پڑھیئے۔ آپ فوراً ان کے ساحرانہ اثر سے اس خواب نما دنیا میں پہنچ جائے گا اور دیکھئے گا کہ ؏

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا

آپ کو "افق پر موجزن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں" دیکھائی دیں گی۔ آپ "ستاروں کے سمندر، ماہتابوں کے جزیرے" دیکھئے گا۔ اور وہاں ؏

سلمیٰ بھی ہے پہلو میں سلمیٰ کی محبت بھی

اختر کی تقریباً ہر نظم میں آپ کو اس کی مثالی دنیا کے جلوے نظر آئیں گے۔ کہیں وہ جلوۂ بے محابا ہو گا۔ اور کبھی اس کی ایک جھلک آرزو انگیز ہوگی۔

اختر کی شاعری کی خصوصیات اختر شیرانی کی زندگی اور شاعری کے بہت سے پہلو کیٹس Keats کی زندگی اور شاعری سے

ملے ہوئے ہیں۔ اختر نے بھی کیٹس کی طرح عالم مثال کے حسن کو عالم مجاز میں دیکھا کیٹس کی فینی اور اختر کی سلمٰے ان کی شاعری کی روح ہیں۔ دونوں شاعر ناکام کے نوحہ خواں ہیں۔

کیٹس کی طرح اختر کی شاعری شدید قسم کی جذباتی شاعری ہے۔ اختر کی نظم "اے عشق کہیں لے چل" اور "آج کی رات" جذبات شدید کے مظہر ہیں "اودیس سے آنے والے بتا" بھی درد سے چور جذبات کی ترجمان ہے۔ ملاحظہ ہو "آج کی رات" کا آخری بند ؎

ہم میں کچھ جرأتِ گویائی بھی ہو گی کہ نہیں
ہمتِ ناصیہ فرسائی بھی ہو گی کہ نہیں!
شرم سے دور شکیبائی بھی ہو گی کہ نہیں!
"یوسفِ دل" سے "زلیخا" بھی ہو گی کہ نہیں
آج کی رات! اُف اد میرے خدا آج کی رات!

"آج کی رات! اُف اد میرے خدا آج کی رات" میں جذبات کا سیلاب بند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کی شدت سے تھک کر شاعر آخری بار پُر زور اظہار جذبات کر کے دل تھام کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ایک اعلیٰ جذباتی نظم کا نہایت ہی فطری اختتام ہے۔

اختر کی شاعری میں حاسیہ Sensuous کی انداز بہت نمایاں ہے اور اس خصوصیت میں بھی وہ کیٹس کا شریک ہے۔ یوں تو خارجی مظاہر و آثار حواس کے ذریعے سے ہر دل کو متاثر کرتے ہیں۔ مگر بعض شعرا میں یہ تاثرات روح کی لطافت سے وافر حصہ پا کر جذبات کے ذریعے ظاہر ہوتے ہیں اور بعض میں سواسیہ

اطلاعات اس درجہ شدید ہوتی ہیں کہ روح کی لطافتوں کا امتزاج ان سے نہیں ہو سکتا۔ اور جذباتِ خارجی محسوسات کو بغیر داخلی رنگ دیئے ہوئے نمایاں کر دیتے ہیں۔

کیٹس اور اختر دونوں کے یہاں حواسیہ حسن پسندی ہے۔ مگر کیٹس اس منزل سے گذر کر روح کی وسعتوں میں بھی گرمِ سفر ہوتا ہے۔ وہ "حواسیہ حسن پسندی" کے بعد "حسنِ قدرت" "Beauty of Nature" اور "حسنِ صداقت" (Beauty of Truth) کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ مگر اختر کی شاعری کو شاید ابھی یہ منازل پسند نہیں گو کبھی کبھی اس کی نظر اس مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ اس بارے میں اختر پر عربی شاعری کا اثر ہے۔ امراء القیس کی طرح اختر بھی فطری جذبات کا اظہار نہایت سادگی سے کر دیتا ہے۔ اختر شیرانی کا عام رنگ ملاحظہ ہو:—

میری آغوش میں ہوگا وہ جسمِ مرمریں اُس کا
وہ اُس کے سرمئی کاکل وہ شانے نازنیں اُس کا
وہ رخسارِ حسیں اُس کے وہ حسنِ یاسمیں اُس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

تمنا و حیا کی کش مکش کیوں کر مٹاؤں گا
میں اُس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گدگداؤں گا
اور اُس کے لعلِ لب سے کس طرح بوسے چراؤں گا
وہ پھولوں اور ستاروں سے بھی شرمائے گی وادی میں

سُنا ہے میری سلمےٰ رات کو آئے گی وادی میں

اختر کی حاسیہ شاعری ایک پرا ئیقوریت (Epicureanism) یعنی انتہائی لذت پسندی کے غار میں جا گرتی ہے۔ اگر اختر ان مقامات سے گزر جاتے یا گزر جانے کی سعی کرتے رہتے تو ان کی لغزشیں زیادہ پیاری معلوم ہوتیں مگر ان کی شاعری میں ناقابلِ عفو جمود نظر آتا ہے ملاحظہ ہو ان کی لذت پسندی سے

یہ نغمے، یہ ترانے، یہ شراب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکانوں کی، یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی، یہ صحبت نازنینوں کی
یہ عمریں، یہ بہاریں، یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خلد میں یارب یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

اور ان دنوں تو ان کی شاعری میں شدید انحطاط کے آثار نظر آتے ہیں سنیئے!

ذکرِ شب وصال ہو کیا ہو گیا قصہ مختصر
جس بات سے وہ ڈرتے تھے وہ بات ہو گئی

اختر کا مخصوص آرٹ

اختر کا آرٹ بھی اس کی خصوصیاتِ شاعری میں داخل ہے اختر ایک باکمال فن کار ہے۔ وہ جن لذتوں سے خود بہرہ یاب ہوتا ہے ان سے دوسروں کو بھی پورے طور پر اپنی صنعت کے اثر سے بہرہ یاب کرسکتا ہے۔

اخترؔ کیٹس کی طرح الفاظ سے بت گری بھی کرتا ہے۔ اس مجسم تصویر کشی " (Concrete Imagery) میں اخترؔ کا بہت بڑا درجہ ہے اس کے صنم کدۂ شعر میں بہت ہی حسین و جمیل نقوش ہوتے ہیں۔ اس کے بنائے ہوئے اصنام زندگی سے بہرہ یاب نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

روپہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر
ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سر جوئبار دیکھا ہے

چونکہ اخترؔ کی بت گرانہ مصوری میں زندگی ہے۔ لہٰذا ہمیں ان بتوں میں حرکت اور آواز کا سراغ بھی ملے گا جنہیں اُسنے تخلیق کیا ہے ؎

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے پن گھٹ پر پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر، سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں!
او دیس سے آنے والے بتا

اخترؔ کی "حقیقت کی موہوم راتوں" کی طرح اس فن میں بھی "محقق" اور "موہوم" چیزیں پائی جاتی ہیں اخترؔ غیر مرئی اشیاء کی بھی تصویر کشی کرتا ہے ملاحظہ ہو ؎

او دیس سے آنے والے بتا
کیا شام پڑے سڑکوں پہ وہی دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے

اور گلیوں کی دھندلی شمعوں پر سایوں کا بسیرا ہوتا ہے
باغوں کے اندھیرے گوشوں میں جس طرح سویرا ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

یہ مرئی اور غیر مرئی نقوش علیحدہ علیحدہ پائے جانے کے علاوہ کہیں ہم دست بھی نظر آتے ہیں یعنی اختر دھندلے دھندلے منقوش اور اُبھری ہوئی قلم کاریوں کا امتزاج صناعانہ کمال کے ساتھ کرتا ہے۔ اس مقام پر اختر کا فن سحر بن جاتا ہے۔ یہ شہرت اور مادیت کا امتزاج ہے شیلے اور کیٹس کے فن کا اتحاد ملاحظہ ہو

سردیوں کی چاندنی شبنم سے کھلاتی تھی جب
باغ پر اک دھندلی دھندلی مستی چھا جاتی تھی جب
آہ وہ راتیں! وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

جب تم آجاتی تھیں، بازلفِ پریشاں تاکمر!
مشک سا گیں تا بداماں عنبر افشاں تاکمر!
آہ وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب وخیال کی دنیا سے آرزو اور ارمان کی بستی سے راز کے دھندلے رومانی نقاب کو اٹھا کر ایک "پیکر ناز" اندر سبھا کی پری کی طرح اس عالم رنگ و بو میں اچانک آجاتی ہے۔ پہلے دو مصرعوں پر "ابہام" کا پردۂ رنگین ہے اور آخری دو مصرعوں میں "حقیقت" ڈرامائی انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

اخترؔ ایک ماہر بت گر ہی نہیں بلکہ وہ باکمال مصور بھی ہے۔ اس کے "بتکدے" کی طرح اس کے "ارژنگ" میں بھی کبھی زندگی مسکراتی نظر آتی ہے اور کبھی گریاں۔

آیئے ارژنگِ اخترؔ کی سیر کیجئے!

کھجوروں کے تلے وہ جو کھنڈر سے جھلملاتے ہیں
یہ سب ریحانہ کے معصوم افسانے سناتے ہیں
صبا شاخوں میں نخلستاں کی جس دم سرسراتی ہے
مجھے ہر لہر سے ریحانہ کی آواز آتی ہے
کھجوروں کے حسین سائے زمیں پر لہلہاتے تھے
ستارے جگمگاتے تھے، شگوفے کھلکھلاتے تھے

یا

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب کنارِ دریا پر
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں شاداب کنارے دریا پر
اور پیار سے آکر جھانکتا ہے مہتاب کنارے دریا پر
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی گجر دم چرواہے ریوڑ کو چرانے آتے ہیں
اور شام کے دھندلے سایوں کے ہمراہ گھروں کو آتے ہیں
اور اپنی رسیلی بانسریوں میں عشق کے نغمے گاتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

اختر کی بنائی ہوئی تصویروں میں بھی حرکت اور آواز ہے۔ اختر ان تصویروں کی رنگینی میں اپنے دل کے خون کی چھینٹیں بھی دے دیتا ہے۔ ہمیں ان تصویروں کے لبوں پر پُر درد مسکراہٹ کھیلتی دکھائی دیتی ہے اور ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آتی ہے۔ اختر اپنی تصویروں کے سینہ میں "دل" بھی رکھ دیتا ہے۔ اس کی مخلوق جذبات سے عاری نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی جادوگری سے بے جان اشیا میں بھی جان پڑ جاتی ہے "شگوفوں کے کھلکھلانے" اور "چاند کے پیار سے آ کر چھلکنے" کا منظر پیش کرنا ایک تخلیقی فن کاری (Creative Art) ہے۔

اختر جذبات و واردات کو بھی صورت بخشتا ہے۔ وہ روح کو جسم کا لباس عطا کرتا ہے۔ وہ غیر محسوس چیزوں کی تعمیر محسوسات میں کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وہ راتیں جب محبت کے فسانے جاگ اٹھتے تھے
ربابِ دل کے خوابیدہ ترانے جاگ اٹھتے تھے
سکوں سوتا تھا جب بیتابیاں ہشیار ہوتی تھیں
وہ راتیں جن میں دل کی دھڑکنیں بیدار ہوتی تھیں

اختر بت گر اور مصور ہونے کے ساتھ ساتھ مغنی بھی ہے۔ اس کی شاعری میں غضب کی موسیقی ہے۔ شاعری کا غنائی پہلو "نظمیت" (Lyricism) کی جان ہے نغمہ و موسیقی شاعری کے شہ پر ہیں۔ درد سے لبریز جذبات اس کی روح اور تخیل وہ ازلی قوت ہے جس کی مدد سے شاعری کی مملکت وسیع تر ہو جاتی ہے۔

اختر مختلف طریقوں سے موسیقی پیدا کرتا ہے۔ مترنم بحور، قوافی کا ترنم شیریں لچکیلے الفاظ کا اور ہندی کے رسیلے شبدوں کا استعمال وہ نہایت ہی موزوں انداز سے کرتا ہے اور کبھی وہ جملوں کی تکرار سے موسیقیت پیدا کرتا ہے سنئے :-

گنوا نہ سوگ میں اپنے شباب کی راتیں
نہ ہاتھ آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
یہ نکہتوں کا ہجوم اور یہ خواب کی راتیں
فضا پہ خواب کی مانند چھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

کیا گاؤں پہ اب بھی ساون میں برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں
معصوم گھروں سے بھور بھئے چکی کی صدائیں آتی ہیں
اور یاد میں اپنے میکے کی بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

انتظار میں ع
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں
کی تکرار دلچسپ ہے "جہاں ریحانہ رہتی تھی" میں ع
"یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" کی
"او دیس سے آنے والے بتا" میں اسی جملہ کی تکرار ہے -

اردو اور فارسی شاعری میں ردیف اور قافیہ سے موسیقیت کی تخلیق میں کافی مدد ملتی ہے۔ اختر تکرار ردیف اور حسن قوافی سے اپنی نظموں کو مترنم اور دلکش بناتا ہے اور کبھی گونجنے والے قافیہ کے لفظ کو وہ ایک ہی مصرعہ میں دہراتا ہے سنئے۔

اودیس سے آنے والے بتا

اودیس سے آنے والے بتا، کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟
آوارۂ غربت کو بھی سنا! کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن؟
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن، وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن؟
اودیس سے آنے والے بتا

"آن" کا قافیہ اور "ن" پر ٹوٹنے والی ردیف اور پھر "وطن" کا کا غنائی تکرار یہ ترنم پیدا کرنے والا لفظ کس حسن کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ستار بج رہا ہے "بتا" اور "سنا" کا ہم قافیہ ہونا اور پھر تری کی صدا کی طرح "اودیس سے آنے والے بتا" کی تکرار یہ سب مل کر رُوحِ ذوق دل کو ایک مدہوش بیداری کا پیام سناتے ہیں۔

تخیل اور جذبہ

رومانیت نام ہے جذبات اور تخیل کی بیداری کا۔ اختر ایک رومانی شاعر ہونے کی حیثیت سے سرمایہ دار تخیل اور سر گشتہ جذبات ہے۔ اس کا تخیل اس کے فن کے مطابق اور اس کے ذوق کے تناسب ہے۔ اور اس کے جذبات حسن پسندی کے بطن کا سے ہوتے ہیں۔ رومانیت تخیل کا ایک نیا ہوش ہے۔ تخیل رسا حقائق اشیا کو دیکھ لیتا ہے

اور مختلف اشیار کے درمیان تعلقات کو پہچانتا ہے ۔

مادی حقیقتیں صرف حقیقتیں نہیں ہوتیں ۔ بلکہ حقیقت کی غیر مادی روح بھی ہوتی ہے ، اور وہ بھی حقیقت ہی کی ایک لطیف تعبیر ہے ۔ تخیل اس راز سے آگاہ ہو جاتا ہے ۔

تخیل اس "کثرت" کے بکھرے ہوئے موتیوں کو "وحدت" کے ریشمی تار میں پروتا ہے ۔ وہ مخلوق و خالق میں فرق مراتب قائم رکھتے ہوئے ان کے صحیح تعلق سے واقف ہو جاتا ہے ۔ وہ شیطان تک کو فراموش نہیں کرتا ۔ بلکہ اس کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اُسے اس کا مناسب مقام عطا کرتا ہے ۔

ایک رومانی شاعر کی زبان سے ابلیس ۔ جبریل سے کہتا ہے ؎

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو ، اللہ ، اللہ ہو !

اخترؔ شیرانی کا تخیل اپنی مخصوص فضا میں کامیابی کے ساتھ پرواز کرتا ہے مگر یہ فضا محدود ہو کر رہ گئی ہے ۔ اور اسی تحدید میں اخترؔ کی قوت اور کمزوری بیک وقت پائی جاتی ہے ۔ اسی تحدید کے سبب سے اس کے مخصوص رنگ میں تیزی اور چمک پیدا ہو گئی ہے اور اسی حد بندی کی وجہ سے اس کی شاعری میں تنوع کی سخت کمی ہے ۔

حسن کے حواسی شعور اور اس کی تعبیر و اظہار کی طرف اختؔر کا تخیل مرکوز ہے -
جدید تشبیہہ و استعارات ۔ پھڑکتا ہوا خیال ۔ تخلیقِ حسن اور کسی خاص عالمِ نو کی تعمیر ۔ یہ سب مظاہر ہیں تخیل کے -
ملاحظہ ہو :—

بہار و خواب کی تنویرِ مرمریں عذرؔا
شراب و شعر کی تفسیرِ دل نشیں عذرؔا

شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارہ ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمٰی

غائب از چشم تھی جنت کی بہاروں کی طرح
دستِ انساں سے تھی محفوظ ستاروں کی طرح
صبح کی طرح سے دوشیزہ تھی ہستی تیری
بوئے گل کی طرح پاکیزہ تھی ہستی تیری
تیرے اشعار بہشتوں کی بہاروں کے ہجوم
تیرے افکار تھے یا چاند ستاروں کے ہجوم

اختر کے تخیل کی خلاقی دنیائے حسن کو بسانے میں صرف ہوتی ہے۔ اس عالم نو میں "سرور و نور کا کوثر" لٹایا جاتا ہے۔ "شباب و حسن کی بجلیوں" کو لہرانے کا اذن دیا جاتا ہے۔ اور ناز کی بستیاں، بسائی جاتی ہیں۔ ایک تخیل لطیف سے لطف اٹھائیے ؎

زمین پر بھیج دے آج اے بہشت اپنی بہاروں کو
بچھا دے خاک پر اے آسماں اپنے ستاروں کو
خرام و رقص کا دے حکم فطرت ابر پاروں کو
وہ بے خود چاند کی نظروں سے گھبرانے کی وادی ہیں!
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

جذبات کی دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ پُر اثر ہے۔ وہ درد Pathos ہے۔ درد سب سے زیادہ لطیف ہے اور یہ قلب و روح کے عمیق ترین مقام میں آسودہ رہتا ہے۔ درد کا اظہار یک بیک اُبل پڑنے والے چشمے کی طرح ہوتا ہے۔ جو زمین کے سینے سے پھوٹ بہتا ہے۔ درد قلب حیات کی محبوب ترین حس ہے نازک، ناقابل بیان، لذیذ اور پراسرار!

اختر کی شاعری اس آسمانی جذبے سے یکسر خالی تو نہیں۔ مگر اس کے جلوے عریاں نظر نہیں آتے۔ جب اختر کے اصلی سوز و درد سے متاثر ہوتا ہے تو صرف اس کے حواس سوز و درد سے کراہتے ہیں۔ روح تلملا نہیں اٹھتی۔ اختر کا دل سوزش عشق سے صرف جلا۔ شعلہ ساماں ہوا۔ مگر وہ پگھل سکا۔ نہ جل کر خاکستر ہوا۔

پھر بھی اختر کی گذارش "اے عشق کہیں لے چل" "او دیس سے آنے والے بتا" اور "جہاں ریحانہ رہتی تھی" کے بعض مقامات تاثیر درد کے کرشمے دکھلاتے ہیں سنئے

قسم ان آنسوؤں کی جو بہائے تھے کبھی تم نے
ستاروں وہ جو آنکھوں سے گرائے تھے کبھی تم نے
شروع عشق کی بے تابیوں کی ہے قسم تم کو
شبان ہجر کی بے خوابیوں کی ہے قسم تم کو
فقط اتنا بتا دو کیا وہ باتیں پھر نہ آئیں گی ؟
وہ راتیں آہ وہ باتیں، وہ راتیں پھر نہ آئیں گی؟

پیام درد دل اختر دیئے جاتا ہوں وادی کو
سلام رخصت غمگیں کئے جاتا ہوں وادی کو
سلام اے وادی ویراں جہاں ریحانہ رہتی تھی!

ختم کلام پر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اردو کی رومانی شاعری کے دور ثانی سے ہم اس قدر قریب ہیں کہ نقد و نظر کا حق پورے طور پر ادا نہیں ہو سکتا۔ فاصلۂ نظر کا بہت ہی کم ہونا بھی اس کے دور ہو جانے کی طرح فریب دہ ہے۔ انتہائی قربت، اشیا کی جسامت کو بڑھا بھی دیتی ہے۔ اور ایک حد کے بعد بصارت کو بھول بھی کرتی ہے۔ آئندہ آنے والے لوگ ہم سے بہتر طور پر اس فرض کو ادا کر سکیں گے۔

نغمۂ اوّلیں

بنامِ ایزدِ بخشایندۂ دادگر!

خامہ ام رنگیں بیانی میکند / در جوانیہا جوانی میکند
باز سر، بر پائے سلمائے سخن / جراَتِ سجدہ چکانی میکند
باز وحشت سوئے صحرا میبرد / باز عشقم سرگرانی میکند
ہم صفیراں را نویدِ نوبہار / باز طبعم گلفشانی میکند
طائرِ افکارِ عرش آثارِ من / با ملائک ہمعنانی میکند
طوطیٔ اشعارِ شیریں کارِ من / با عنادل، ہم زبانی میکند
باز رسوائی شوقم آرزدست / باز شوقِ من جوانی میکند
ہچو کا کلہائے سلمٰے، خامہ ام / از زبان عنبر فشانی میکند
طوطیٔ طبعِ جوانم در قفس / میلِ بزمِ بوستانی میکند
باز صہبائے محبت می چشم / باز زہدم سرگرانی میکند
حاسداں را "پیر" با دادل "زغم" / شاہدِ طبعم جوانی میکند
باز چوں میلِ نسیمِ نوبہار / خامہ در دستم جوانی میکند
باز طبعِ نکتہ سنجم ہمچو یار / شرحِ اسرارِ نہانی میکند
باز دل با سازو سامانِ دگر / میلِ خوننابہ فشانی میکند

باز ذوقِ طبع در بزمِ سخن ۔ زندہ رسمِ دوشنگانی میکند
باز درستی، صریرِ خامہ ام ۔ کارِ الحان و اغانی میکند
باز عکسِ جامہائے لالہ رنگ ۔ چہرۂ غم را ارغوانی میکند
عشق خود "سامانِ طرازِ شوق" ہست[1] ۔ "قطرہ" ام دریافشانی میکند
باز فکرِ کہکشاں پروازِ من ۔ یک ندائے آسمانی میکند

"باز گلبانگِ پریشاں می زنم!
آتشے در عہدِ لیسباں می زنم!" (حسرتی)

جوگن

ہندوستانِ قدیم کی ایک موسیقیانہ رات کا تصور

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے ۔ موسیقی نغمہ زیں کے دریا بہا رہی ہے
نغمگیں نوائیوں سے بے خود بنا رہی ہے ۔ دنیا کے ہر اثر کو دل سے مٹا رہی ہے
سوئی ہوئی فضا کا، شانہ ہلا رہی ہے ۔ ہر جنبشِ زباں سے مردے جلا رہی ہے
بیدار کر رہی ہے، مدہوش گھاٹیوں کو ۔ خوابیدہ ساحلوں کی نیندیں اڑا رہی ہے

---

[1] غالب کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے :-
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ۔ ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا!

صبحِ بہار

ہر لرزشِ صبا میں طوفاں اُمنڈ رہے ہیں
کس دُکھ بھری ادا سے تانیں لگا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اٹکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں
لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے

آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں
دوشیزگی کی گنگا طوفاں اٹھا رہی ہے

اک گیروا سی ساڑی ہے جسمِ مرمریں پہ
یا ہلکی ہلکی بدلی سورج پہ چھا رہی ہے

اک بحرِ یاسمین پہ لہرا رہی ہے ناگن
یا اس کی زلفِ مشکیں سینہ پہ آ رہی ہے

ہے ایک ستار اُس کے آغوشِ ناز میں یا
وہ نازک انگلیوں سے جس کو بجا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

سبزے پہ چاندنی کے بادل برس رہے ہیں
یا کوئی حورِ جنت آنسو بہا رہی ہے

ہے موجزن فضا میں اک آبشارِ شیریں
یا "ملکۂ پرستاں" موتی لٹا رہی ہے

اک گردِ مرمریں ہے چھائی ہوئی افق پہ
جس کو ہوائے صحرا ہر سو اڑا رہی ہے

اک موجِ گوہریں سی ہر پھول پہ ہے رقصاں
نغمے کی روحِ رنگیں جس میں سما رہی ہے

یا دن کے مقبرے پر دوشیزۂ شب آ کر
گلہائے نور کی اک چادر چڑھا رہی ہے

دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے!

فرشِ زمردیں پر کچھ پھول سو رہے ہیں
نغمے کے پر کی جنبش جن کو جگا رہی ہے

جنگل مہک رہا ہے کلیاں چٹک رہی ہیں
ہر تان میں الٰہی کیا گل کھلا رہی ہے

وادی میں موجزن ہے نغموں کا گیت لرزاں
ہر پھول ہر کلی پر مستی سی چھا رہی ہے

اک نہر بہہ رہی ہے تھوڑے سے فاصلے پر
گاتی ہوئی جو اپنی منزل کو جا رہی ہے

اب تک میں سر جھکائے حیرت زدہ کھڑا ہوں
اب تک وہی تجلی آنکھوں پہ چھا رہی ہے
دیکھو! وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے!

کلیاں

نہ پھولوں کی تمنا ہے، نہ گلدستوں کی حسرت ہے
مجھے تو کچھ انہیں بیمار کلیوں سے محبت ہے

ابھی الٹا نہیں بادِ بہاری نے نقاب ان کا!
ابھی محفوظ ہے اک خلوتِ رنگیں میں خواب ان کا
ابھی سرمستیوں میں رات دن سونے کی عادت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

ابھی ٹوٹا نہیں سورج کی کرنوں سے حجاب ان کا
ابھی رسوا نہیں ہے گل فروشوں میں شباب ان کا
ابھی چھائی ہوئی دوشیزگی کی سادہ رنگت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

یہ ننھی ننھی پریاں ہیں بہارِ بوستانی کی!
یہ پیاری پیاری حوریں ہیں بہشتِ گلفشانی کی
شمیم آبادِ گلشن میں انہی ان کی حکومت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

ہوا میں جھولتے رہتے ہیں ہر دم آشیاں ان کے
ہیں دو دو پتّیوں کی گود میں قائم مکاں ان کے
مکاں یا آشیاں جو کچھ بھی ہے نکہت ہی نکہت ہے!
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبّت ہے!

خزاں جن کو چرا کر لے گئی تھی اِک زمانے میں!
صبا لے آئی پھر، موتی وہ گلشن کے خزانے میں
چمن میں ہر کلی ساون کی اک رنگیں امانت ہے!
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے!

یہ گھری چاندنی میں جھومتی ہیں شاخساروں پر
کہ کچھ چینی کی گڑیاں ناچتی ہیں سبز تاروں پر
یہ عالم ہے کہ پیشانی کو سجدوں کی ضرورت ہے!
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے!

کوئی دوشیزہ جب آغوشِ بیماری میں سوتی ہے!
تو صحت سے کہیں بڑھ کر حسیں معلوم ہوتی ہے!
یونہی پھولوں میں اور کلیوں میں بھی فرقِ لطافت ہے!
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے!

بہارستان کے مندر کی، اِن کو دیویاں کہیے
جو گل کو کرشن کہیے، ان کو اس کی گوپیاں کہیے

کوئی جانِ ملاحت ہے، کوئی کانِ صباحت ہے!
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے!

کوئی چھو لے اگر ان کو تو یہ کمھلا کے رہ جائیں
حیا میں اس قدر ڈوبیں کہ بس مرجھا کے رہ جائیں
ابھی الھڑ پنے کے دِن ہیں، شرمانے کی عادت ہے!
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے!

یہ جب تک یوں اچھوتی رہتی ہیں، بیمار رہتی ہیں!
یونہی مدہوش رہتی ہیں، یونہی سرشار رہتی ہیں
غرض آٹھوں پہر ان کی یہی مستانہ حالت ہے!
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے!

مرا بس ہو، تو اختر میں انہی کا رنگ ہو جاؤں!
ہمیشہ کیلئے اِن چمپئی پردوں میں سو جاؤں!
مجھے اِن کی رسیلی گود میں مرنے کی حسرت ہے!
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے!

رُباعی

میخانہ بدوش ہیں گھٹائیں ساقی! پیمانہ فروش ہیں فضائیں ساقی!
اک جام پلا کے ہم کو کر دے مدہوش غارت گرِ ہوش ہیں ہوائیں ساقی!

برکھارُت

(مسوری جاتے ہوئے)

آسماں پر چھا رہا ہے ابر پاروں کا ہجوم! نو بہاروں کا ہجوم!
آہ یہ رنگین آوارہ نظاروں کا ہجوم! کوہساروں کا ہجوم!

بدلیاں ہیں یا کسی کے بھولے بسرے خواب ہیں بے خود و بیتاب ہیں!
یا ہوا پر تیرتا ہے رودِ باروں کا ہجوم! آبشاروں کا ہجوم!

پھرتی ہیں آوارہ متوالی گھٹائیں اس طرح! اور ہوائیں اس طرح!
جھومتا پھرتا ہو جیسے میگساروں کا ہجوم! بادہ خواروں کا ہجوم!

وادیِ گنگا ہے، برکھا رُت ہے، کالی رات ہے! رات ہے، برسات ہے!
اور فضا میں تیرنے والے نظاروں کا ہجوم! نشہ زاروں کا ہجوم!

نیلگوں پریاں افق میں پر ہیں پھیلائے ہوئے! بال بکھرائے ہوئے!
یا امنڈ آیا ہے ساون کی بہاروں کا ہجوم! ابر پاروں کا ہجوم!

ننھی ننھی بوندیں گرتی ہیں حجابِ ابر سے! یا نقابِ ابر سے!
چھن رہا ہے قطرے بن بن کر ستاروں کا ہجوم! نور پاروں کا ہجوم!

یہ گھٹائیں ہیں کہ خوابوں کے سفینے ہیں رواں! بے قرینے ہیں رواں!
بادبانوں میں چھپائے چشمہ ساروں کا ہجوم! جوئباروں کا ہجوم!

بجلی ہے یا نور کی زنجیر لہرائی ہوئی! — پیچ و خم کھائی ہوئی!
یا خمیدہ، مرمریں پھولوں کے ہاروں کا ہجوم! — اور ستاروں کا ہجوم!

یہ سماں جنگل کا، یہ مہتاب کی سی وادیاں! — خواب کی سی وادیاں!
نشے میں بھیگا ہوا یہ سبزہ زاروں کا ہجوم! — یہ بہاروں کا ہجوم!

کوہساروں میں خوشی کی بستیاں آباد ہیں! — مستیاں آباد ہیں!
چار سو بکھرا پڑا ہے سبزہ زاروں کا ہجوم! — مرغزاروں کا ہجوم!

یوں نظر آتے ہیں کوہسارِ مسوری دور سے — مست سے مخمور سے!
جوں سمندر سے جزیروں کی قطاروں کا ہجوم! — سبزہ زاروں کا ہجوم!

یہ سفر، یہ رات، یہ برسات اور پھر ہم سفر! — الاماں والحذر!
ایک حسنِ یاسمیں، رنگیں بہاروں کا ہجوم! — ماہپاروں کا ہجوم!

آہ یہ مخمور آنکھیں، مست سی بے خواب سی! — نیند میں بے تاب سی!
جن سے چھلکا پڑ رہا ہے حشر پاروں کا ہجوم! — فتنہ زاروں کا ہجوم!

آہ یہ شاداب چہرہ اور یہ حسنِ نازنیں! — اُف یہ جسمِ یاسمیں!
جیسے یک جا ہو سمٹ کر نو بہاروں کا ہجوم! — اور ستاروں کا ہجوم

یہ سہانے منظر اختر مدتوں یاد آئیں گے! — مدتوں تڑپائیں گے!
آہ! یہ رات، اُف یہ مستانہ نظاروں کا ہجوم! — یہ بہاروں کا ہجوم!

آج کی رات

کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات
کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات
کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات
کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
کہ نظر آئے گی وہ ماہ لقا آج کی رات!

کیوں نہ گلزار میں اٹھلاتی پھرے موجِ نسیم
کیوں نہ ہر پھول ہو لبریزِ بہارِ تسنیم
کیوں نہ آمادۂ افلاک ہو پروازِ شمیم
کیوں نہ ہر ذرہ بنے جلوہ گہِ طورِ کلیم
کہ انہیں دیکھیں گے ہم جلوہ نما آج کی رات!

آج کیا بات ہے دنیا کے نظارے خوش ہیں
باغ میں پھول، سرِ چرخ ستارے خوش ہیں
ایک بے نام سی مستی کے مارے خوش ہیں
ایک ہیں خوش نہیں جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں
ہے خوشی چار طرف نغمہ سرا آج کی رات!

غائبانہ جو ہمیں نامے لکھا کرتی تھی!
دُور رہتے ہم پہ دِل اپنا جو فدا کرتی تھی
دادِ اشعار جو "گم نام" دیا کرتی تھی
ہم سے بے پردہ جو پردے میں رہا کرتی تھی
سامنے ہوگی وہی شوخ ادا آج کی رات!

جس کی رنگینی سے افکار ہیں مدہوش مرے
جس کی اُلفت سے ہیں اشعار پُر از جوش مرے
جس کی فرقت میں خیالات ہیں غم کوش مرے
جس کے جلووں سے تصور میں ہم آغوش مرے
جلوہ دکھلائے گی وہ حور لقا آج کی رات!

داستانِ دلِ بے تاب سنائیں گے انہیں آپ روئیں گے، گلے مل کے رلائیں گے انہیں
خود ہی پھر رونے پہ ہنس دیں گے ہنسائینگے انہیں اور جرأت کی تو سینے سے لگائینگے انہیں
نت نئے جذبوں کی ہے نشو و نما آج کی رات!

دل کی رگ رگ میں ہے بیتاب محبت اُسکی آنکھ کے پردے پہ لہراتی ہے صورت اُسکی
خلوتِ رُوح میں آباد ہے الفت اُس کی میرے جذبات پہ طاری ہے لطافت اُسکی
اور کچھ یاد نہیں اس کے سوا آج کی رات!

نکہتِ حسن ہو دامانِ ہوا میں رقصاں جذبۂ عشق ہو رنگین فضا میں رقصاں
کیف و سرمستی ہو منظر کی ادا میں رقصاں نُور ہی نور ہو یوں ارض و سما میں رقصاں
کہ خدائی میں اُتر آئے خدا آج کی رات!

واقفِ دردِ دلِ زار کریں گے اُن کو غمِ اُلفت سے خبردار کریں گے ان کو
محرمِ جذبۂ اسرار کریں گے اُن کو! گود میں لیں گے انہیں، پیار کریں گے اُن کو
دل کی رگ رگ سے یہ آتی ہے صدا آج کی رات!

لیکن اظہارِ خیالات کریں گے کیوں کر؟ شرم آتی ہے، ملاقات کریں گے کیوں کر؟
بات کرنی ہے مگر بات کریں گے کیوں کر؟ ختم، یہ خواب کی سی رات کریں گے کیوں کر؟
آہ! یہ آج کی، یہ خواب نما، آج کی رات!

اے دل! ایسا نہ ہو کچھ بات بنائے نہ بنے حالِ دل جو بھی سنانا ہے، سنائے نہ بنے
پاس آئیں تو، مگر پاس بٹھائے نہ بنے شرم کے مارے انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہ تصور سے بھی آتی ہے حیا آج کی رات!

یوں تو ہر طرح، ادب مدِ نظر رکھنا ہے — حسرتِ دل کا لحاظ آج، مگر، رکھنا ہے
بے خودی! دیکھ تجھے میری خبر رکھنا ہے — نازنیں قدموں پہ یوں ناز سے سر رکھنا ہے
کہ تڑپ اُٹھے دلِ ارض و سما آج کی رات!

ہم میں کچھ جرأتِ گویائی بھی ہو گی کہ نہیں — ہمتِ ناصیہ فرسائی بھی ہو گی کہ نہیں
شرم سے دور شکیبائی بھی ہو گی کہ نہیں — یوسفِ دل سے "زلیخائی" بھی ہو گی کہ نہیں
آج کی رات! اُف او میرے خدا آج کی رات!

انگوٹھی

چھپاؤں کیوں نہ دل میں خاتمِ گوہر نگار اُس کی — یہی لے دے کے میرے پاس ہے اک یادگار اُس کی
یہ تنہائی میں میرے لب تک آ کر مسکراتی ہے — اور اپنی مالکہ کی طرح دل کو گدگداتی ہے
قلم کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہر وقت رہتی ہے — اور اُس کے دستِ رنگیں کے فسانے مجھ سے کہتی ہے
طلائی اُنگلیوں کا جب مجھے قصہ سُناتی ہے — تصور میں ستاروں کے سے پیکر کھینچ لاتی ہے
مری سلمیٰ کو اُس نے شاد اور ناشاد دیکھا ہے — گہے مسرور، گاہے مائلِ فریاد دیکھا ہے
اِسے معلوم ہیں اچھی طرح بیتابیاں اُس کی — نہیں پوشیدہ اِس کی آنکھ سے بیخوابیاں اُس کی
شبِ تنہائی میں اس نے اُسے بیدار پایا ہے — اور اکثر دیدۂ سرشار کو خونبار پایا ہے!
اِسے معلوم ہے وہ کس طرح مغموم رہتی تھی — کسی کے غم میں لطفِ زیست سے محروم رہتی تھی
مرا خط پڑھ کے وہ کس ناز سے مسرور رہتی تھی — پھر اپنی بے بسی پر کس طرح رنجور ہوتی تھی!
یہ شاہد ہے کہ اُسکی شامِ غم کیوں کر گزرتی تھی — یہ شاہد ہے کہ وہ رو رو کے کیونکر صبح کرتی تھی

وہ جب دل تھام لیتی تھی، ہجومِ غم سے گھبرا کر
تو یہ کرتی تھی اس کی غمگساری دل کے پاس آ کر

اُسے معلوم ہے جو درد تھا اُس پاک سینے میں
بسی ہیں اُس کے دل کی دھڑکنیں اس کے نگینے میں

پہنچتی ہیں شعاعیں اُس کی جس دم چشمِ حیراں تک
تصور مجھ کو لے اڑتا ہے سلمیٰ کے شبستاں تک

جہاں سلمیٰ کے اور میرے سوا ہوتا نہیں کوئی
انگوٹھی کھوئی جاتی ہے مگر کھوتا نہیں کوئی!

رقاصہ

سکوتِ شب میں یہ جنبش کون، زہرہ وار بیخودِ ادائے رقص ہے!
کہ جس کے رقصِ ناز سے، فضائے مشک بو بنی ہوئی فضائے رقص ہے!

اُٹھی ہوئی ہتیلیوں کی جنبشیں تلی ہوئی کمر کی ہلکی گردشیں!
زمیں سے آسماں تک آج جیسے ایک ایک جلوہ مبتلائے رقص ہے!

اِدھر وہ جسمِ احمریں لچک گیا، اُدھر وہ ایک رقص بن کے رہ گئی
اگر وہ اس کی ابتدائے رقص تھی تو اِس کو کہئے انتہائے رقص ہے!

کبھی کچھ ایسے، جیسے وہ پھسل گئی، کبھی کچھ ایسے جیسے، پھر سنبھل گئی!
کبھی تڑپ اُٹھی، کبھی مچل گئی، غرض عجیب ماجرائے رقص ہے!

وہ ایک پھول ہے جو بے قرار ہے، وہ ایک شعلہ ہے جسے سکوں نہیں
کہ ایک نغمہ ہے جو آ کے شکل میں، ہوا کی طرح، مبتلائے رقص ہے!

سرِ زمینِ رقص نے دکھا دیئے جگہ جگہ ہزاروں رقص کے صنم کدے
کہ اس کے پائے یاسمیں کی ایک ایک ہلکی لغزش اک بنائے رقص ہے!

صفات و ذات کی فضول ہے یہ بحث، رنگِ برگِ گل جدا جدا نہیں
وہ نغمہ ہے، وہ رقص ہے، وہ رقصِ نغمہ ہے، وہ نغمۂ انتہائے رقص ہے!
دماغ مستِ فکر او، فکر محوِ عاجزی کہ اختر اس کو کیا کہوں؟
جو شیخِ شہر کی نظر معاف کر دے تو کہوں یہ اک خدائے رقص ہے!

نپولین کی مراجعتِ رُوس

(ناکام فاتح کا خطاب سرزمین روس سے)

رخصت اے روس! آہ اے ویرانۂ خونیں بہار — اے شکوہِ قہرمانانِ جہاں کی یادگار!
کر چکی ہیں میری تلواریں ترے ہونٹوں کو پیار

ماسکو! اے خود سر و آزاد زاروں کی زمیں — قیصروں کی مرز بوم! اے تاجداروں کی زمیں
آہ اے گہوارۂ شاہنشہانِ ذی وقار!

تیرے ویرانوں سے رخصت ہو کے اب جاتا ہوں میں — برف اور بارش کے طوفانوں سے گھبراتا ہوں میں
یہ ہوائے تند و سرد اور یہ فضائے برف بار

تیرے بچوں نے تجھے برباد و ویراں کر دیا! — تیرے اک اک ذرّہ کو آتش بداماں کر دیا!
تیرے عالیشان ایواں بن چکے ہیں شعلہ زار!

ماسکو! میں تجھ کو یوں بے حال کر سکتا نہ تھا! — فتح کر کے اس طرح، پامال کر سکتا نہ تھا!
کر گئے برباد جیسا تیرے وحشی نابکار!

میری فوجیں چھا گئی تھیں تجھ پہ طوفاں کی طرح! — ابرِ باراں کی طرح، سیلِ بیاباں کی طرح!

خاک میں ملنے ہی کو تھا تیرا صدیوں کا وقار!
پر خدائی قہر نے ناچار مجھ کو کر دیا! فتح کی تکمیل سے "بے زار" مجھ کو کر دیا!
آ رہے ہیں فتح کو ٹھکرا کے میرے شہسوار!

آہ! اس طوفانِ برف و باد سے مجبور ہوں تیری ساری وسعتوں کی فتح سے معذور ہوں
بازوئے فطرت سے لڑ سکتے نہیں میرے سوار

اے زمیں! ہیں دفن تجھ میں نوجوانانِ فرانس تیرا ہر ذرہ ہے گورِ جنگ جویانِ فرانس
برقِ آسا کوندتی تھی جن کی تیغ آب دار!

تیرے دامن میں ہے وہ سورما ہیں محوِ خواب ساری دنیا میں نہ تھا جن کی شجاعت کا جواب
جن کے ڈر سے کانپ اٹھتے تھے خود تاجدار

تیری مٹی کے سپرد ان کو کئے جاتا ہوں میں! داغِ فرقت اپنے سینے میں لئے جاتا ہوں میں
با دلِ اندوہگیں، بادۂ خونناب بار!

دیکھنا! میرے دلیروں کا کفن میلا نہ ہو! ان کی قبروں کی ہو ذلت، اے زمیں ایسا نہ ہو!
مردہ دشمن کی اہانت ہے کمینوں کا شعار!

جانتا ہوں برف کے طوفاں ہیں میرے منتظر اک بھیانک موت کے ساماں ہیں میرے منتظر
وحشی کاسک راہ میں حائل قطار اندر قطار

ان موانع سے بھی میں، لیکن گذر ہی جاؤں گا بحرِ آفات و بلا سے پار اتر ہی جاؤں گا!
راستہ کر لے گی پیدا میری تیغِ آب دار!

الوداع اے روس کی خونیں بہارو، الوداع الوداع اے جنگ کے قاہر نظارو، الوداع!

گر ملی فرصت تو آئیں گے یہاں اگلی بہار!

تیتری
(مختلف حالتوں میں)

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگِ پریدہ ہے — بوئے چکیدہ ہے
آغوشِ گل میں، یا کوئی نقش دمیدہ ہے — عکسِ کشیدہ ہے
اُٹھے تو ایک بوسۂ رخصیدہ سامنے — پاشیدہ سامنے
بیٹھے تو ایک لذتِ خوابیدہ سامنے — دامن کشیدہ ہے
جوئے صبا میں ہلکا سا طوفانِ رنگ و بُو — ہیجانِ رنگ و بُو
دوشِ فضا پہ چھوٹا سا نیسانِ رنگ و بُو — جو صف کشیدہ ہے
اک پُر بہار نقش ہے عشرت کے خواب کا — عہدِ شباب کا
یا برگِ گل پہ لرزشِ جامِ شراب کا — عکسِ رمیدہ ہے
ننھی سی اک شعاع ہے طورِ کلیم پر — سطحِ نسیم پر
رقّاصۂ بہار کا فرشِ شمیم پر — رقصِ پریدہ ہے
اُبھرا ہوا سا عکس ہے، رنگیں غبار کا — کیف و خمار کا
یا شاخسارِ گل پہ عروسِ بہار کا — حُسنِ رمیدہ ہے
اک نوعروس کی نگہِ انفعال ہے — شرمِ وصال ہے
یا اک شعاعِ پرتوِ قوسِ ہلال ہے — اور نو دمیدہ ہے

نکہت ہے پھول کی سی مگر پھول سے جُدا
ہر پھول سے جُدا
یا پنکھڑی ہے پھول کی پر پھول سے جُدا
خود آفریدہ ہے

وہ اِک حسین نغمہ، جسے بھول جائے دل
برسوں نہ پائے دل
پھر یک بیک کبھی جسے یوں ڈھونڈ لائے دل
یہ ناشنیدہ ہے

بچپن کا کوئی خواب ہے رقصاں فضاؤں میں
بدلی کی چھاؤں میں
بیتے ہوئے دنوں کا سماں ہے ہواؤں میں
اور غم کشیدہ ہے

اک حسن کار کا کوئی رنگیں خیال ہے
مستِ کمال ہے
یا یہ کسی حسینہ کا شوقِ وصال ہے
جو نَو رسیدہ ہے

اِک خوابِ نو مصورِ رنگیں طراز کا
صورت نواز کا
یا ایک مطرب کے دلِ پُرگداز کا
لحنِ پریدہ ہے

گذرے ہوئے دنوں کی کوئی دل گداز یاد
رنگیں طراز، یاد
یا کیفِ عشق کی کوئی پرسوز و ساز، یاد
تلخی چشیدہ ہے

اُمید ہے یہ ایک غریب الدیار کی
حسرت شعار کی
فکرِ خزاں میں لالہ رُخِ نو بہار کی
آہِ کشیدہ ہے

موجِ شراب کی اِسے اک تھرتھری کہیں
نغمی پری کہوں
یا موسمِ بہار کی اک تیتری کہوں
جو آرمیدہ ہے

مجھے بددعا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

میں بے وفا سہی، مجھے دادِ وفا نہ دے
میری خطا کو اپنے کرم سے صلہ نہ دے
غفلت کی دے سزا، مگر ایسی سزا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

تسلیم ہے کہ تجھ کو ستاتا رہا ہوں میں
تیرے حسین دل کو دکھاتا رہا ہوں میں
لیکن تو اس طرح مرے دل کو دُکھا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

اقرار ہے مجھے کہ گنہ گار ہوں ترا
مجرم ہوں بے وفا ہوں خطاوار ہوں ترا
لیکن تو رحم کر، مجھے ایسی سزا نہ دے
او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

یہ کیا کہا "خدا کرے تیرا بھی آئے دل
میری ہی طرح تیرا بھی کوئی دُکھائے دل
اور دل بھی یوں دُکھائے کہ قدرت شفا نہ دے"
او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے

مانا کہ تیرے عشق کو دل سے بُھلا دیا!
نقشِ وفا کو سینے سے اپنے مٹا دیا!
لیکن تو میری پچھلی وفائیں بھلا نہ دے!
او نازنیں! خدا کے لئے بددعا نہ دے!

تیرے غموں پہ کیوں مری اب تک نظر نہ تھی   کیا ہو گیا تھا مجھ کو مجھے خود خبر نہ تھی؟
اس بے خودی کی مجھ کو خدارا سزا نہ دے
او ناز نیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے

گو آسماں نے تجھ سے جدا کر دیا مجھے!   بیگانۂ خیالِ وفا کر دیا مجھے!
لیکن تو داغِ ترکِ خیالِ وفا نہ دے
او ناز نیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے

کالج کے مشغلوں نے ترا غم بھلا دیا!   پردیس کی فضا نے وہ عالم بھلا دیا!
پردیسیوں کو، دل سے مگر تو بھلا نہ دے
او ناز نیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے

مدت سے خط لکھا نہ تجھے یاد ہی رکھا   تیری ہر اک امید کو ناشاد ہی رکھا
آئندہ کی اُمید کو لیکن مٹا نہ دے
او ناز نیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے

اپنے کئے پہ آپ ہی پچھتا رہا ہوں میں   تیری نگاہِ درد سے شرما رہا ہوں میں
دل سے بھلا دے، اپنی نظر سے گرا نہ دے
او ناز نیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے

گذرے ہوئے دنوں کا خیال آ رہا ہے پھر   آنکھوں کے آگے عہدِ وصال آ رہا ہے پھر
عہدِ وصال کی قسم! اس کو بھلا نہ دے
او ناز نیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے

بیتی ہوئی بہار کی راتوں کو یاد کر — اُن بھولی بھالی پیار کی باتوں کو یاد کر

ماضی کا واسطہ، انہیں دل سے مٹا نہ دے

او نازنیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے

بدلا ہوا سا محفلِ دل کا سماں ہے پھر — حسرت ہو، آرزو کہ تمنا، جواں ہے پھر

تو اپنی شمع عشق ابھی سے بجھا نہ دے!

او نازنیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے

ڈرتا ہوں، کانپتا ہوں، تری بد دعا سے میں — رحمت کی بھیک مانگ رہا ہوں خدا سے میں

یوں بد دعا نہ دے مجھے بہرِ خدا نہ دے!

او نازنیں! خدا کے لئے بد دعا نہ دے!

نغمۂ سحر

سنو یہ کیسی آواز آ رہی ہے — کوئی دیہاتی لڑکی گا رہی ہے

سحر کے دھندلے دھندلے منظر دل کو — شرابِ نغمہ سے نہلا رہی ہے

اُٹھی ہے شاید آٹا پیسنے کو — کہ چکی کی صدا بھی آ رہی ہے

غموں سے چور اپنے ننھے دل کو — ترانہ چھیڑ کر بہلا رہی ہے

فضا پر، بستیوں پر، جنگلوں پر — دھواں دھار ایک بدلی چھا رہی ہے

چھما چھم مینہ کی بوندیں پڑ رہی ہیں — کہ ساون کی پری کچھ گا رہی ہے

نئے بھیگے ہوئے سبزے کی خوشبو — ہوا کے ساتھ اڑ کر آ رہی ہے

صبا کے مست جھونکوں کے اثر سے — خوشی سی دل میں اُمڈی جا رہی ہے
مگر ہے غم کی تاثیر اس خوشی میں! — گزشتہ زندگی یاد آ رہی ہے
کوئی یاد آہ! اک غم دیدہ سی یاد — سے بچپن کے پھر دکھلا رہی ہے
گلِ خود رو کی غم انگیز خوشبو — قریبی وادیوں سے آ رہی ہے
ہوا کی سرسراہٹ ہے کہ فطرت — پرانی زندگی دُہرا رہی ہے
ادھر بادل کی خوف انگیز آواز — فضا کو نیند سے چونکا رہی ہے
یہ بادل ہیں کہ ہیں ساون کے سپنے — ہوا جن کو اُٹھا کر لا رہی ہے
یہ بجلی ہے کہ اک مرمر کی ناگن — دھوئیں کی جھیل پر لہرا رہی ہے
یہ بوندیں ہیں کہ بجلی آسماں سے — ستارے توڑ کر برسا رہی ہے
مگر وہ غم زدہ معصوم لڑکی! — برابر گیت گائے جا رہی ہے
کچھ ایسا ناتواں نغمہ ہے گویا! — کوئی ننھی کلی مرجھا رہی ہے
ہوا، ٹھنڈی ہوا بھرتی ہے آہیں — فضا، دھندلی فضا تھرا رہی ہے
گھروں پر، کھیتوں پر، کیاریوں پر — اُداسی ہی اُداسی چھا رہی ہے
نہ جانے کیا اثر ہے اس صدا میں — کہ خود فطرت بھی بہکی جا رہی ہے
یہ گھر سُسرال ہوگا شاید اس کا — جبھی ماں باپ کی یاد آ رہی ہے
جبھی مصروف ہے آہ و فغاں میں — جبھی غمگین لے میں گا رہی ہے

"یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے!

ہوا جو گاؤں کو مہکا رہی ہے — مرے میکے سے شاید آ رہی ہے"

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

گھٹا کی اُودی اُودی چُنریوں[۱] سے مری سکھیوں کی بو باس آ رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

مجھے لینے نہ آئے اچھے بابل تمہاری یاد آفت ڈھا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

میری امّاں کو ہوا اس کی خبر کیا کہ چھیا اس جگہ گھبرا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

نہ لی بھیّا نے بھی سُدھ بُدھ ہماری جہاں سے چاہ اُٹھتی جا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

ہوا کی پنکھیا جھل جھل کے بجلی مرے دل کی لگی بھڑکا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

بھلا کیوں کر تھمیں آنسو کہ جی پر اُداسی کی بدریا[۲] چھا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

نئے پھولوں سے جنگل بس چلے ہیں مرے من کی کلی کُملا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

کوئی اس باؤلی بدلی سے پوچھے پرائے دیس میں کیوں چھا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

جو کلی کھیلتی تھی مجھ سے اِک دن وہی آنکھیں مجھے دکھلا رہی ہے

[۱] راجستانی رنگین دوپٹہ [۲] بادل

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

نہیں کھیتوں میں ساون کی گڑیاں ہماری آنکھ خوں برسا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

گھٹا ہے یا کوئی بچھڑی سہیلی مرے گھر سے سندیسہ لا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

گیا پینگیں بڑھانے کا زمانہ وہ امرئیوں پہ کوئل گا رہی ہے

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے"

یونہی وہ اپنی غمگیں راگنی سے در و دیوار کو تڑپا رہی ہے

سیاہی اُڑتی جاتی ہے افق سے عروسِ صبح بڑھتی آ رہی ہے

شوالے میں گجر بھی جاگ اُٹھا ٹھا ٹھن ٹھن کی آواز آ رہی ہے

کوئی چڑیا نکل کے گھونسلے سے گھنے جنگل میں منگل گا رہی ہے

کوئی بکری کہیں کرتی ہے "میں میں" کوئی بچھیا کہیں چلّا رہی ہے

اسے سن سن کے کب تک سر دھنو گے بس اختر سو رہو نیند آ رہی ہے

رُوبائے شیراز

فلسفۂ حافظ پر ایک شرح

شب کو یوں جذبِ تصور نے دکھائی پرواز کھنچ کے آنکھوں میں چلی آئی بہشتِ شیراز

نونہالانِ چمن جھوم رہے تھے جیسے — مستیٔ مے سے بہکتے ہوں بتانِ طنّاز

چار سو عطر فشاں، موجِ نسیمِ سحری! — چار سو رقص کناں، نکہتِ گل کی پرواز

وہ درختوں کی ادا جس پہ تصدق فردوس — وہ پرندوں کی صدا جس پہ فدا نغمۂ ساز

نگہِ شوق ابھی سیراب ہوئی تھی نہ ذرا! — کہ تصور کی کرامات نے بدلا انداز

دیکھتا کیا ہوں کہ اک کنجِ بہار افشاں میں — روحِ حافظ ہے خوش الحانی سے یوں نغمہ طراز

"اے کہ خاموش نشینی بہ بہاراں عجب است
خیز و در کاسۂ زر، آبِ طربناک انداز!"

مسکراتے ہوئے لہجے میں سنی جب یہ صدا — آگے بڑھ کر یہ کہا میں نے پس از عرضِ نیاز

اے کہ ہے ذہن ترا اوجِ حقیقت کو محیط! — اے کہ ہے فکرِ رسا تیری ثریا پرواز

تیری نظروں میں ہیں بے پردہ کل اسرارِ حیات — نغمے کے بھیس سے تا بہ رگِ پردۂ ساز

لیکن اک نکتہ سمجھ میں نہیں آیا اب تک — چہرۂ حسنِ حقیقت سے اٹھا پردۂ راز

کبھی کہتا ہے کہ مرنے سے نہیں ہم کو مفر — یہ حیاتِ دو سہ روزہ نہیں سرمایۂ ناز

کبھی کہتا ہے کہ ہنگامِ عمل کو نہ گنواؤ — عرصۂ دہر میں ہمت کے دکھاؤ اعجاز

اک طرف تو یہ صلا ہے کہ ہے دنیا فانی — بزمِ ہستی ہے اک افسانۂ محمود و ایاز

اک طرف جوشِ نصیحت کی ہے ہر دم تاکید — کہ دریں عرصہ گہِ سعی تو طفلانہ متاز

کوئی نغمہ نہیں یوں تو ترا الہام سے کم — لیکن اس رازِ تفاوت کا ہوں میں شکوہ طراز

یعنی مرنا ہے جب اک دن تو عمل سے کیا کام — موت کا خوف ہو کیوں فکرِ عمل کا ہم ساز

سن کے یہ شوخ بیانی مری خواجہ نے کہا

"تُو حریفِ غمِ اسرار نہ ای ہرزہ متاز!"

موت کے ذکر سے مقصود، فقط اتنا ہے
کہ نظر میں رہے ہر وقت مآلِ آغاز
یعنی اک روز جب اس گھر سے چلے جانا ہے
جب کہ مٹ جانے کو ہے رنگِ طلسماتِ مجاز
تو یہ بہتر ہے کہ سب حوصلے دل کے نکلیں
ہمت و سعی سے انساں ہو جہاں میں ممتاز
زندہ قوموں کی فنا بھی ہے بقا کی ہم رنگ
کیونکہ یاد ان کی ہے دنیا میں عمل کی ہم راز
لوحِ ایام مٹا دیتی ہے اُس قوم کا نام
جس کے دل میں نہ ہو احساسِ عمل، درد نواز
موت برحق ہے مگر اُس سے فقط اس لئے ڈر
کہ نہ کر دے کہیں آئے نہ فرصت کو گداز

"عاقبت منزلِ ما وادیِٔ خاموشاں است
حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز!"

معصومیّت

لیلیٔ شب کے پریشاں ہیں گیسوئے سیاہ
شورش آباد جہاں تیرہ و تار
نشہ برساتی ہے مدہوش ستاروں کی نگاہ
نیند میں غرق ہے سارا سنسار
چار سو چھا گئی خاموشی و ظلمت کی سپاہ
نور و آہنگ نے لی راہِ فرار
نیند کی سیج سے جاگ اُٹھا ہے خوابیدہ گناہ
شیرِ خونخوار ہو جیسے بیدار

رات کے پردوں میں آباد سیہ خانے ہیں
تیرہ و تار، مہیب اور خوں ریز
ذوقِ عصیاں کے بھبکتے ہوئے میخانے ہیں
بحرِ ظلمات میں طوفاں انگیز

معصیت کاری کے بھرے ہوئے مستانے ہیں
ان کے نولادگوں پنجوں میں جو پیمانے ہیں
روحِ دوشیزگی سے گرم ستیز
خونِ عفت سے ہیں یک سر لبریز

چار سو موجزن اک حشرِ سیہ کاری ہے
بزمِ انسانی پہ اک ابرِ گنہ طاری ہے
ہر طرف فسق کا اک سیلِ بلا جاری ہے
محشرستانِ سیہ مستی و سرشاری ہے
تند، ہنگامہ فگن، طوفانی!
قہر گوں، شعلہ فشاں، ہیجانی!
شورش انگیز درپۂ از طغیانی!
مست ہے جلوہ گہِ انسانی!

یہ سماں دیکھ کے ایک حور وہاں آتی ہے
اور نظر اس ہوس آباد پہ دوڑاتی ہے
عالمِ یاس میں مبہوت سی رہ جاتی ہے
چاند کی روشنی اک نشّہ سا برساتی ہے
مشک بو زلفوں کو بکھرائے ہوئے
فرطِ تقدیس سے گھبرائے ہوئے
اشکِ غم آنکھوں میں چھلکائے ہوئے
سینۂ صاف پہ لہرائے ہوئے

فلکِ حسن کا گم گشتہ ستارہ کہیے!
جنتِ قدس کا آوارہ نظارہ کہیے
بحرِ رعنائیٔ فطرت کا کنارہ کہیے
جذبِ موسیقی کا اک نقشِ دلآرا کہیے
جس سے روشن ہے فضائے صحرا
جس سے رنگیں ہے ہوائے صحرا
جس سے ہے مست ادائے صحرا!
نغمۂ روح فزائے صحرا!

اک فرشتوں کے سے لہجے میں وہ کرتی ہے خطاب (آہ! وہ لہجہ حزین و غم ناک)
کہ "تم اے راہزنِ عفّت و آوارہ شباب سرخوش و بے خود و مست و ناپاک"
"تم جو عفّت کا لٹاتے ہو یہ دُرِّ نایاب کرکے دامانِ تقدس کو چاک"
"یہ وہ جوہر ہے جو ہے رشکِ نجوم و مہتاب اور حیرت گہِ حسنِ افلاک"

"ہاں یہ اک جاذبۂ فطرتِ ربّانی ہے اور دنیا کی مثالوں سے بری"
"عالمِ قدس کا اک جوہرِ نورانی ہے روشن از جلوۂ نجمِ سحری"
"اس گنہ زار میں بہرِ دلِ انسانی ہے رُوحِ صد مریمی و حور و پری"
"روحِ قدرت کا یہ اک جلوۂ عرفانی ہے یا الٰہیّتِ ذوقِ بشری"

"یہ وہ نشّہ ہے کہ ایسا کسی صہبا میں نہیں رُوحِ کیفیتِ صہبا کی قسم"
"یہ وہ موتی ہے کہ ایسا کسی دریا میں نہیں قعرِ تاریکیٔ دریا کی قسم"
"یہ وہ تابش ہے جو رخسارِ ثریا میں نہیں نورِ رخسارِ ثریا کی قسم"
"یہ وہ لذت ہے کہ جو الفتِ سلمٰی میں نہیں جذبۂ الفتِ سلمٰی کی قسم"

"ذرّے ذرّے میں ہے اک رُوحِ حقیقت مستور اور ہر ذرّے کی قیمت ہے وہی"
سینۂ شمع میں ہے سوزِ محبت مستور شمعِ پُرسوز کی فطرت ہے وہی"
"غنچے کے دل میں ہے اک جذبۂ نکہت مستور غنچے کی سرمدی صورت ہے وہی"

"مہِ تابندہ جو محرومِ لطافت ہو جائے — نام اُس کا مہِ تاباں نہ رہے"
"روشنیٔ صبحِ درخشاں کی جو غارت ہو جائے — صبح، پھر صبحِ درخشاں نہ رہے"
"شام سے دُور اگر شام کی رنگت ہو جائے — شام، شامِ شفق افشاں نہ رہے"
"گر جوانی یونہی بیگانۂ عفت ہو جائے — زینتِ پیکرِ انساں نہ رہے"

"ساز کے پردے میں بے تاب گر آواز نہ ہو — ساز پھر ساز نہ کہلائے کبھی"
"دلِ نکہت میں اگر جذبۂ پرواز نہ ہو — صحنِ گلشن کو نہ مہکائے کبھی"
"گل میں گر ذوقِ نمو پردہ بر انداز نہ ہو — گل نگاہوں کو نہ للچائے کبھی"
"گر جوانی میں بھی تقدیس کا انداز نہ ہو — وہ جوانی نہ نظر آئے کبھی"

"مئے رنگیں سے اگر نشّہ و لذّت چھن جائے — سادہ پانی ہے وہ یا تلخِ شراب"
"ماہِ تاباں سے اگر نور و لطافت چھن جائے — تودۂ خاک ہے وہ یا مہتاب"
"گلِ رعنا سے جو رنگینیٔ و نکہت چھن جائے — سوکھی پتّی ہے وہ یا برگِ گلاب"
"جس جوانی سے کہ رنگینیٔ عفّت چھن جائے — اشکِ پیری ہے وہ یا نوشِ شباب"

"الغرض فلسفۂ ذوقِ جوانی یہ ہے — کہ جوانی نہ لٹائی جائے"
"مئے پارینہ کی خوبی کی نشانی یہ ہے — مدّتوں تک وہ چھپائی جائے"
"عفّت اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے — شاعروں کو نہ سنائی جائے"

"مذہبِ شعر کی الہام فشانی یہ ہے
معصیت خوب بڑھائی جائے"

"کب تک؟ اے گمرہو! یہ عالمِ عفت کب تک؟
اور یہ نفس پرستی تا چند؟"
"موجۂ خوں میں لہو دورۂ وحشت کب تک؟
دل میں یہ جذبۂ پستی تا چند؟"
"روح آلودۂ تاریکیٔ ذلت کب تک؟
اور یہ جذبات کی مستی تا چند؟"
"یہ شباب اور یہ بربادیٔ عفت کب تک؟
ہاں! گناہوں کی یہ بستی تا چند؟"

"روح کے گل کدے ویران ہوئے جاتے ہیں
شیطنت کاری کے سینے مسکن"
"دل کے شورش کدے سنسان ہوئے جاتے ہیں
اور جذباتِ صفا کے مدفن"
"ولولے خیر کے بے جان ہوئے جاتے ہیں
اور منزل گہِ صد اہرمن"
"جو تھے انسان وہ حیوان ہوئے جاتے ہیں
آہ! او سفلگیٔ چرخِ کہن"

"آئے گا ایک دن آئے گا کہ شرماؤ گے تم
اور میں ہاتھوں سے نکل جاؤں گی"
"عالمِ یاس میں میرے لئے گھبراؤ گے تم
اور میں صورت بھی نہ دکھلاؤں گی"
"پچھلی بار ذوقیوں کو ذہن میں جب لاؤ گے تم
شرم بن کر تمہیں شرماؤں گی"
"یاد کر کے مجھے پھر روؤ گے، پچھتاؤ گے تم
میں مگر ہاتھ نہیں آؤں گی"

گجرات کی رات

آج قسمت سے نظر آئی ہے برسات کی رات
کیا بگڑ جائے گا، رہ جاؤ یہیں رات کی رات

اُن کی پابوسی کو جائے تو صبا کہہ دینا
آج تک یاد ہے وہ آپ کے گجرات کی رات

جس میں سلمیٰ کے تصور کے ہیں تارے روشن
میری آنکھوں میں ہے وہ عالمِ جذبات کی رات

ہائے وہ مست گھٹا، ہائے وہ سلمیٰ کی ادا
آہ! وہ رودِ چناب آہ! وہ گجرات کی رات

میرے سینے پہ ادھر زلفِ معطر کا ہجوم!
(آہ! وہ زلف کہ آوارہ خرابات کی رات

سطحِ دریا پہ اُدھر نشے میں لہرائی ہوئی
رنگ لائی ہوئی، چھائی ہوئی برسات کی رات

اُف وہ سوئی ہوئی، کھوئی ہوئی فطرت کی بہار
اُف وہ بہکی ہوئی، بہکی ہوئی برسات کی رات

پھر وہ ارمانِ ہم آغوشی کا جذبِ گستاخ
آہ وہ رات وہ سلمیٰ سے ملاقات کی رات

کیوں نہ ان دونوں پہ مٹنے کی ہو حسرت اختر
اُف وہ اس رات کی بات، آہ وہ اُس بات کی رات

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل، اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے، لعنت گہِ ہستی سے
اِن نفس پرستوں سے، اِس نفس پرستی سے

دُور ــــــــ اور کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

ہم پریم پجاری ہیں، تو پریم کنہیا ہے!
تو پریم کنہیا ہے، یہ پریم کی نیا ہے!
یہ پریم کی نیا ہے، تو اس کا کھویا ہے!
کچھ فکر نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم!
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم!
جو آس کہ تھی وہ بھی اب توڑ رہے ہیں ہم!
بس تاب نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
یہ جبر کدہ، آزاد افکار کا دشمن ہے!
ارمانوں کا قاتل ہے، امیدوں کا رہزن ہے!
جذبات کا مقتل ہے، جذبات کا مدفن ہے!
چل یاں سے کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
آپس میں چھل اور دھوکے سنسار کی ریتیں ہیں!
اس پاپ کی نگری میں اُجڑی ہوئی پریتیں ہیں!
یاں نیائے کی ہاریں ہیں، انیائے[1] کی جیتیں ہیں!

[1] بے انصافی

سُکھ چین نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
اِک مذبحِ جذبات دافکار ہے یہ دُنیا!
اک مسکنِ اشرار و آزار ہے یہ دنیا!
اک مقتلِ احرار و ابرار ہے یہ دنیا!

دُور اس سے کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
یہ درد بھری دنیا بستی ہے گناہوں کی!
دل چاک امیدوں کی، سفاک نگاہوں کی!
ظلموں کی، جفاؤں کی، آہوں کی، کراہوں کی!

ہیں غم سے حزیں، لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
آنکھوں میں سمائی ہے، اک خواب نما دُنیا!
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دُنیا!
جنت کی طرح رنگیں، شاداب نما دُنیا!

للّٰلہ وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
وہ تیر ہو ساگر کی، رُت چھائی ہو پھاگن کی!

پھولوں سے مہکتی ہو، پُروائی گھنے بن کی!
یا آٹھ پہر جس میں جھڑ بدلی ہو ساون کی!

جی بس میں نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

قدرت ہو حمایت پر ہمدرد ہو قسمت بھی!
سلمٰی بھی ہو پہلو میں سلمٰی کی محبت بھی!
ہر شے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی!

اے طفلِ حسیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

اے عشق ہمیں لے چل، اِک نُور کی وادی میں
اک خواب کی دُنیا میں، اک طور کی وادی میں
حُوروں کے خیالاتِ مسرور کی وادی میں

تا خُلدِ بریں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

سنسار کے اس پار اک اس طرح کی بستی ہو
جو صدیوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے نظاروں پر تنہائی برستی ہو

یوں ہو تو وہیں لے چل!

اے عشق ، کہیں لے چل !
مغرب کی ہواؤں سے ، آواز سی آتی ہے
اور ہم کو سمندر کے اُس پار بلاتی ہے
شاید کوئی تنہائی کا دیس بتاتی ہے
چل اُس کے قریں لے چل !
اے عشق ، کہیں لے چل !
اک ایسی فضا جس تک غم کی نہ رسائی ہو
دنیا کی ہوا جس میں صدیوں سے نہ آئی ہو
اے عشق ! جہاں تو ہو اور تیری خدائی ہو

اے عشق ، وہیں لے چل !
اے عشق ، کہیں لے چل !
ایک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہوں
تو خوف نہیں لے چل !
اے عشق ، کہیں لے چل !
برسات کی متوالی گھنگھور گھٹاؤں میں
کہسار کے دامن کی مستانہ ہواؤں میں

یا چاندنی راتوں کی شفاف فضاؤں میں

اے زہرہ جبیں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

اِن چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
اِن نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھہری ہوئی نہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں

اے خضر حسیں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

اک ایسی بہشت آئیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں

لے چل تو وہیں لے چل!
اے عشق، کہیں لے چل!

تنہائی کی وادی میں

(غالب کی پروازِ خیال کے ساتھ)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے / کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو"

اہلِ عالم ہوں، نہ ربطِ دوستی و دشمنی / مہرباں کوئی نہ ہو، نا مہرباں کوئی نہ ہو

دامنِ صحرا میں چل کر یوں گزارا چاہیئے / سر میں ہو بیتاب سودا، آستاں کوئی نہ ہو

ابنِ آدم کے اثر تک سے ہو بیگانہ فضا / مرد و زن کوئی نہ ہو پیر و جواں کوئی نہ ہو

زخمہ زن ہو بربطِ دل پر نہ سوزِ عاشقی / کوئی دلدادہ نہ ہو اور دلستاں کوئی نہ ہو

اپنی فریادوں کی لے میں رات دن کھوئے رہیں / ہم نوا کوئی نہ ہو، ہم داستاں کوئی نہ ہو

دل میں پیدا ہی نہ ہو، اول تو دردِ آرزو / ہو تو اس کی بیکسی کا رازداں کوئی نہ ہو

رو دیجئے تو ہو نہ اپنے حال کا پرساں کوئی / اور اگر فریاد کیجے ہم زباں کوئی نہ ہو

"پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار / اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اختر! اس تنہائی کی وادی میں اپنے واسطے / جب بنے تربت تو تربت کا نشاں کوئی نہ ہو

ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے / شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے

کبھی چمن میں گئی ہو، تو مست پھولوں نے / نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے

روپہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر / ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے

بہارِ صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے — نسیم نے تمہیں مستانہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو — بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
قریبِ شام تمہیں طائرانِ گلشن نے — ہزار بار سرِ لالہ زار دیکھا ہے
بہشتِ حسن کی تازہ کلی کے دھوکے میں — کلی نے بھی تمہیں، دیوانہ وار دیکھا ہے
سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے — شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے
ہمیشہ رات کو محوِ مطالعہ تم کو — نگاہِ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے
کبھی جو اٹھی ہو گیسو سنوارنے کے لئے — تو آئینہ نے تمہیں ہم کنار دیکھا ہے
کسی خیال میں کھوئے ہوئے ہمیشہ تمہیں — سحر نے محوِ گل و شاخسار دیکھا ہے
تمہاری خلوتِ معصوم نے ہزاروں بار — سرِ پیانو تمہیں نغمہ بار دیکھا ہے
گھٹا نے دامنِ کہسار میں تمہیں اکثر — اسیرِ زمزمۂ آبشار دیکھا ہے
عروسِ برق نے اپنا نقاب الٹ کے تمہیں — غریقِ مستیٔ ابرِ بہار دیکھا ہے
نسیمِ باغ نے زیب النسا سمجھ کے کبھی — تمہیں بہ گل کدۂ شالامار دیکھا ہے
غرض مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تم کو — ہزار بار نہیں، لاکھ بار دیکھا ہے
مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے — کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے

دکھا دو ایک جھلک اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو
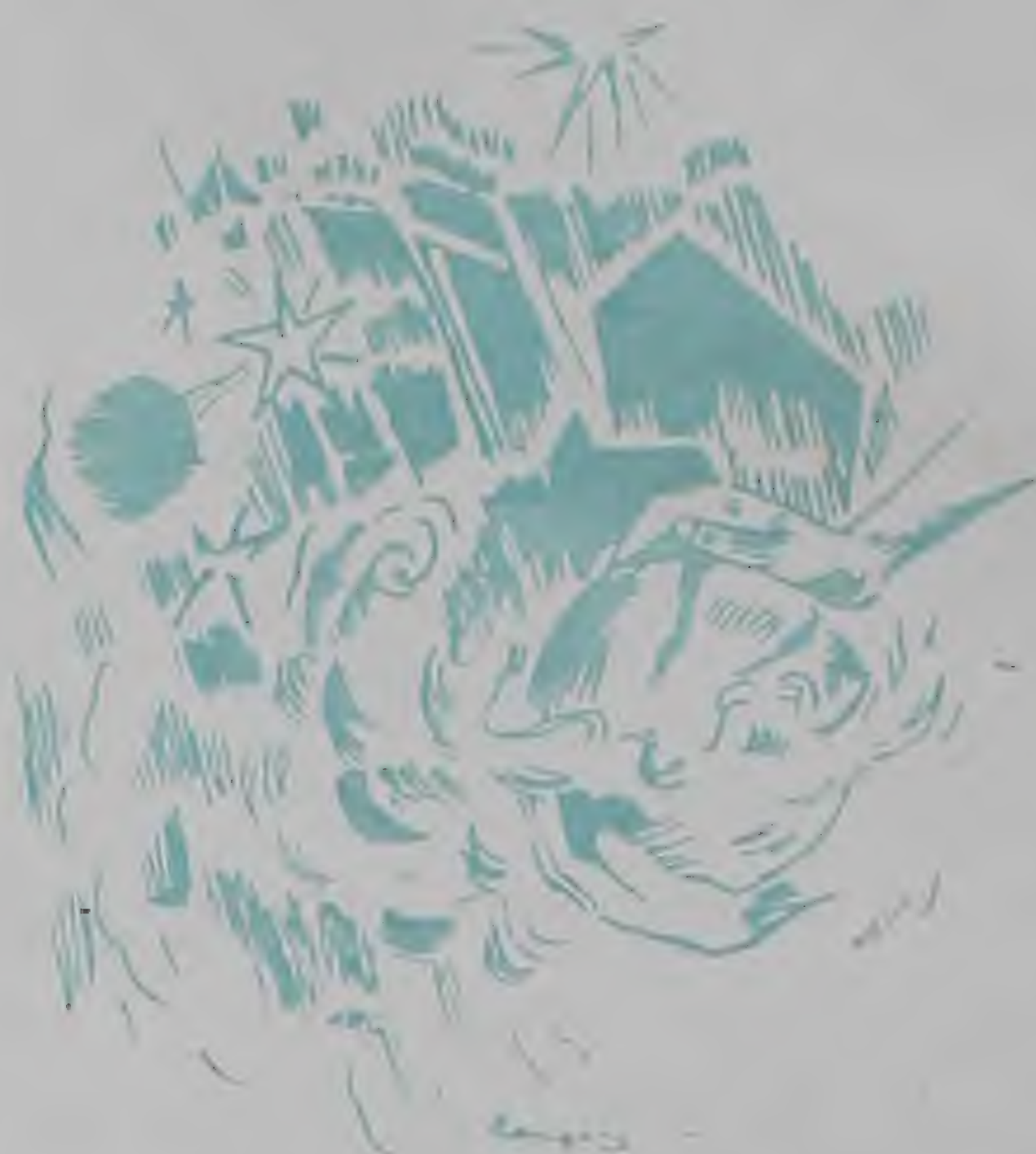
نوائے گُل!

(طراز تاں کا)

دیار دوست سے کوئی پیام لے کر آئی ہے ہوائے گُل
کہ گود میں مچل رہے ہیں بے طرح حسین خندہ ہائے گُل
بہار ہے خدائے گل، تو بوئے گل کو جانئے دعائے گُل
چمن میں آکے بربطِ نسیم پر سنے کوئی نوائے گُل
زمین و آسماں کا رازِ عشق کھل گیا جو شوخ چاند نے
کرن کے تار تار میں پرو لئے چرا کے بوسہ ہائے گُل
چمن میں روتے روتے بلبل آخر ایک گھڑی ہی نیند سو گئی
دبی زبان سے مرتے مرتے اتنا کہنے پائی تھی کہ ہائے گُل
نسیم صبح کی رقابتیں "حباب کی زباں" سے کہہ نہ دیں
یہ بھر لے تو جا رہی ہے، بھر کے دامنوں میں بوسہ ہائے گُل
لرز رہا ہے میرا دل کہیں خزاں کی آندھیاں گرا نہ دیں
کہ جھولتی ہے تین چار پتیوں پہ کارواں سرائے گُل
کہیں نہ کوچ کر رہا ہو گلستاں سے قافلہ بہار کا
یہ آج منہ اندھیرے ہی سے جاگ اٹھا ہے ورنہ کیوں نوائے گُل

مرے دل و دماغ و گوش و چشم و تن پہ کیف بن کے چھا گئی
ادائے گل، ہوائے گل، نوائے گل، فضائے گل، قبائے گل
حریم رنگ و بو میں آج ملکۂ بہار جلوہ ریز ہے
نسیمِ صبح نے اٹھا دئے ہیں ہر طرف سے پردہ ہائے گل
یہ آرزو ہے اخترؔ اب کہ مر کے اس کے رنگ و بو میں سو رہوں
مرا مزار ہو سرائے گل، مرا کفن بنے قبائے گل

اعترافِ محبّت

لو آؤ کہ رازِ پنہاں کو رسوائے حکایت کرتا ہوں!
دامانِ زبانِ خامشی کو لبریز شکایت کرتا ہوں!
گھبرا کے ہجوم غم سے آج افشائے حقیقت کرتا ہوں!
اظہار کی جرأت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

فکر آبادِ دنیا میں مری، اک مسجودِ افکار ہو تم!
شعرستانِ ہستی میں مری، اک معبودِ اشعار ہو تم!
اور میرے پرستشِ رازِ دل میں اک بُتِ شیریں کار ہو تم!
میں جس کی عبادت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

مدت سے محبت کرتا تھا، سو جان سے تم پر مرتا تھا!
راتوں کو میں روتا رہتا تھا، راتوں کو میں آہیں بھرتا تھا!
ہاں راتوں کو آہیں بھرتا تھا، پر تم سے جو کہتے ڈرتا تھا!
آج اس کی جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

راتوں کو مرے رونے کا سماں، بیدار ستارے دیکھتے ہیں
اور میرے جنوں کے عالم کو، عالم کے نظارے دیکھتے ہیں
باغوں کے مناظر دیکھتے ہیں، نہروں کے کنارے دیکھتے ہیں
یوں شرح مصیبت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

حسرت بھری فریادوں کو مری باغوں کی فضائیں جانتی ہیں!
فریاد سے لبریز آہوں کو صحرا کی ہوائیں جانتی ہیں!
اور میرے مچلتے آنسوؤں کو ساون کی گھٹائیں جانتی ہیں!
اظہار حقیقت کرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

جس دن سے وہ صورت دیکھی ہے سو آرزوئیں بیتاب سی ہیں
دن ہیں تو وہ بے آرام سے ہیں، راتیں ہیں تو وہ بیخواب سی ہیں
آنکھوں تلے ہر دم پھرتی ہیں وہ "ساعدیں" جو مہتاب سی ہیں

یاد، اُن کی صباحت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

تم چاند سے بڑھ کر روشن ہو، زہرہ کی قسم تاروں کی قسم
تم پھول سے بڑھ کر رنگیں ہو، فطرت کے چمن زاروں کی قسم
تم سب سے حسیں ہو دُنیا کی، دُنیا کے نظاروں کی قسم

دُنیا سے بھی نفرت کرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

اس مکر کی دنیا میں کہ جہاں معیارِ صداقت کچھ بھی نہیں!
"دو اشکوں" سے بڑھ کر سچا اور اظہارِ محبت کچھ بھی نہیں!
روتا ہوں تمہاری یاد میں گو رونے کی شہادت کچھ بھی نہیں!

پیش اتنی شہادت کرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

جب رات کی بیکس تنہائی میں، آپ کو تنہا پاتا ہوں!
میں بربطِ دل سے سوز و گدازِ عشق کے نغمے گاتا ہوں!
اتنا تو بتا دو تم بھی مجھے، کیا میں بھی کبھی یاد آتا ہوں!

بتلاؤ کہ منّت کرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

گو تم سے مجھے نسبت نہیں کچھ اور ہے تو گدا و شاہ کی ہے

وہ ذرّہ ہوں جس کے دل میں نہاں امید، وصالِ ماہ کی ہے
اک شاعرِ مفلس جس کو ہوس اک قیصرۂ ذی جاہ کی ہے
پھر بھی یہ جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

گر حکم دو روشن تاروں کو، میں لا کے جھکا دوں قدموں پر
جنت کے شگفتہ پھولوں کی جنت سی بسا دوں قدموں پر
سجدے کو یہ مہرِ ماہ کو بھی سجدے میں گرا دوں قدموں پر
ناچیز ہوں ہمت کرتا ہوں!
میں تم سے محبت کرتا ہوں!

چند روز لکھنؤ میں

بعد مدت کے نظر آیا دیارِ لکھنؤ!
عرش ساماں کیوں نہ ہو خاکِ دیارِ لکھنؤ
مٹ چکے ہیں گرچہ تاج و تاجدارِ لکھنؤ
مشرقی رنگِ تمدن کی ہے خالص یادگار
نو بہارِ خلد کے کھوئے ہوئے کچھ خواب ہیں
یہ محلِ اسلاف کی تہذیب کا گہوارہ ہے
یہ فلک رتبہ مکاں، یہ خلد ساماں گلستاں

دل فدائے لکھنؤ! آنکھیں نثارِ لکھنؤ!
ہے بہارِ خلد سے بڑھ کر بہارِ لکھنؤ
پھر بھی زندہ ہے ابھی رعب و وقارِ لکھنؤ
کیوں نہ ہو ہر مشرقی دل سے نثارِ لکھنؤ
مایۂ حیرت نہیں نقش و نگارِ لکھنؤ
ہند میں کافی ہے یہ تنہا وقارِ لکھنؤ
رشکِ مہر و ماہ ہیں نقش و نگارِ لکھنؤ

وہ ہے تنہا آسماں پر، اس میں ہیں لاکھوں نہاں
کیوں نہ ہو زہرہ کو رشکِ نغمہ زارِ لکھنؤ!

ماہ ور آغوش ہے ہر ذرّہ اس کی خاک کا
اے نہے حسنِ "طرب گاہ" دیارِ لکھنؤ

محفلِ شعر و ادب ہے مستِ صہبائے نیازؔ
ہے نگارِ لکھنؤ! اے رشکِ نگارِ لکھنؤ

خامۂ جالبؔ کہ ہے جس پر صحافت کو غرور
ایک مدت سے ہے مخمورِ بہارِ لکھنؤ

کس ادب سے لب پہ آتا ہے مرے احسنؔ کا نام
جن کی ہستی ہے فروغِ افتخارِ لکھنؤ

حضرت شہزادۂ باقر علی خاں کا خلوص
دل میں ہے مہماں بطورِ یادگارِ لکھنؤ

چونک کر خوابِ لحد سے اپنے ویرانوں کو دیکھ
جانِ عالم! آہ او، جانِ بہارِ لکھنؤ

آہ میری پارسائی کی یہ سادہ بیکسی
ہائے یہ رنگینیٔ بلبل و بہارِ لکھنؤ

مجھ کو ان پرجوش شبستانوں میں مر جانے بھی دے
اے طرب آبادِ ہند! اے حسن زارِ لکھنؤ

ایک حسنِ نازنیں تڑپائے گا برسوں ہمیں
"یہ خلش" دل میں رہے گی یادگارِ لکھنؤ

اگلی عظمت یاد آتی ہے یہ بے رونق دیکھ کر
ہم تو اخترؔ اب بھی ہیں ماتم گسارِ لکھنؤ

وکٹوریہ میموریل میں

(چند زندہ تصویریں دیکھ کر)

حسین چہروں سے رنگیں نقاب اٹھائے ہوئے
شریر آنکھوں میں سو بجلیاں لبائے ہوئے

خرامِ ناز پر مستانہ لغزشوں کا ہجوم
فضا کی گود میں میخانے تھرتھرائے ہوئے

سیاہ پردوں میں شاداب نازنیں چہرے
حسین تارے گھٹاؤں میں جگمگائے ہوئے

گھنیری زلفوں کے سائے میں عارضوں کی بہار — اندھیری شاخوں میں کچھ پھول لہلہائے ہوئے
سیہ نقاب میں روشن شفق نمار خمار — چراغ، رات کے پردوں میں جھلملائے ہوئے
شفق کی موجوں پہ تنویرِ رنگ و بو رقصاں — کہ ان کے لب پہ تبسم سے لہلہائے ہوئے
نشرد مہکتے گلِ ماہتاب کا جس کو — جوان چہروں پہ وہ نور جگمگائے ہوئے
رُخِ صبیح پہ گیسوئے مشک بو کا ہجوم — فرشتے جانبِ افلاک پر اٹھائے ہوئے
فضائے کاکلِ مشکیں میں شعلہ گوں عارض — سوادِ شام میں آتش کدے جلائے ہوئے
قدم قدم پہ نگاہوں کو دعوتِ سجدہ — کنارِ شام میں بتخانے سے بسائے ہوئے
فضائے باغ میں لرزاں وہ پھول سے پیکر — شفق میں ڈوبے ہوئے نور میں نہائے ہوئے
وہ ہر نظر میں کوئی ماجرا طراز ادا! — وہ ہر ادا میں کوئی راز سا چھپائے ہوئے
زبانِ حافظ و خیامؔ میں تکلم ریز! — شراب و شعر کے بادل فضا پہ چھائے ہوئے
بھلا چکی جنہیں صدیوں سے سرزمینِ عجم — نقاب میں وہی آتش کدے چھپائے ہوئے
ہر اک ادا عجمیت کے رنگ سے سرشار — میموریل کو سوادِ عجم بنائے ہوئے

نگاہِ یاس کو اذنِ کلام دیتی جاؤ!
مسافرانِ حزیں کا سلام لیتی جاؤ!

آنسو

میرے پہلو میں جو بہہ نکلے تمہارے آنسو — بن گئے شامِ محبت کے ستارے آنسو
دیکھ سکتا ہے بھلا کون یہ پیارے آنسو — میری آنکھوں میں نہ آجائیں تمہارے آنسو

شمع کا عکس جھلکتا ہے جو ہر آنسو میں
بن گئے بھیگی ہوئی رات کے تارے آنسو

مینہ کی بوندوں کی طرح ہو گئے سستے کیوں آج
موتیوں سے کہیں مہنگے تھے تمہارے آنسو

صاف اقرارِ محبت ہو زباں سے کیوں کر
آنکھ میں آ گئے یوں شرم کے مارے آنسو

ہجر ابھی دور ہے، میں پاس ہوں، اے جانِ وفا
کیوں ہوئے جاتے ہیں بے چین تمہارے آنسو

صبح دم دیکھ نہ لے کوئی یہ بھیگا آنچل
میری چغلی کہیں کھا دیں نہ تمہارے آنسو

اپنے داماں و گریباں کو میں کیوں پیش کروں
ہیں مرے عشق کا انعام تمہارے آنسو

دمِ رخصت ہے قریب، اے غمِ فرقت خوش ہو
کرنے والے ہیں جدائی کے اشارے آنسو

صدقے اس جانِ محبت کے میں اختر جس کے
رات بھر بہتے رہے شوق کے مارے آنسو

ارواحِ معصوم

نگاہوں میں فرشتوں کی مسرت تھرتھراتی ہے
لبوں پر ننھی کلیوں کی لطافت مسکراتی ہے

وہ موسیقی جو آوارہ تھی جنت کی بہاروں میں
زباں پر ان کی موجِ کیف بن کر گنگناتی ہے

وہ نکہت جو سما سکتی نہیں پھولوں کے دامن میں
وہ ان شاداب پھولوں کی جبیں پر لہلہاتی ہے

وہ تابانی کہ طوفان ہے تاروں کی شعاعوں میں
سیہ آنکھوں میں ان کی بن کے بجلی جگمگاتی ہے

وہ شادابی جو پوشیدہ ہے حوروں کے تبسم میں
لبوں پر ان کے موجِ رنگ بن کر جھلملاتی ہے

وہ روحانی لطافت، جس کو کھو بیٹھی ہے یہ دنیا
ابھی ان کے تبسم سے جھلک اپنی دکھاتی ہے

بہارستانِ طفلی کی یہ معصوم روحیں ہیں
جنہیں فطرت خود اپنی دل کی گودی میں کھلاتی ہے

اے سرزمینِ گجرات

اے سرزمینِ گجرات ! اے خلد زارِ اُلفت !
پھولوں میں تیرے رقصاں، رُوحِ بہارِ اُلفت !
تیرا ہر ایک ذرّہ ہے رازدارِ اُلفت !
اے یادگارِ اُلفت!
اے سرزمینِ گجرات!

حُسن و حجاب کا اِک گہوارہ کہیئے تجھ کو !
شعر و شباب کا اِک شہپارہ کہیئے تجھ کو!
فطرت کا ایک رنگیں نظّارہ کہیئے تجھ کو!
گُل پارہ کہیئے تجھ کو !
اے سرزمینِ گجرات !

اے سرزمینِ گجرات، تو کانِ عاشقی ہے!
پنجاب کے بدن میں، تو جانِ عاشقی ہے!
ہاں جانِ عاشقی ہے، ارمانِ عاشقی ہے!
ایمانِ عاشقی ہے!
اے سرزمینِ گجرات!

وہ سوہنی مہینوال ، وہ عشق باز تیرے !

دو رُوحِ عاشقی کے آدابِ راز تیرے !
سوز و گداز سے دو، لبریز ساز تیرے !
نغمہ طراز تیرے !
اے سرزمینِ گجرات!

افسانۂ حزیں ہے، رسوائے عام جن کا !
دُنیائے عاشقی میں زندہ ہے نام جن کا !
آنسو کی طرح چھلکا، اُلفت کا جام جن کا !
دورِ مرام جن کا !
اے سرزمینِ گجرات!

ماتم سرا ہے جن کے غم میں چناب اب تک !
بیتاب، جن کی خاطر ہے، ماہتاب اب تک !
اور جن کو ڈھونڈتی ہے ہر موجِ آب اب تک !
چشمِ حباب اب تک !
اے سرزمینِ گجرات!

تیری ہی خاک، اُن کا گہوارۂ حسیں تھی !
تیری فضا ہی ان کا آغوشِ نازنیں تھی!
تیرے ہی در پہ اُن کی خاکِ آشنا جبیں تھی!
اور سجدہ آفریں تھی!

اے سرزمینِ گجرات!

آنکھوں کے سامنے ہو، رودِ چناب جس دم!
مصروفِ نور پاشی، ہو مہتاب جس دم!
اور دور جلوہ گر ہو پہلوئے آب جس دم!
با اضطراب جس دم!
اے سرزمینِ گجرات!

اُس دم مرے تصوّر، ہم رنگِ خواب ہوکر!
لہراتے ہیں افق پر امواجِ آب ہوکر!
کرتے ہیں رقص، عکسِ صہبائے ناب ہوکر!
کیفِ شراب ہوکر!
اے سرزمینِ گجرات!

آتی ہے سوہنی جب، دریا کے پار ہونے
عاشق کی حسرتوں پر، جاکر نثار ہونے
طوفاں کی شورشوں کا بے بس شکار ہونے
ماتم گسار ہونے!
اے سرزمینِ گجرات!

دریا پہ ہیں پریشاں، وہ دل گداز نغمے!
وہ سوزِ عاشقی کے، شعلہ طراز نغمے!

نغمے، وہ مست کیف عرضِ نیاز، نغمے!
پُرسوز و ساز نغمے!
اے سرزمینِ گجرات!

موجوں کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی ہے!
یا رُوحِ سوہنی کی در پردہ گا رہی ہے!
اور دردِ عاشقی کے نغمے سنا رہی ہے!
آنسو بہا رہی ہے!
اے سرزمینِ گجرات!

دنیائے عاشقی پر، احساں ہیں تیرے اب تک!
حُسن آفریں، بہشتی میداں ہیں تیرے اب تک!
اور عشق خیز، رنگیں بُستاں ہیں تیرے اب تک!
داماں ہیں تیرے اب تک!
اے سرزمینِ گجرات!

عُریاں ہے حسن، تیرے سرسبز گلشنوں میں!
آوارہ، عشق، تیرے شاداب دامنوں میں!
فطرت، برہنہ، تیرے پُرنور امنوں میں!
رنگین مسکنوں میں!
اے سرزمینِ گجرات!

اِک سوہنی ہے اب بھی، دامن میں تیرے پنہاں!
اِک یاسمیں ہے اب بھی، گلشن میں تیرے پنہاں!
ہے اک شعاع، اب بھی ایمن میں تیرے پنہاں!
مسکن میں تیرے پنہاں!
اے سرزمینِ گجرات!

بے کیفیٔ جہاں کی تکلیف سے بچالے!
لِللّٰہ مجھ کو اپنے صحراؤں میں بلالے!
اور دوسرا مہینوال اپنا مجھے بنالے!
دیوانوں کی دعالے!
اے سرزمینِ گجرات!

آنکھوں میں بس رہی ہیں، وہ پُر بہار راتیں!
وہ مشکبو ہوائیں، وہ مشکبار راتیں!
وہ نشہ گوں فضائیں، وہ نشہ زار راتیں!
وہ یادگار راتیں!
اے سرزمینِ گجرات!

ماضی کے آئینہ سے، ہاں پھر نقاب اُٹھادے!
بھولا ہوا سماں وہ دُنیا کو پھر دکھادے!
گجرات کی فضا کو پھر رشکِ سابنا دے!

سلمیٰ سے پھر ملادے!
اے سرزمینِ گجرات!

پھر آرزو کو رسوا کرنے کی آرزو ہے!
رونے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے!
سلمیٰ کے قدموں پر سر دھرنے کی آرزو ہے!

مرنے کی آرزو ہے!
اے سرزمین گجرات!

بستی کی لڑکیوں میں

(ایک دیہاتی گیت)

فریادیٔ جفائے ایام ہو رہا ہوں
پامالِ جورِ بختِ ناکام ہو رہا ہوں
سرگشتۂ خیالِ انجام ہو رہا ہوں
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

بدنام ہو رہا ہوں!
سلمیٰ سے دل لگا کر!
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
سلمیٰ سے دل لگا کر سلمیٰ سے دل لگا کر

اُس حورِ وشِ کے غم میں دنیا و دیں گنوا کر　　　ہوش و حواس کھو کر، صبر و سکوں لٹا کر
بیٹھے بٹھائے دل میں، غم کی خلش بسا کر
ہر چیز کو بھلا کر!
سلمیٰ سے دل لگا کر!
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
کہتی ہیں سب، یہ کس کی تڑپا گئی ہے صورت
سلمیٰ کی شاید اس کے من بھا گئی ہے صورت　　　اور اس کے غم میں اتنی مرجھا گئی ہے صورت
مرجھا گئی ہے صورت، کمھلا گئی ہے صورت
سنولا گئی ہے صورت
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
پنگھٹ پہ جب کہ ساری ہوتی ہیں جمع آ کر
گاگر کو اپنی رکھ کر، گھونگٹ اٹھا اٹھا کر　　　یہ قصہ چھیڑتی ہیں مجھ کو بتا بنا کر
سلمیٰ سے باتیں کرتے دیکھا ہے اس کو جا کر
ہم نے نظر بچا کر!"
سلمیٰ سے دل لگا کر!
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!
راتوں کو گیت گانے، جب مل کر آتی ہیں سب

تالاب کے کنارے، دھومیں مچاتی ہیں سب جنگل کی چاندنی میں منگل مناتی ہیں سب
تو میرے اور سلمیٰ کے گیت گاتی ہیں سب
اور ہنستی جاتی ہیں سب
سلمیٰ سے دل لگا کر!

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
کھیتوں سے لوٹتی ہیں جب دن چھپے مکاں کو
تب بانٹتے ہیں باہم وہ میری داستاں کو دہرا کے، چھیڑتی ہیں سلمیٰ کو، میری جاں کو
اور وہ حیا کی ماری سی لیتی ہے زباں کو
کیا چھیڑے اس بیاں کو
سلمیٰ سے دل لگا کر!

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
کہتی ہے رحم کھا کر یوں ایک ماہ طلعت
یہ شہری نوجواں تھا کس درجہ خوبصورت آنکھوں میں بس رہی ہے اب بھی وہ پہلی رنگت
دو دن میں آہ کیا سے کیا ہو گئی ہے حالت
اللہ تیری قدرت
سلمیٰ سے دل لگا کر!

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
اُس شمع رو کا جب سے پروانہ بن گیا ہوں

بستی کی لڑکیوں میں افسانہ بن گیا ہوں   ہر ماہ وش کے لب کا پیمانہ بن گیا ہوں
دیوانہ ہو رہا ہوں، دیوانہ بن گیا ہوں
دیوانہ بن گیا ہوں
سلمٰی سے دل لگا کر!
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!
ان کی زباں پہ میری جتنی کہانیاں ہیں
کیا جانیں یہ کہ دل کی سب مہربانیاں ہیں   کمسن ہیں، بے خبر ہیں، اُٹھتی جوانیاں ہیں
کیا سمجھیں، غم کے ہاتھوں کیوں سرگرانیاں ہیں
کیوں خوں فشانیاں ہیں
سلمٰی سے دل لگا کر!
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
ہر اک سے رحم کا یوں اظہار ہو رہا ہے
"بے چارے کو یہ کیسا آزار ہو رہا ہے   دیکھے تو کوئی جانے بیمار ہو رہا ہے
کس درجہ زندگی سے بیزار ہو رہا ہے
ناچار ہو رہا ہے"
سلمٰی سے دل لگا کر!
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
اک پوچھتی ہے آکر "تم بے قرار کیوں ہو؟

کچھ تو ہمیں بتاؤ یوں دل فگار کیوں ہو؟ کیا روگ ہے کہو تو تم اشکبار کیوں ہو؟
دیوانے کیوں ہوئے ہو دیوانہ وار کیوں ہو؟
باحالِ زار کیوں ہو؟
سلمیٰ سے دل لگا کر!

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!
جاؤں شکار کو گر باہمرہانِ صحرا!
کھیتوں سے گھورتی ہیں یوں دخترانِ صحرا بجلی کی روشنی کو جیسے میانِ صحرا
تاریک شب میں دیکھیں کچھ آہوانِ صحرا!
حیرت کشانِ صحرا!
سلمیٰ سے دل لگا کر!

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!
اک شوخ چھیڑتی ہے اس طرح پاس آ کر!
"دیکھو! وہ جا رہی ہے سلمیٰ نظر بچا کر شرما کے، مسکرا کر، آنچل سے منہ چھپا کر
جاؤ نا پیچھے پیچھے، دو باتیں کر لو جا کر!
کھیتوں میں چھپ چھپا کر
سلمیٰ سے دل لگا کر!

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!
گویا ہیں یوں حسد سے کچھ نازنیں نگاہیں،

سلمیٰ کی بھا گئی ہیں کیوں دل نشیں نگاہیں؟ ان سے زیادہ دلکش ہیں یہ حسیں نگاہیں"
الفقصہ ایک دل ہے، سو خشمگیں نگاہیں!
شوق آفریں نگاہیں!
سلمیٰ سے دل لگا کر!
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں
اک شوخ تازہ وارد سسرال سے گھر آکر
سکھیوں سے پوچھتی ہے جس دم مجھے بتا کر "یہ کون ہے" تو ظالم کہتی ہیں مسکرا کر
"تم اس کا حال پوچھو سلمیٰ کے دل سے جا کر
یہ گیت اُسے سنا کر"
سلمیٰ سے دل لگا کر!
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!

ایک تلخ اعتراف

کسی سے کبھی دل لگایا نہ تھا محبت کا صدمہ اُٹھایا نہ تھا
حسینوں کے رونے پہ ہنستے تھے ہم کبھی ایک آنسو بہایا نہ تھا
کوئی حور ہو یا پری اپنا سر کسی آستاں پر جھکایا نہ تھا
دکھاتے رہے نازنینوں کے دل کسی نے دل اپنا دکھایا نہ تھا
وہ دل تھا ہمارا کہ جس میں کبھی فرشتوں نے بھی بار پایا نہ تھا

سیہ گیسوؤں کو تمنّا رہی — مگر دل کو ہم نے پھنسایا نہ تھا
کوئی کیسا ہی ماہرو ہو مگر — ہماری نظر میں سمایا نہ تھا
زمانے میں وہ کون تھا زہرہ وش — کہ سینے سے جس نے لگایا نہ تھا
کوئی ہم سے کتنا ہی رُوٹھا مگر — کبھی بھول کر بھی منایا نہ تھا
حسینوں کے دل ہم نے چھینے سدا — مگر خود کبھی دل لگایا نہ تھا
کوئی نازنیں ہو کہ نازک بدن — کسی کا کبھی ناز اُٹھایا نہ تھا
ہمیشہ سُنے دوسروں کے گِلے — کسی کا گلہ لب پہ آیا نہ تھا
بسر کی سدا عیش و عشرت میں عمر — کبھی رنج ہم نے اُٹھایا نہ تھا
مئے عیش سے مست و بیخود رہے — مزہ تلخیٔ غم کا پایا نہ تھا
مگر اک فلک نے ہمیں کھو دیا — یہ صدمہ تو ہم نے اُٹھایا نہ تھا
کیا عشق کے درد میں مبتلا — "فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا

کہ جس کے عوض یوں رُلانے لگا"

ایک آرزو!

سارے سنسار پہ گھنگور گھٹا چھائی ہے — جس طرف دیکھئے اک تازہ بہار آئی ہے
اس قدر مست ہوا ہے کہ فلک سے گویا — باغِ فردوس کی خوشبوئیں چرا لائی ہے
فطرتِ کُہنہ گل افشاں ہے قبائے نَو میں — عالمِ پیر کو پھر دعوتِ برنائی ہے
دل مچلتا ہے فضاؤں سے لپٹنے کے لئے — موجزن آج کچھ اس طرح کی رعنائی ہے

مینہ برستا ہے کہ ساون کی پری جنت سے
آب کوثر کی کوئی نہر بہا لائی ہے
بیخودی کہتی ہے ہر ذرّے کے بوسے لیجے
کیسی ہر ذرّے پہ رنگینی ہے زیبائی ہے
خوشنما پھولوں سے لبریز ہے گلشن کہ ہوا
اپنے دامن میں کوئی خلد اٹھا لائی ہے
یہ تو سب کچھ ہے مگر اب بھی کسر ہے باقی
دل کسی اور کسی کا بھی تمنائی ہے
گلِ نظارہ سے تکمیل کی بُو آجائے!
اگر ایسے میں کسی سمت سے تُو آجائے!

ایک عزیز کی واپسی یورپ پر

مضطرب تھا ترا محبوبِ وطن تیرے لئے
خاک برسر تھا یہ شادابِ چمن تیرے لئے
چشمِ مینا سے لہو روتا تھا میخانۂ ہند
کتنا غمگین تھا، یہ دیرِ کہن تیرے لئے!
بمبئی تک ترے مشتاق چلے آئے ہیں!
تیرے دیرینہ رفیقانِ وطن تیرے لئے!
خیر مقدم کے لئے، شوق سے ہے چشم براہ
گلشنِ ہند کا ہر سرو و چمن تیرے لئے!
کلفتِ راہ مٹانے کو ہے ساغر در دست
منتظر میکدۂ گنگ و جمن تیرے لئے!

فرش کے بدلے بچھاتی ہے نسیمِ سحری
نکہتِ نسترن و بوئے سمن تیرے لئے!
اتنا بے خود ہے خوشی سے کہ بجز گردشِ جام
گردشیں بھول گیا چرخِ کہن تیرے لئے!
پھر وطن میں ہو مبارک ترا آنا تجھ کو
یوں دعا گو ہیں عزیزانِ وطن تیرے لئے!
رشکِ صد جنتِ رنگیں ترا مستقبل ہے
یوں ثنا خواں ہیں جوانانِ چمن تیرے لئے!
دلِ اختر سے نکلتی ہے یہ مستانہ دعا!
تو وطن کے لئے ہو اور وطن تیرے لئے!

ایک حسن فروشی

محبت آہ تیری یہ محبت رات بھر کی ہے!
تری رنگین خلوت کی لطافت رات بھر کی ہے!
ترے شاداب ہونٹوں کی عنایت رات بھر کی ہے!
ترے مستانہ بوسوں کی حلاوت رات بھر کی ہے!
مہِ روشن ہے تُو اور تیری طلعت رات بھر کی ہے!
گلِ خوشبو ہے تو اور تیری نکہت رات بھر کی ہے!

تو کیا جانے کہ سودائے محبت کس کو کہتے ہیں ؟
محبت اور محبت کی لطافت کس کو کہتے ہیں ؟
غمِ ہجراں ہے کیا اور سوزِ اُلفت کس کو کہتے ہیں؟
جنوں ہوتا ہے کیسا اور وحشت کس کو کہتے ہیں؟
تُو کیا جانے ، غمِ شب ہائے فرقت کس کو کہتے ہیں؟
ترے اظہارِ الفت کی فصاحت رات بھر کی ہے!
نگاہِ مست سے دل کو مرے تڑپا رہی ہے تُو!
ادائے شوق سے جذبات کو بھڑکا رہی ہے تُو!
مجھے بچّے کی صورت ناز سے پھُسلا رہی ہے تُو!
کھلونے دے کے بوسوں کے مجھے بہلا رہی ہے تُو!
مگر نادان ہے تُو! آہ دھوکا کھا رہی ہے تُو!
مجھے معلوم ہے تیری محبت رات بھر کی ہے!
ترا روئے درخشاں ہے مثالِ ماہتاب آسا!
ترے ہونٹوں کی شادابی ہے رنگت میں شراب آسا!
ترے رخسار کی مہتابیاں ہیں آفتاب آسا!
مگر ان کی حقیقت ہے حباب آسا، سراب آسا!
کہ غازے کی صباحت اس پہ چھائی ہے نقاب آسا!
اور اس غازے کی بھی جھوٹی صباحت رات بھر کی ہے!

یہ مانا تیری خلوت کی فضا، رُوحِ گلستاں ہے!
تری خلوت کا ہر فانوس اک مہتابِ لرزاں ہے!
ترا ابریشمی بستر نہیں اک خوابِ خنداں ہے!
ترا جسم آفتِ دل، تیرا سینہ آفتِ جاں ہے!
تو اک زندہ ستارہ ہے جو تنہائی میں تاباں ہے!
مگر کہتے ہیں تاروں کی حکومت رات بھر کی ہے!

لطافت سے ہیں خالی تیرے کملائے ہوئے بوسے!
طراوت سے ہیں خالی تیرے مرجھائے ہوئے بوسے!
نزاکت سے ہیں خالی تیرے گھبرائے ہوئے بوسے!
حقیقت سے ہیں خالی تیرے شرمائے ہوئے بوسے!
محبّت سے ہیں خالی تیرے گھبرائے ہوئے بوسے!
اور اِن بوسوں کی یہ جھوٹی حلاوت رات بھر کی ہے!

ترے زہریلے بوسے مجھ کو جس دم یاد آئیں گے!
مرے ہونٹوں پہ کالے ناگ بن کر تھرتھرائیں گے!
پشیمانی کے جذبے مجھ کو دیوانہ بنائیں گے!
مرے اذکار کو نفرت کے خنجر گدگدائیں گے!
مرے دل کی رگوں میں غم کے شعلے تیر جائیں گے!
میں سمجھا! آہ سمجھا! یہ مسرت رات بھر کی ہے!

مجھے دیوانہ کرنے کی مسرت، بے خبر کب تک؟
رہے گی میرے دل میں تیری الفت کارگر کب تک؟
مجھے مسحور رکھے گا یہ عشقِ بے ثمر کب تک؟
حقیقت کی سحر آخر نہ ہوگی پردہ در کب تک؟
مجھے مغلوب کر کے خوش ہے تو ظالم مگر کب تک؟
تری یہ فتح میری یہ ہزیمت رات بھر کی ہے!

آہ وہ راتیں!

جبینِ بندگی سے شوق کے سجدوں کی بارش ہے
اور ان کی بھولنے والی نگاہوں سے گذارش ہے
کہ وہ گذری ہوئی مستانہ راتیں یاد ہیں اب بھی
وہ راتیں، وہ ملاقاتیں، وہ باتیں یاد ہیں اب بھی
وہ راتیں، آہ! جن کی گود میں ہم چھپ کے ملتے تھے
وہ باتیں جن کے پردوں میں دلوں کے تار ہلتے تھے
وہ راتیں، آہ! جو سیراب تھیں جوئے محبت سے
وہ باتیں، آہ! جو شاداب تھیں بوئے محبت سے
وہ راتیں، جب محبت کے فسانے جاگ اٹھتے تھے
رباب دل کے خوابیدہ ترانے جاگ اٹھتے تھے

کتابِ عاشقی کے جب اُلٹتے تھے ورق ہم تم!
وہ راتیں، جن میں بے خوابی کے لیتے تھے سبق ہم تم!
سکوں سوتا تھا جب، بیتابیاں ہشیار ہوتی تھیں
وہ راتیں، جن میں دل کی دھڑکنیں بیدار ہوتی تھیں
سکون و صبر کھو دیتی تھیں جب تم، آہ وہ راتیں!
خیالِ غم سے رو دیتی تھیں جب تم، آہ وہ راتیں!
اگر تم کو یہ بھولی بسری باتیں یاد آجائیں!
اور آغازِ محبت کی وہ راتیں یاد آجائیں!
تو اُن راتوں کی رنگیں داستانی کی قسم تم کو!
اور اپنی پاک و دوشیزہ جوانی کی قسم تم کو!
جو اُن راتوں میں روشن تھے قسم ہے اُن ستاروں کی
جو اُن راتوں میں بکھرے تھے قسم ہے اُن نظاروں کی
محبت کی اُنہی معصوم راتوں کی قسم تم کو!
حقیقت کی اُنہی "موہوم" راتوں کی قسم تم کو!
قسم اُس پاک بازی کی، جو تھی باہم خیالوں میں!
قسم اُس بے نیازی کی جو تھی باہم سوالوں میں!
اُنہی بہکی ہوئی نیچی نگاہوں کی قسم تم کو!
اُنہی کھوئی ہوئی خاموش آہوں کی قسم تم کو!

قسم اُس چاک دامانی کی، جو مجبورِ وحشت تھی!
قسم اُس پاک دامانی کی، جو مغرورِ عفّت تھی!
قسم اُن آنسوؤں کی جو بہائے تھے کبھی تم نے!
وہ سیّارے جو آنکھوں سے گرائے تھے کبھی تم نے!

شروعِ عشق کی بے تابیوں کی ہے قسم تم کو!
زبانِ ہجر کی بے خوابیوں کی ہے قسم تم کو!
فقط اتنا بتا دو! کیا وہ باتیں پھر نہ آئیں گی؟
وہ راتیں! آہ وہ راتیں! وہ راتیں! پھر نہ آئیں گی؟

ایک شاعرہ کی شادی پر!

جس کو دعویٰ تھا کہ وہ دُنیا میں صرف شاعرانہ زندگی گذارنے آئی ہے

اے کہ تھا اُنس تجھے عشق کے افسانوں سے!
زندگانی تری آباد تھی رومانوں سے!
شعر کی گود میں پلتی تھی جوانی تیری!
تیرے شعر دل سے اُبلتی تھی جوانی تیری!

رشکِ فردوس تھا ہر حُسن بھرا خواب ترا!
ایک پامال کھلونا تھا یہ مہتاب ترا!

نکہتِ شعر سے مہکی ہوئی رہتی تھی سدا!
نشۂ فکر میں بہکی ہوئی رہتی تھی سدا!
شرکتِ غیر سے بیگانہ تھے نغمے تیرے!
عصمتِ حُور کا افسانہ تھے نغمے تیرے!
شعر کی خلوتِ رنگیں تھی پری خانہ ترا!
مست خوابوں کے جزیروں میں تھا کاشانہ ترا!
غائب از چشم تھی جنت کی بہاروں کی طرح!
دستِ انساں سے تھی محفوظ ستاروں کی طرح!
صحبتِ غیر سے گھبراتی تھی تنہائی تری!
آئینے سے بھی تو شرماتی تھی تنہائی تری!
صبح کی طرح سے دوشیزہ تھی ہستی تیری!
بُوئے گُل کی طرح پاکیزہ تھی ہستی تیری!
نغمہ و شعر کے فردوس میں تو رہتی تھی!
یکسر الہام و ترنم تھا جو تو کہتی تھی!
تیرے اشعار تھے، جنت کی بہاروں کے ہجوم
تیرے افکار تھے، زرّیں ستاروں کے ہجوم
دردِ شعری کے تاثر سے تو مغموم تھی تُو!
آسماں کا مگر اک غنچۂ معصوم تھی تُو!

موجِ کوثر کا چھلکتا ہوا پیمانہ تھی!
غیر ہونٹوں کے تصوّر سے بھی بیگانہ تھی!

اب گوارا ہوئی کیوں غیر کی صحبت تجھ کو؟
کیوں پسند آگئی نا جنس کی شرکت تجھ کو؟
اوجِ تقدیس کو پستی کی ادا بھا گئی کیوں؟
تیری تنہائی کی جنّت پہ خزاں چھا گئی کیوں؟

شعر و رومان کے وہ خواب کہاں ہیں تیرے؟
وہ نقوشِ گل و مہتاب کہاں ہیں تیرے؟
کون سی طُرفہ ادا بھا گئی اِس دُنیا میں؟
خلد کو چھوڑ کے کیوں آ گئی اِس دُنیا میں؟

ہو گئی عام تو نُورِ مہِ تاباں کی طرح!
آہ! کیوں جل نہ بجھی شمعِ شبستاں کی طرح!
اپنی دوشیزہ بہاروں کو نہ کھونا تھا کبھی!
وہ کلی تھی تو، جسے پھول نہ ہونا تھا کبھی!

عفّتیں مٹ کے، جوانی کو مٹا جاتی ہیں!
پھول کمھلاتے ہیں، کلیاں کہیں کمھلاتی ہیں!
بلبلِ مست نوا، دشت میں کیوں رہنے لگی؟

نغمۂ تر کی جگہ ، مرثیہ کیوں کہنے لگی ؟
ہوس آلودہ ہوئی پاک جوانی تیری !
غیر کی رات ہے اب ، اور کہانی تیری !
کس کو معلوم تھا تو اس قدر ارزاں ہوگی !
زینتِ محفل و پامالِ شبستاں ہوگی !
جذبِ عفّت کا میسّر تھا جو عرفاں تجھ کو !
کیوں نہ مرغوب ہوا شیوۂ جاناں[1] تجھ کو !
تیرگی ، حرص کی ، حوروں کو بھی بہکا ہی گئی !
تیرے بستر پہ بھی آخر کو شکن آ ہی گئی !
اب نہیں تجھ میں وہ حوروں کی سی عفّت باقی !
حُور تھی تجھ میں گئی ، رہ گئی عورت باقی !
ہاں وہ عورت جسے بچّوں کا فسانہ کہیئے !
بربطِ نفس کا اک مخش ترانہ کہیئے !
جس میں ہے زہرِ عفونت کا وہ پیمانہ کہیں !
اک گناہوں کا بھبھکتا ہوا مے خانہ کہیں !
سوگوار اپنی جواں موت کا ہونے دے مجھے
مُسکرا تو ، مگر اس حال پہ رونے دے مجھے !

---

[1] جاناں بیگم

دل کی ویرانی

نوحہ زارِ عبرت ہے شہرِ دل کی ویرانی
رُوح کی پریشانی
ظلمتِ تغافل میں گُم ہے شمعِ عرفانی
نُورِ فکرِ انسانی

شوق ہے عمارت کا کائنات میں اب بھی
شش جہات میں اب بھی
خندہ زن ہیں انجم، پر کا نہلے سلطانی
با ادائے سلطانی

بے چراغ، اب لیکن روح و دل کے ایواں ہیں
خستہ حال و ویراں ہیں
ظلمتوں میں خوابیدہ ہے دیارِ انسانی
جلوہ زارِ انسانی

اب بھی باغ و بستاں ہیں با نو بہار سے معمور

سبزہ زار سے معمور
شاخسار پر رقصاں ہے شمیم بستانی
نکہت گلستانی

پر بدل گئی حالت، بزم قلب انساں کی
نو بہارِ امکاں کی
بن گئی ہے مٹ مٹ کر یادگارِ ویرانی
داغ دارِ ویرانی

کوہسار ہیں اب بھی شاخسار سے آباد
برگ و بار سے آباد
دامنوں میں رقصاں ہیں آبشارِ نورانی
جوئبارِ نورانی

رُوح و دل میں ہیں لیکن سخت آفتیں برپا
ہاں قیامتیں برپا
ہو چکی ہے اب غارت، وہ فضائے رُوحانی
وہ صفائے رُوحانی

اَب بھی ساغرِ خورشید، نور کا نشیمن ہے
جلوہ زارِ ایمن ہے
اَب بھی ہے شعاعوں میں، اس کی شعلہ سامانی
رنگ و نور و تابانی

رُوح و دل سے ہیں لیکن، کل حرارتیں رخصت
وہ لطافتیں رخصت
رہ گئے ہیں سینوں میں قطرہ ہائے بارانی
پرتوِ یخستانی!

اب بھی ہوتی ہے زینتِ ہر مکان و ایواں کی
مسکن و شبستاں کی!
ذرّے ذرّے سے روشن ہے فروغِ نورانی
رونق و درخشانی

چھوڑ دی ہے انساں نے لیکن ایک مدت سے
اپنی جہل و غفلت سے
رُوح و دل کے ایواں کی نو بہار سامانی

انتشار سامانی!

سازِ دہر سے جاری حرص کے ترانے ہیں
فسق کے فسانے ہیں
مٹ گیا ہے ہستی سے ذوقِ پاک دامانی
نقشِ کیفِ روحانی

ہو رہی ہے انساں میں خوئے شیطنت پیدا
اک بہیمیت، بیدار
منظروں پہ عریاں ہیں پھر قوائے شیطانی
جذبہ ہائے حیوانی

برہمن سے رخصت ہیں، آج گیان کی باتیں
اور دھیان کی باتیں
شیخ میں نہیں باقی شیوۂ مسلمانی
پاسِ ذوق ایمانی

حرص و آز کی دُنیا بستی ہے خیالوں میں

پستی ہے خیالوں میں
بحرِ دل میں طوفاں زن، ہے ہوس کی طغیانی
فسق کی فراوانی

دل نہیں ہیں سینوں میں، عفتوں کے رہزن ہیں
عصمتوں کے مدفن ہیں
رُوح جسم میں ہے یا پیکرِ ہوس رانی
موجِ خونِ نفسانی

چھا رہے ہیں غفلت کے پردے چشمِ انساں پر
کُل فضائے امکاں پر
چند روزہ ہے مہماں، عہدِ عشرتِ فانی!
دورۂ تن آسانی

نوحہ زارِ عبرت ہے شہرِ دل کی ویرانی
رُوح کی پریشانی!
ظلمتِ تغافل میں، گُم ہے شمعِ عرفانی!
نورِ فکرِ انسانی!

عاشقانہ موت

عاشقانہ موت مرنا ہے تو چل، قندھار چل!
رنگ لایا ہے نیا پھر چرخِ کج رفتار چل!
پھر نظر آتے ہیں برپا، حشر کے آثار چل!
کعبۂ ملت پہ ہے پھر نرغۂ اشرار چل!
چھوڑ دے، ہاں چھوڑ دے، دُنیا کے کاروبار چل!
پھر اُٹھا لے ہاتھ میں شمشیرِ جوہردار چل!
عاشقانہ موت مرنا ہے تو چل، قندھار چل!

خونِ افغانی تری رگ رگ میں طوفاں خیز ہے!
جوشِ قومی تیرے دل میں ولولہ انگیز ہے!
جذبۂ غیرت ترے سینے میں آتش ریز ہے!
ترا تیغہ صاف و روشن، تیرا خنجر تیز ہے!
اور ترے توسن کی ہے برق آشنا رفتار چل!
عاشقانہ موت مرنا ہے تو چل قندھار چل!

موجزن ہے اک بہارِ بے خزاں قندھار میں!
چارسو ہے رحمتِ حق، گُل فشاں قندھار میں!
کوندتی ہیں قومیت کی بجلیاں قندھار میں!

جلوہ گستر ہیں امان اللہ خاں قندھار میں!
ہو رہا ہے جمع ہر سو لشکرِ احرار چل!
عاشقانہ موت مرنا ہے تو چل، قندھار چل!

کوئی دن میں انقلابِ آسماں ہونے کو ہے
لشکرِ قندھار پھر کابل رواں ہونے کو ہے
شاہ غازی کا ستارہ پھر جواں ہونے کو ہے
قومی غدّاروں کی ہستی بے نشاں ہونے کو ہے
جھلملاتے ہیں افق پر فتح کے انوار چل!
عاشقانہ موت مرنا ہے تو چل، قندھار چل!

سرفروشی کی ادائیں کر رہی ہیں تجھ کو یاد
ارضِ کابل کی فضائیں کر رہی ہیں تجھ کو یاد
باغِ ملت کی ہوائیں کر رہی ہیں تجھ کو یاد
اُٹھ بزرگوں کی صدائیں کر رہی ہیں تجھ کو یاد
موت کی وادی میں کر، اسلاف کا دیدار، چل!
عاشقانہ موت مرنا ہے تو چل، قندھار چل!

ضیغمِ اسلام امان اللہ غازی زندہ باد!
سایۂ اقبال او چوں آسماں پائندہ باد!
بر جبینش تا ابد نورِ ظفر تابندہ باد!

حاسد شس را نخلِ عمراز بیخ و بن بر کندہ باد!
گونجنے کو ہے فضا میں نعرۂ احرار چل!
عاشقانہ موت مرنا ہے تو چل، قندھار چل!

"یور ہائی نس!"

(ناتمام)

میں جب کمسن تھا اور تو اپنے سینے سے لگاتی تھی
تری ہنستی ہوئی نظروں سے مجھ کو شرم آتی تھی
مچلتا تھا میں تیری گود سے باہر نکلنے کو!
مگر تو اک ادائے مطمئن سے مسکراتی تھی
ترے وہ گیت، اب تک گونجتے ہیں میرے کانوں میں
جنہیں میرے لئے لکھتی تھی تو اور گنگناتی تھی
سمجھتا تھا بہت کم، مطلب ان گیتوں کا میں، لیکن
تری اس شوخیٔ گویا سے مجھ کو شرم آتی تھی
ترا وہ مخملی بستر، ابھی تک یاد ہے مجھ کو!
مجھے سردی کے ڈر سے جس میں تو اکثر سلاتی تھی

صبحِ بہار

وہ بستر، یاسمیں بستر، سراسر عنبریں بستر!
مہک سے جس کی حورانِ جناں کو نیند آتی تھی
میں سو جاتا تھا جب رنگیں دلائی اوڑھ کر تیری
تو اپنے مرمریں ہاتھوں سے مجھ کو گدگداتی تھی
وہ تیری خواب گہ کے نیلگوں ابریشمی پردے
سرِ شام آ کے نرگس جن کو چپکے سے گراتی تھی
دماغ اب تک معطّر ہے تری مستانہ خوشبو سے
ترے گجروں کی کلیوں کو بھی جو بے خود بناتی تھی
ترا مشکیں تنفّس بس رہا ہے اب بھی ہونٹوں میں
اثر سے جس کے اک لرزش سی دل میں تیر جاتی تھی!
تری رنگیں جوانی نقش ہے اب تک مرے دل پر
جو تیرے پھول سے پیکر کے اندر لہلہاتی تھی
تری وہ محفلیں آباد ہیں اب تک تصوّر میں
تو جن میں، اپنی گڑیا سے مری شادی رچاتی تھی
تری آنکھیں، وہ شوخ آنکھیں نہیں بھولیں ابھی مجھ کو
کہ جن میں اک رسیلی مسکراہٹ جھلملاتی تھی!
مگر اے شاہزادی، آج کچھ تجھ کو خبر بھی ہے!
کہ وہ کم سن جسے تو اپنے سینے سے لگاتی تھی

وہ شاعر ہے کہ دنیا میں کہانی اُس کی رُسوا ہے!
وہ رُسوا، اُس کا دل رُسوا، جوانی اُس کی رُسوا ہے!

آرزوئے یک جوانِ افغانی

تشجیع

من شیرِ نوجوانم و میدانم آرزواست
افغانم و شجاعتِ افغانم آرزواست

با ساقی و مغنّی و دلبر مرا چہ کار؟
تیغ و تفنگ و خنجرِ برّانم آرزواست

رُخ، سوئے ساغر و مے و مینا نیاورم
تیر و سنان و خنجر و پیکانم آرزواست

با سفلہ ہم نبرد شوم، عار آیدم
جنگ ہزار رستم و دستانم آرزواست

اے آنکہ سر بہ کنجِ سلامت نہادہ ای
با من میا کہ شیرِ نیستانم آرزواست

اے آنکہ، زخمِ تیغِ حریفاں نہ خوردہ ای
نوکِ سناں بخونِ رگِ جانم آرزواست

آزادیٔ وطن کہ با ایماں برابر است
ایمانِ من ہمیں، فقط ایمانم آرزواست

ناموس و ملک و قوم بہ قرآں برابر است
قرآں گواہ، حرمتِ قرآنم آرزواست

اہرمنان سفلہ ز دستم کجا روند؟
ہاں، ہمتے، کہ ملکِ سلیمانم آرزواست

اختر بگیر تیغ و دلیرانہ باز گو!
من شیرِ نوجوانم و میدانم آرزواست!

پشیمانِ آرزو!

علاجِ دردِ دلِ بے قرار کر لیتے
تلافیٔ غمِ لیل و نہار کر لیتے
ستم شعار کو جی بھر کے پیار کر لیتے

فسانۂ غمِ فرقت اُنہیں سناتے ہم
جو ہم پہ گزری ہے حالت اُنہیں دکھاتے ہم
اور اپنے ساتھ انہیں اشکبار کر لیتے

یہ کہتے "چاک گریباں کو دیکھیے تو سہی
ہمارے حالِ پریشاں کو دیکھئے تو سہی!"
اور اِس بہانے انہیں ہم کنار کر لیتے

بھلا ہو چرخِ ستم گار نے نہ دی مہلت
ہمارے بختِ جفا کار نے نہ دی مہلت
کہ ان کے قدموں پہ ہم جاں نثار کر لیتے

امیدِ وصل کبھی کامیاب ہو نہ سکی!
دعائے نیم شبی مستجاب ہو نہ سکی!
کہ دردِ دل سے انہیں بیقرار کر لیتے

الٰہی! موت کے کیا کیا مزے نہ لیتے ہم

کسی کے زانو پہ سر رکھ کے جان دیتے ہم
اور اپنے غم میں اُنہیں سوگوار کر لیتے
گر اُن کے "وعدے" کا کچھ بھی ہمیں یقیں ہوتا
تو دل میں درد، زباں پر گلہ نہیں ہوتا
غمِ فراق کو بھی خوشگوار کر لیتے
دلِ حزیں کو ہمیشہ یہ آرزو ہی رہی
نگاہِ شوق کو ہر دم یہ جستجو ہی رہی
پرستشِ رُخِ رنگیں بہار کر لیتے
گر ابتدائے محبّت میں موت آ جاتی!
سکونِ خوابِ عدم کا مزہ چکھا جاتی!
تو زندگی کو نہ یوں ناگوار کر لیتے
ستم ہے اُس بُتِ زہرہ جبیں کو کھو بیٹھے
اور اپنی زیست سے ہم نا امید ہو بیٹھے
اُسی پہ کاش ہم اُس کو نثار کر لیتے
"نشے" میں قطبِ شمالی کے پار اتر جاتے
طلسمِ ماہ و ثُریّا سے بھی گزر جاتے
گر ایک بار بھی ہم اُن کو پیار کر لیتے
حبابِ عالمِ فانی کو پھوڑ دیتے ہم

حصارِ چرخِ بریں کو بھی توڑ دیتے ہم
اگر کبھی ہم اُنہیں ہمکنار کر لیتے

خدائی بھر میں کسی شے کی جستجو نہ رہی
سوائے اس کے کچھ اخترؔ کی آرزو نہ رہی
"ستم شعار" کو جی بھر کے پیار کر لیتے

فتحِ کابل

(ترانہ)

ساقی درود دے! — بر جام و ساغر!
مطرب سرود دے — بالحنِ خوش تر!
آمد نو بہارے! — چوں گُل معطر!
از فضلِ حق شد — نادر مظفر!
وز تیغِ او گشت — کابل مسخر!
اللہ اکبر! — اللہ اکبر!

یک چند کابل — در قبضِ ستم شُد!
افغانیاں را — دل صرفِ غم شُد!

ہر قلبِ حساس!   صدبہ الم شد!
دامروز آخر!   دل شاد ہم شد!
بر فتحِ نادر!   شیرِ دلاور!
اللہ اکبر!   اللہ اکبر!

یک چند ملت!   مدہوش گشتہ!
در قعرِ ذلت!   روپوش گشتہ!
با شیرِ قالیں!   ہمدوش گشتہ!
بر جورِ سقا!   خاموش گشتہ!
بر داشت آخر   تیغِ دو پیکر!
اللہ اکبر!   اللہ اکبر!

شیرانِ افغاں!   خوابیدہ بودند
دلہائے ملت!   ترکیدہ بودند!
بر خاکِ پستی!   لغزیدہ بودند!
در قعرِ ظلمت   رنجیدہ بودند!
آخر عیاں شد!   صبحِ منور!
اللہ اکبر!   اللہ اکبر!

از غیب آمد! یک مردِ سنگی!
افرشتہ پیکر! با رُوحِ جنگی!
از سطوتِ او! دل چاک رنگی!
وز ہیبتِ او! لرزاں فرنگی!
ضرغامِ پُر دل! شیرِ دلاور!
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

بالا بلندے رو ئیں قبائے!
دارا شکوہے! خسرو ادائے
تیمور تمثال! رستم نمائے
نادر مثیلے! نادر لقائے
شمشیر درکف! صمصام دربر
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

از خاکِ مغرب آمد چو طوفاں!
با چشمِ پُر خوں! با جانِ جوشاں!
در عشقِ ملت! دل چاک و بریاں!
در کف نمایاں! شمشیرِ عریاں!

گوئی درخشاں! صمصامِ داور!
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

غمخوارِ ملّت! او را چو دیدند!
شیرانِ افغاں! از جا جہیدند!
چوں رعد باراں! یک یک رسیدند!
تیغ از نیام! روئیں کشیدند!
تیغے! چہ تیغے! یک برق مضطر!
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

با فوجِ احرار! نادر بروں شد!
قوم و وطن را! او رہنموں شد!
دل ہائے اعداء! در سینہ خوں شد!
افواجِ سقا! زار و زبوں شد!
وز دستِ او شد! کابل مسخر!
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

تختِ امانی! آباد بادا!!

شمشیرِ نادر! آزاد بادا!!
شاہ ولی خاں دلشاد بادا!
اعدائے محمود! برباد بادا!!
کز تیغِ شاں گشت مِلّت مظفر!
اللہ اکبر! اللہ اکبر!

اخترستان

اخترؔ شیرانی کے کلام کا دوسرا مجموعہ

چہرہ نما!

ہر نظمِ گوہریں کہ بیادِ تو گفتہ ام
دل رخنہ کردہ و جگرِ خویش سُفتہ ام

(ملک الشعرا فیضی)

نذر!

"ع"

زلف آشفتہ خوئے کردہ و خندان لب و مست
پیرہن چاک و غزلخوان و صراحی در دست
نرگسش عربدہ جوی و لبش افسوس کناں!
نیم شب ، مست، ببالین من آمد بنشست
سر فرا گوشِ من آورد بآوازِ حزیں!
گفت کائے عاشقِ شوریدۂ من خوابت ہست!
عاشقے را کہ چنیں بادۂ شبگیر دہند!
کافرِ عشق بود گر نبود بادہ پرست!
"خیز و یک جام دگر گیر کہ باید نوشید"!
اگر از خمِ بہشت است و راز بادۂ مست!
خندۂ جام مے و زلفِ گرہ گیر نگار!
اے بسا توبہ کہ چوں توبۂ حافظ بشکست!

تمہیدِ آغاز

"باز بر آنم کہ نیاز آورم   رُخ بہ تماشا گہِ ناز آورم"

پھر قلم بے تاب ہے موتی لٹانے کے لئے
کہکشاں جھکنے لگی دامن بڑھانے کے لئے

پھر صلائے عام دی پیرِ مغانِ عشق نے
بادہ نوشانِ تخیّل کو جگانے کے لئے

زہرہ پھر بربط بکف، جوِّ ہوا میں آگئی
کارگاہِ خاک پر نغمے لٹانے کے لئے

شمعِ دل کرتا ہوں روشن رہ گزارِ عشق پر
سوز و سازِ غم کی ہمّت آزمانے کے لئے

شوق نے بخشا ہے پھر بے رنگیوں کو آب و رنگ
قطرہ ہے آمادہ پھر دریا بہانے کے لئے

دل میں ذوقِ آرزو پھر چٹکیاں لینے لگا!
حُسن کی نازک دلی کو گدگدانے کے لئے

پھر جبیں میں بال زن ہے موجِ بیتابیٔ عشق
آستانِ حُسن پر سجدے لٹانے کے لئے

گرچہ دُنیائے صحافت سے طبیعت سیر تھی
دل تھا مضطر، اک نئی دُنیا بسانے کے لئے

جس میں افکارِ زمانہ ہوں نہ افکارِ حیات
طبعِ رنگیں کی لطافت کو لٹانے کے لئے

جس میں بد ذوقی کے صدمے ہوں نہ کج فہمی کا خوف
رُوح و دل کی خلوتوں میں بار پانے کے لئے

لیکن اہلِ دل کی بزم آرائیوں کو کیا کروں
چاہیئے ہنگامہ جن کا دل لبھانے کے لئے

یہ وہ بازارِ زیاں در بر ہے جس کو ہم نشیں
جنس کا سد چاہیئے رونق بڑھانے کے لئے

رنگِ دورِ رونگارِ سفلہ پرور دیکھئے
شاعری ہے اک بہانہ نان کھانے کے لئے

آہ! وہ احساسِ شیریں، نام ہے جس کا ادب
اک تجارت رہ گیا ہے اب نہ ملنے کے لئے

وہ گدازِ رُوح، دُنیا شعر کہتی تھی جسے!
لحن سائل بن گیا دولت کمانے کے لئے

جذبۂ دل اک کھلونا بن چلا بازار کا!
سادہ لوحوں کی مسرّت کو بڑھانے کے لئے

آہ! وہ حکمت کہ تھی کنجِ ہزار انسانیّت

دستِ مسکیں بن گئی جیبیں ہلانے کے لئے

خوابِ طفلاں کے جمالِ بے نیازی کی قسم!

یہ چمن موزوں نہ تھا میرے ترانے کے لئے

میں کہاں، اخترؔ متاعِ عالمِ فانی کہاں!

طائرِ سدرہ نہیں تنکے اٹھانے کے لئے

میرے ذوقِ بیخودی کو دو جہاں ہیں نیم گام

وہ بھی رُتبہ ان کی وسعت کا بڑھانے کے لئے

میں وہ مے کش ہوں کہ گلزارِ جہاں سے صبح و شام

حُوریں آتی ہیں مجھے کوثر پلانے کے لئے

میں وہ مجنوںؔ ہوں کہ گر سیرِ جنوں منظور ہو

دشت میں آجائے لیلیٰؔ خاک اُڑانے کے لئے

میں ہوں وہ وامقؔ کہ ذوقِ بندگی ہو گر قبول!

میرے در پر آئے عذراؔ سر جھکانے کے لئے

میں وہ خسروؔ ہوں کہ گر چاہوں ثبوتِ عاشقی!

مضطرب شیریںؔ ہو جُوئے شیر لانے کے لئے

میں وہ یوسفؔ ہوں کہ ہو گر جستجوئے مُشتری

آئے خود حُسنِ ازل قیمت لگانے کے لئے

خاک و خاکسترنشینی گر مجھے منظور ہو!
جنّتیں لے آئیں پھول اپنے بچھانے کے لئے
میرے سینے میں ہیں وہ احساس کے شعلے نہاں
مہر و مہ ہیں مضطرب جن میں نہانے کے لئے
دل میں اُس وجدان کے کعبے ہیں رقصاں اے ندیم
جن میں آتے ہیں فرشتے سر جھکانے کے لئے
اک نگاہِ پُرتبسّم، قیمتِ ہر دو جہاں
وہ بھی گر نورِ ازل آئے لُبھانے کے لئے
دل کے کاشانے میں ہیں فانوس، اشکِ سُرخ کے
آرزو، شعلہ ہے شمعِ غم جلانے کے لئے
الغرض جس دل کا گہوارہ ہو خود عرشِ بریں
وہ کھلونا بن نہیں سکتا زمانے کے لئے
اضطرابِ شوق، لیکن جنّتِ تسکیں ہے
موت آتی ہے جہاں سجدے لُٹانے کے لئے
شعلۂ دل، بوئے دل سے ہے طرب انگیز تر
نُور برساتا ہوں جنّت کو جلانے کے لئے
عشق کی، دل میں خلش ہو، گو جہنّم بن کے ہو
خُلد کو چاہیں گے کیا قبریں بسانے کے لئے

اک حقارت کی ادا ہے، نذرِ مرگِ زندگی
آئے کوئی بے نیازی کو مٹانے کے لئے

وہمِ آبادِ عدم ہے، خوابِ طفلاں سے مراد
موت، اک آئینہ، حیرت کو جگانے کے لئے

شورشِ آبادِ جہاں، بازیچۂ طفلانہ ہے
زندگی خوابِ پریشاں بھول جانے کے لئے

موت ہے اک انتظار اور انتظارِ دائمی
کس قدر معصوم دھوکا جی لبھانے کے لئے

یہ نظامِ زندگی ہے نقشِ احساسِ خودی
ذرّہ ذرّہ مضطرب ہے سر اٹھانے کے لئے

نوبہار آمد" نوائے بلبلاں مستانہ است"
"وقتِ جام" است اے عزیزاں نوبتِ پیمانہ است"

رُباعی

موسم بھی ہے، عمر بھی، شباب بھی ہے
پہلو میں وہ رشکِ ماہتاب بھی ہے!
دُنیا میں اب اور چاہیئے کیا مجھ کو!
ساقی بھی ہے ساز بھی، شراب بھی ہے!

خطابۂ ارادت

ارمغان بہ پیشگاہ جانِ پاک و روح اقدس تابناک استادِ یگانہ و سخن گوئے فرزانہ حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی اعلی اللہ مقامہ

این قصیدہ در موقع جشنِ "یادگار ہزار سالہ فردوسی" کلکتہ بتاریخ ۲۵ نومبر مسیحی سنہ ۱۹۳۴ع سرودہ شد

ایا شاعرِ پاکِ ایران زمین — زما بر تو بادہ ہزار آفرین

سخن آفرین تا سخن آفریدہ — سخن گوئے چون تو نیامد پدید

سرود تو افسانۂ باستان — زیاکانِ ایران و از راستان

چہا نقش انگیختہ خامہ ات — کہ از رنگِ معنی است شہنامہ ات

ز ظلمت باندیشۂ ہمت رسید — ز فکرِ تو نیر و بہ نکرۃ رسید

ازان تخمِ دانش کہ بر کاشتی — سخن را علم برتر افراشتی

تو خود گفتہ ای "من درین سال سی — عجم زندہ کردم بدین پارسی"

"بناہائے آباد گردد خراب
زباران و از تابشِ آفتاب"

"بنا کردم از نظم کاخے بلند
کہ از باد و باران نیابد گزند"

"ز خورشید و از آب و زباد و خاک

نہ گردد تبہ نام و گفتارِ پاک"

یکے خیز و بنگر کہ ملکِ عجم! | شد آراستہ باز چون عصرِ جم!
زمانہ پذیرفت رسمِ نوی | بہ دورِ شہِ فرخِ پہلوی
رضا شاہ، آں شاہِ پاکیزہ دین | کہ نازد بہ او تخت و تاج و نگین
ز گفتارِ خوبت بآوائے رود | بہ آور بہ ازان خسروانی سرود
"ہمانا ز محمود شاہِ بزرگ
بہ آبشخور آرد ہمے میش و گرگ
چو کودک لب از شیرِ مادر بشست
بگہوارہ محمود گوید نخست"
ہمان شیرِ ایران کہ در خواب بود | پس از سالہا چشمِ غفلت کشود
دگر زندہ شد روحِ ایرانیان | فرہ مند شد عہدِ ساسانیان
پس از دورہ سالہائے دراز | عروسِ عجم شد بہارین طراز
طرب گاہ خسرو کہ ان تاکیان | شد آباد چون باغِ نوشیروان
بہارِ نوین را سرودے بگو
خزانِ کہن را درودے بگو

سخن پروراں ہیچ خوانِ تو ایم! | تو ئی شاہ و ما بندگانِ تو ایم!

نہ ایراں فقط والۂ نامِ تو ! صنم خانۂ ہند ہم رامِ تو!
حقوقِ ارادت ادا کردہ ایم ! بکلکتہ جشنے بپا کردہ ایم !
تو اے مہمانِ حریمِ ارم ! زما سجدۂ شوق بپذیر ہم!
بیادِ تو دل می چکاند سجود
بخاکِ تو از ما ہزاراں درود

او دیس سے آنے والے بتا !

ایک نو وارد ہم وطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا! کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن وہ سروِ وطن ، ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں ؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پہ گھنگور گھٹائیں چھاتی ہیں ؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں ؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں؟
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے، کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی شفق کے سایوں میں دن رات کے دامن ملتے ہیں؟
کیا اب بھی چمن میں ویسے ہی! خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں؟
برساتی ہوا کی لہروں سے بھیگے ہوئے پودے ہلتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
شاداب شگفتہ پھولوں سے معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں؟
بازار میں مالن لاتی ہے پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں؟
اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں نوعمر خریدار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شام پڑے گلیوں میں وہی دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے؟
اور سڑکوں کی دھندلی شمعوں پہ سایوں کا بسیرا ہوتا ہے؟
باغوں کی گھنیری شاخوں میں! جس طرح سویرا ہوتا ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں ویسی ہی جواں اور مدھ بھری راتیں ہوتی ہیں؟
کیا رات بھر اب بھی گیتوں کی! اور پیار کی باتیں ہوتی ہیں؟
وہ حُسن کے جادو چلتے ہیں وہ عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

ویرانیوں کے آغوش میں ہے آباد وہ بازار اب کہ نہیں؟
تلواریں بغل میں دابے ہوئے پھرتے ہیں طرحدار اب کہ نہیں؟
اور بہلیوں میں سے جھانکتے ہیں ترکانِ سیہ کار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی مہکتے مندر سے — ناقوس کی آواز آتی ہے؟
کیا اب بھی مقدّس مسجد پر! — مستانہ اذاں تھرّاتی ہے؟
اور شام کے رنگیں سایوں پر — عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر — پنہاریاں پانی بھرتی ہیں؟
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر — سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں؟
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے — ہنستی ہوئی چُہلیں کرتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
برسات کے موسم اب بھی وہاں — ویسے ہی سُہانے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں — جُھولے اور گانے ہوتے ہیں؟
اور دُور کہیں کچھ دیکھتے ہی — نوعمر دیوانے ہوتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی پہاڑی چوٹیوں پر برسات کے بادل پھلتے ہیں؟
کیا اب بھی ہوائے ساحل کے وہ رس بھرے جھونکے آتے ہیں؟
اور سب سے اونچی ٹیکری پر لوگ اب بھی ترانے گاتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی پہاڑی گھاٹیوں میں گھنگور گھٹائیں گونجتی ہیں؟
ساحل کے گھنیرے پیڑوں میں! برکھا کی ہوائیں گونجتی ہیں؟
جھینگر کے ترانے جاگتے ہیں موروں کی صدائیں گونجتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی وہاں میلوں میں وہی برسات کا جوبن ہوتا ہے؟
پھیلے ہوئے بڑ کی شاخوں میں جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے؟
امڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں چھایا ہوا ساون ہوتا ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا شہر کے گرداب بھی ہیں رواں دریائے حسیں لہرائے ہوئے؟
جوں گود میں اپنے من کو لئے ناگن ہو کوئی تھرائے ہوئے؟
یا نور کی ہنسلی، حور کی گردن میں ہو عیاں بل کھائے ہوئے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی فضا کے دامن میں برکھا کے سمے لہراتے ہیں؟
کیا اب بھی کنارِ دریا پر طوفان کے جھونکے آتے ہیں؟
کیا اب بھی اندھیری راتوں میں ملّاح ترانے گاتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی وہاں برسات کے دن باغوں میں بہاریں آتی ہیں؟
معصوم و حسیں دوشیزائیں برکھا کے ترانے گاتی ہیں؟
اور تیتریوں کی طرح سے رنگیں، جھولوں پہ لہراتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی اُفق کے سینے پر — شاداب گھٹائیں جھومتی ہیں؟
دریا کے کنارے باغوں میں — مستانہ ہوائیں جھومتی ہیں؟
اور اُن کے نشیلے جھونکوں سے — خاموش فضائیں جھومتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں — احباب، کنارِ دریا پر؟
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں — شاداب، کنارِ دریا پر؟
اور پیار سے آ کر جھانکتا ہے — مہتاب، کنارِ دریا پر؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا آم کے اُونچے پیڑوں پر — اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں؟
شاخوں کے حریری پردوں میں — نغموں کے خزانے کھولتے ہیں؟
ساون کے رسیلے گیتوں سے — تالاب میں امرس گھولتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی — وہ مدرسے کی شاداب فضا؟
کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں — جس میں، وہ مثالِ خواب فضا؟
وہ کھیل، وہ ہمسن، وہ میداں — وہ خواب گہِ مہتاب فضا؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی کسی کے سینے میں — باقی ہے ہماری چاہ بتا؟
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب — یاروں میں کوئی آہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا — للہ بتا، للہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا ہم کو وطن کے باغوں کی — مستانہ فضائیں بھول گئیں؟
برکھا کی بہاریں بھول گئیں — ساون کی گھٹائیں بھول گئیں؟
دریا کے کنارے بھول گئے — جنگل کی ہوائیں بھول گئیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا گاؤں ہیں اب بھی ویسی ہی مستی بھری راتیں آتی ہیں؟
دیہات کی کم سن ماہوشیں تالاب کی جانب جاتی ہیں؟
اور چاند کی سادہ روشنی میں رنگین ترانے گاتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی گجر دم چرواہے ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں؟
اور شام کے دھندلے سایوں کے ہمراہ گھروں کو آتے ہیں؟
اور اپنی رسیلی بانسریوں میں عشق کے نغمے گاتے ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا گاؤں پہ اب بھی ساون میں برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں؟
معصوم گھروں سے بھور بھئے چکّی کی صدائیں آتی ہیں؟
اور یاد میں اپنے میکے کی بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
دریا کا وہ خواب آلودہ سا گھاٹ — اور اُس کی فضائیں کیسی ہیں؟
وہ گاؤں وہ منظر، وہ تالاب — اور اُس کی ہوائیں کیسی ہیں؟
وہ کھیت، وہ جنگل، وہ چڑیاں — اور اُن کی صدائیں کیسی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
کیا اب بھی پرانے کھنڈروں پر — تاریخ کی عبرت طاری ہے؟
اَن پورنا کے اُجڑے مندر پر — مایوسی و حسرت طاری ہے؟
سنسان گھروں پر چھاؤنی کے — ویرانی و رقت طاری ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!
آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا — وہ غارتِ ایماں کیسی ہے؟
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی — وہ آفتِ دوراں کیسی ہے؟
ہم دونوں تھے جس کے پروانے — وہ شمعِ شبستاں کیسی ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

مر جانا تھا جس کا نام بتا — وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے؟

جس پہ تھے فدا طفلانِ وطن — وہ جانِ وطن کس حال میں ہے؟

وہ سروِ چمن، وہ رشکِ سمن — وہ سیم بدن کس حال میں ہے؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی رُخِ گلرنگ پہ — وہ جنت کے نظارے روشن ہیں؟

کیا اب بھی رسیلی آنکھوں میں — ساون کے ستارے روشن ہیں؟

اور اس کے گلابی ہونٹوں پر — بجلی کے شرارے روشن ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی شہابی عارض پر — گیسوئے سیہ بل کھاتے ہیں؟

یا بحرِ شفق کی موجوں پر — دو ناگ پڑے لہراتے ہیں؟

اور جن کی جھلک سے ساون کی — راتوں کے سے سپنے آتے ہیں؟

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

اب نام خدا، ہو گی وہ جواں — میکے میں ہے یا سسرال گئی؟
دوشیزہ ہے یا آفت میں — اُسے کم بخت جوانی ڈال گئی؟
گھر پر ہی رہی یا گھر سے گئی — خوشحال رہی، خوشحال گئی؟

او دیس سے آنے والے بتا!

گذری ہوئی راتیں

نہ بھولے گا ترا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا — رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا
رُخِ روشن کے جلوؤں سے سحر کا نور بن بن کر — اندھیری رات کے پردوں کو سرکاتے ہوئے آنا
روپہلی چاندنی میں اپنی مستانہ خرامی سے — بہارِ خواب کے سائے سے برساتے ہوئے آنا
محبت کے فرشتے کی طرح خاموش راتوں میں — فضا کو نکہتِ گیسو سے مہکاتے ہوئے آنا
ترے پازیب کی جھنکار کا آہستہ آہستہ — وہ دھیمی دھیمی لے میں گیت برساتے ہوئے آنا
ترے ابریشمی ملبوس کا صرصر کے جھونکوں سے — سحابِ نگہت و بو کی طرح لہراتے ہوئے آنا
بدن اپنا چرا لینا، کبھی نظریں جھکا لینا — ہم آغوشی کے اندیشے سے گھبراتے ہوئے آنا
شبِ تاریک کے خاموش نظاروں کی بستی کو — شرابِ نور کی موجوں سے نہلاتے ہوئے آنا
نگاہوں میں حیا، آنکھوں میں مستی، چال میں لغزش — مصور کے قلم کے خواب برساتے ہوئے آنا
ہواؤں کا مہک اُٹھنا، فضاؤں کا بہک اُٹھنا — وہ مہکاتے ہوئے آنا، وہ بہکاتے ہوئے آنا
محل کے پاسباں خوابیدہ، شمعیں خواب دیدہ — اور اے ملک ترے سائے کا شرماتے ہوئے آنا

جہاں ریحانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی!
کنول کا پھول تھی، سنسار سے بیگانہ رہتی تھی!
نظر سے دُور، مثلِ نکہتِ مستانہ رہتی تھی!

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

انہی صحراؤں میں وہ اپنے گلّے کو چراتی تھی
انہی چشموں پہ وہ ہر روز مُنہ دھونے کو آتی تھی
انہی ٹیلوں کے دامن میں وہ آزادانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

کھجوروں کے تلے، وہ جو کھنڈر سے جھلملاتے ہیں
یہ سب ریحانہ کے معصوم افسانے سُناتے ہیں
وہ ان کھنڈروں میں اک دن صورتِ افسانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

مرے ہمدم، یہ نخلستاں، اک دن، اُس کا مسکن تھا
اسی کے خرمئی آغوش میں اس کا نشیمن تھا
اسی شاداب وادی میں وہ بے باکانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

یہ پھولوں کی حسیں آبادیاں، کاشانہ تھیں اُس کا
وہ اک بُت تھی یہ ساری وادیاں بتخانہ تھیں اُس کا
وہ اس فردوس وجد و رقص میں مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

تباہی کی ہوا اس خاکِ رنگیں تک نہ آئی تھی
یہ وہ خطّہ تھا، جس میں نوبہاروں کی خدائی تھی
وہ اس خطّے میں مثلِ سبزۂ بیگانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

اسی ویرانہ میں اک دن بہشتیں لہلہاتی تھیں
گھٹائیں گھِر کے آتی تھیں، ہوائیں مسکراتی تھیں
کہ وہ بن کر بہارِ جنّتِ ویرانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

یہ ویرانہ، گزر، جس میں نہیں ہے کاروانوں کا
جہاں ملتا نہیں نام و نشاں تک ساربانوں کا
اسی ویرانے میں اک دن، مری ریحانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

یہیں آباد تھی اک دن، مرے افکار کی ملکہ

مرے جذبات کی دیوی، مرے اشعار کی ملکہ
وہ ملکہ، جو برنگِ عظمتِ شاہانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

صبا، شاخوں میں نخلستاں کی، جس دم سرسراتی ہے
مجھے ہر لہر سے ریحانہ کی آواز آتی ہے
یہیں ریحانہ رہتی ہے، یہیں ریحانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

فضائیں گونجتی ہیں اب بھی اُن وحشی ترانوں سے
سنو، آواز سی آتی ہے اُن خاکی چٹانوں سے
کہ جن میں وہ برنگِ نغمۂ بیگانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

مرے ہمدم، جنونِ شوق کا اظہار کرنے دے
مجھے اس دشت کی اک اک کلی سے پیار کرنے دے
جہاں اک دن، وہ مثلِ غنچۂ مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی!

بربِّ کعبہ، اُس کی یاد میں عمریں گنوا دوں گا
میں اس وادی کے ذرّے ذرّے پر سجدے بچھا دوں گا
جہاں وہ جانِ کعبہ، عظمتِ بت خانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

وہ اس ٹیلے پر اکثر عاشقانہ گیت گاتی تھی!
پرانے سورماؤں کے فسانے گنگناتی تھی!
یہیں پر، منتظر میری وہ بے تابانہ رہتی تھی!
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی!

کھجوروں کے حسیں سائے زمیں پر لہلہاتے تھے
ستارے جگمگاتے تھے، شگوفے کھل کھلاتے تھے
فضا میں منتشر اک نکہتِ مستانہ رہتی تھی!
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی!

یہیں بستی تھی اے ہمدم مرے رومان کی بستی!
مرے افسانوں کی دنیا، مرے وجدان کی بستی!
یہیں ریحانہ بستی تھی، یہیں ریحانہ بستی تھی!
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

شمیمِ زلف سے اس کی، مہک جاتی تھی کُل وادی
نگاہِ مست سے اس کی، بہک جاتی تھی کُل وادی
ہوا میں پرفشاں، روحِ مے و میخانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

وہ گیسوئے پریشاں، یا گھٹائیں رقص کرتی تھیں

فضائیں وجد کرتی تھیں، ہوائیں رقص کرتی تھیں
وہ اس فردوسِ وجد و رقص میں مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

گدازِ عشق سے لبریز تھا، قلبِ حزیں اُس کا
مگر آئینہ دارِ شرم تھا، روئے حسیں اُس کا
خموشی میں چھپائے نغمۂ مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

اُسے پھولوں نے میری یاد میں بے تاب دیکھا ہے
ستاروں کی نظر نے، رات بھر بے خواب دیکھا ہے
وہ شمعِ حسن تھی، پر صورتِ پروانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

یہیں ہم رنگِ گلہائے حسیں، رہتی تھی ریحانہ
مثالِ حورِ فردوسِ بریں، رہتی تھی ریحانہ
یہیں ریحانہ رہتی تھی، یہیں رہتی تھی ریحانہ

یہی وادی ہے وہ ہمدم، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

پیامِ دردِ دل، اختؔر دیئے جاتا ہوں وادی کو
سلامِ رخصتِ غمگیں، کیئے جاتا ہوں وادی کو

سلام اے وادیٔ ویراں، جہاں ریحانہ رہتی تھی!

ایک حادثہ

(چند لمحے عذرا کے ساتھ)

کوئی مہ جبیں جلوہ دکھلا گئی
مرے گھر پہ شامِ بہار آگئی

تصور کی نیرنگیاں کیا کہوں
جدھر دیکھئے پھول برسا گئی

مہکتا ہے اب تک شبستاں مرا
فضا میں بہاریں سی پھیلا گئی

نگاہوں میں موتی بکھرنے لگے
خیالوں میں تارے سے برسا گئی

تخیل میں بجلی نے انگڑائی لی
تصور میں ناہید لہرا گئی

فضاؤں کو جلوؤں سے روشن کیا
ہواؤں کو خوشبو سے مہکا گئی

سیہ پیرہن پر ستاروں کا رنگ
کہ تاروں بھری رات شرما گئی

تصور میں اب تک مچلتے ہیں طور
یہ کس کی تجلی نظر آگئی

ہوا، بوئے رنگیں سے بیخود ہوئی
گھٹا، زلفِ مشکیں سے شرما گئی

اداؤں سے فتنے برستے رہے
نگاہوں سے میخانے چھلکا گئی

بڑھی جیسے صبحِ بنارس بڑھے
اٹھی، جیسے شامِ اودھ چھا گئی

وہ آنکھیں کہ رقصانِ شب میکدہ
وہ نظریں کہ بجلی سی لہرا گئی

شبستاں میں آئی کچھ اس ناز سے
کہ جیسے چمن میں بہار آگئی

وہ ابریشمیں بال، کرنوں کے ہار
وہ چوٹی کہ ناگن سی بل کھا گئی

بدن، جیسے کلیوں کا معصوم خواب — کمر، یا کوئی شاخ لہرا گئی

گھٹاؤں نے دیکھیں نہ وہ بجلیاں — جو نیچی نگاہوں سے دکھلا گئی

وہ شیریں تکلّم، وہ رنگیں صدا — بہشتوں کی موسیقی شرما گئی

سُنائی غزل اس نے اس ناز سے — کہ خود شعر کی دیوی لہرا گئی

سماعت کو بلبل کا دھوکا ہوا — کہ ناہید بربط بکف آ گئی

اُٹھیں آنکھیں، بادل سے لہرا گئے — ملیں نظریں، بجلی سی تھرّا گئی

محبّت، جسے بھول بیٹھا تھا میں — اُسے دیکھ کر پھر سے یاد آ گئی

تمنّا کی بےتابیاں بخش کر — جوانی کی راتوں کو تڑپا گئی

محبّت، خوشی، زندگی، سب کے راز — مجھے آنکھوں آنکھوں میں سمجھا گئی

نہ سمجھا خضر زندگی کا جو بھید — وہ باتوں ہی باتوں میں بتلا گئی

مہک بن کے دم بھر کو ٹھہری مگر — مری زندگی بھر کو مہکا گئی

مری حسرتِ بوسہ کو، ناز سے — "بُری بات ہے" کہہ کہ بہلا گئی

یہ افسانہ ہے مختصر اس طرح — کہ اختر کے پہلو سے عذرا گئی

جمالِ سلمیٰ

مری کی صنوبرستانی راتوں میں

مری کی ہر سبز پوش وادی ہواؤں سے تھرتھرا رہی ہے

صنوبرستاں کے دامنوں میں نسیم بربط بجا رہی ہے
شمیمِ گل موجِ بےخودی بن کے رُوح کو گدگدا رہی ہے
مگر مرے دل کی دھڑکنوں سے صدا یہ رہ رہ کے آ رہی ہے
"احن شوقاً" الیٰ دیارٍ لقیت فیہا جمالِ سلمیٰ!
کہ می رساند از اں نواحی نویدِ وصلے بجانبِ ما"

بہار کی چاندنی فضا میں رو پہلی کرنیں لٹا رہی ہے
جو غنچہ ہے مسکرا رہا ہے، جو شاخ ہے لہلہا رہی ہے
ہوائے کشمیر منظروں میں شگفتگی سی بسا رہی ہے
مگر مری رُوح دکھ بھری لَے میں اس طرح گنگنا رہی ہے
"احن شوقاً" الےٰ دیارٍ لقیت فیہا جمالِ سلمیٰ!
کہ می رساند از اں نواحی نویدِ وصلے بجانبِ ما"

اُن سے

غمِ دل دیدہ کو غم سہنے کی عادت نہ رہی
چشمِ محزوں میں لہو رونے کی ہمت نہ رہی
مرنے کے دن نہیں اور جینے کی حسرت نہ رہی
رحم کر رحم، کہ اب ضبط کی طاقت نہ رہی
دردِ دل بڑھ کے نہ محتاجِ مداوا ہو جائے
تیرے قربان ترا عشق نہ رسوا ہو جائے

کیا غضب ہے کہ غمِ ہجر سنا بھی نہ سکیں
سینے کا زخم دکھائیں تو دکھا بھی نہ سکیں
صبر ہو بھی نہ سکے، رنج اٹھا بھی نہ سکیں
آپ جا بھی نہ سکیں، تم کو بلا بھی نہ سکیں

غمِ دل کون سنے تیری بلا بھی نہ سنے
اور نصیبوں کو یہ ضد ہے کہ خدا بھی نہ سنے

عشق نے ظلم وہ ڈھائے ہیں کہ جی جانتا ہے
یاس نے گُل وہ کھلائے ہیں کہ جی جانتا ہے
درد، دُکھ، دل نے وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
ہم نے وہ رنج اُٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اشک پروردہ ہیں، غم دیدہ ہیں مجبور ہیں ہم
او پری! پاس بلالے کہ بہت دُور ہیں ہم

جانتا ہوں کہ تمہیں بھی ہے محبّت مجھ سے
گر یہ سچ ہے تو سنو ایک شکایت مجھ سے
پہلے تو رکھتی تھیں، تم خط و کتابت مجھ سے
کہتی سنتی تھیں ہم قصۂ الفت مجھ سے

پُھول کی طرح مہکتے ہوئے خط آتے تھے
دیکھ کر جن کو کنول روح کے کھل جاتے تھے

اب مگر مدتیں گزریں کہ وہ حالت نہ رہی
وہ نوازش، وہ مروّت، وہ عنایت نہ رہی
یہ تو کس دل سے کہوں مجھ سے محبّت نہ رہی
ہاں مگر اور خیالات سے فرصت نہ رہی

تم ہو اب اور مدارات ہے بیگانوں کی!
کون لیتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی!

خط تو لکھنے کو ہمیں لکھتی ہو اب بھی اکثر
اجنبیّت سے بھرے ہوتے ہیں لیکن یکسر
نام کو بھی نہیں ہوتا ہے محبت کا اثر
خیر اس طرزِ مخاطب سے ہے کیا مدِ نظر

کیا یہ مطلب ہے کہ میں لائق الفت نہ رہا
دل مرا درخورِ غم ہائے محبّت نہ رہا

دردمند دل پہ یہ ظلم اور ستم ایجاد نہ کر
میری امیدوں کی فردوس کو برباد نہ کر
اس پہ راضی ہوں کہ تا حشر مجھے یاد نہ کر
بن کے انجان، مگر مائلِ فریاد نہ کر

حال یہ ہے کہ دل اب غم سے مٹا چاہتا ہے
عشق پردہ نشیں بے پردہ ہوا چاہتا ہے

پھر نہ کہنا کہ "عبث کر دیا بدنام ہمیں
پہلے معلوم نہ تھا جور کا انجام ہمیں"
یا یہ حیلہ کہ "نہیں آپ سے کچھ کام ہمیں
آپ بھیجا نہ کریں عشق کے پیغام ہمیں"

دیکھ لینا یہ بہانے نہیں کام آئیں گے
تیرے دیوانے ترے عشق میں مر جائیں گے

میرے انجام پہ پچھتاؤ گی تم، یاد رہے
اپنے اس ظلم سے شرماؤ گی تم، یاد رہے
اب اگر رحم نہ فرماؤ گی تم، یاد رہے
حشر تک پھر نہ ہمیں پاؤ گی تم، یاد رہے

"رفتم از دستِ تو اے غارتِ ایماں رفتم
بہ ہوایم نہ شتابی کہ شتاباں رفتم"

نغمۂ زندگی!

بربطِ کائنات پر، نغمہ سرا ہے زندگی
مست نوا ہے زندگی
دادیٔ مہر و ماہ تک بال کشا ہے زندگی
جلوہ نما ہے زندگی
جس کی کچھ ابتدا نہیں، جس کی کچھ ابتدا نہیں
جس کو کبھی فنا نہیں
خواب گہِ فنا میں وہ موجِ صدا ہے زندگی
رقصِ صبا ہے زندگی

موسمِ شعلہ بار میں، دامنِ کشتِ زار میں
سینۂ کاشتکار میں
بن کے لہو کا اضطراب، ہمہمہ زا ہے زندگی
نغمہ سرا ہے زندگی
جام ہیں مختلف تو ہوں، اُن میں شراب ایک ہے
بادۂ ناب ایک ہے
سازِ فنا میں مشترک، ایک صدا ہے زندگی
ایک نوا ہے زندگی
رہ روِ راہِ ارتقا کے لئے ایک مقام ہے
راہزنِ خرام ہے
لے کے عدم سے تا عدم ایک فضا ہے زندگی
راہ نما ہے زندگی
اُس کی ہوائے تند پر تیر رہی ہے کائنات
مستِ شرابِ حیات
طائرِ دہر کے لئے ایک فضا ہے زندگی
کیا کہوں کیا ہے زندگی؟

شاعر کی تربت!

دامانِ خرابہ زار میں ہے
اک شاعرِ نوجواں کی تربت
یا وادیٔ نو بہار میں ہے
اک نکہتِ رائگاں کی تربت

آتی نہیں اس طرف ہوائیں
شاداب و شگفتہ پھول لے کر
زائر نہیں اشک جو بہائیں
سینے میں دل ملول لے کر

ممنون، بہار کی نہیں ہے
کھلتے نہیں پھول اس زمیں سے
بیکس کا یہ مرقدِ حزیں ہے
بیگانہ گلاب و یاسمیں سے

پرِ چشمِ بصیرت آشنا کو
مل جائے جو رخصتِ تماشا
اور غور سے گورِ با صفا کو
دیکھے تو ہے عبرتِ تماشا

شاعر کے الم گسار ہیں جمع
تربت پہ ہجوم ہو رہا ہے
شمع و دل داغدار ہیں جمع
اور جام بھی خون رو رہا ہے

وہ شمع کہ جس کی روشنی میں
راتوں کو وہ فکرِ شعر کرتا
وہ جام کہ جس کو زندگی میں
وہ بادۂ شعلہ گوں سے بھرتا

وہ دل کہ جو تھا اسیرِ اُلفت
اور آج بھی خوگرِ جفا ہے
پیوست ہے جس میں تیرِ الفت
جو پھول کی طرح جانفزا ہے

اک سمت فضا پہ چھا رہا ہے
آئینۂ رُو نمائے سلمےٰ
یا موت کو گدگدا رہا ہے
نظّارۂ جانفزائے سلمےٰ

شاعر کو مگر نہیں خبر کچھ
وہ تیرہ نصیب سو رہا ہے
اُس پر نہیں حال کا اثر کچھ
جاگا تھا غریب سو رہا ہے

سلام کے جواب میں

سلام اُس پہ کہ جس نے سلام بھیجا ہے
نگاہِ ناز کا رنگیں پیام بھیجا ہے

سلام اُس پہ کہ گر اُس کی مدحِ ناز کروں
ذرا سی عمر کو میں حشر تک دراز کروں

سلام اُس پہ فدا جس پہ ہر چمن کی بہار
بہشت کے گل و نسرین و نسترن کی بہار

سلام اُس پہ جسے حورِ کہکشاں کہیے
زمیں کے شب کدے میں نورِ آسماں کہیے

وہ مہ جبیں جسے تارے بھی پیار کرتے ہیں
اور اُس کے قدموں پہ کرنیں نثار کرتے ہیں

مہ و ستاروں کا پیکر، رُخِ حسیں اس کا
بہار و نور کا بُت، جسمِ مرمریں اُس کا

وہ گل بدن کہ اگر سیرِ گل کو آ جائے
غرورِ گل کی نزاکت کا سب ٹل جائے

شمیمِ زلف سے سو جنتیں مہک جائیں
نگاہِ مست سے میخانے تک بہک جائیں

وہ زلفِ تیرہ کہ دن ہو تو رات ہو جائے
سیاہ آنکھوں میں کُل کائنات ہو جائے

وہ شوخ آنکھیں، جہاں بجلیاں مچلتی ہیں
وہ نظریں جن سے جواں مستیاں اُبلتی ہیں

کشیدہ ابروئے ہلالِ سیاہ کہیے جنہیں
کئی دلوں کا مآلِ سیاہ کہیے جنہیں

شفق سے گل سے سمن سے بنے ہوئے عارض
بہارِ باغِ عدن سے بنے ہوئے عارض

وہ لعلِ لب کہ جنہیں آرزوئیں پیار کریں
بہشتیں، غنچوں کی شادابیاں نثار کریں

خرامِ ناز، کہ موجِ نسیم رُک جائے
صدائے شوخ کہ قدموں پہ زہرہ جھک جائے

بتانِ شہر میں وہ اس طرح نمایاں ہے
کہ جیسے تاروں میں ماہِ جواں درخشاں ہے

نسیم کی طرح جس دم چمن میں آتی ہے
چمن کی ہر کلی مدحت کے گیت گاتی ہے

وہ پھول ہے، کہ بہاروں کا جس پہ ساتھ ہے　　　وہ چاند ہے کہ ستاروں کا جس پہ ساتھ ہے

برنگِ مدح یہ "تازہ کلام" حاضر ہے　　　اور اس زباں میں "جوابِ سلام" حاضر ہے

اُمیدِ دل کی کلی کھل کے پھول ہو جائے

ہماری نذرِ محبت، قبول ہو جائے!

سرزمینِ عشق!

اک سرزمینِ عشق ہے!

ہنگامۂ عالم سے دُور، آفت گہِ ہستی سے دُور

اِس مکر کی دُنیا سے دُور، اس ظلم کی بستی سے دُور

اِس رات، اس دن سے الگ، اس اوج اس پستی سے دُور

دُور از زمین و آسماں

اک سرزمینِ عشق ہے!

اس کے گلستاں پُر فضا، اس کی بہاریں دل نشیں

اس کی زمینیں خوشنما، اس کی فضائیں مرمریں

اس کے نظارے دل کشا، اس کی ہوائیں عنبریں

مثلِ بہشتِ گل فشاں

اک سرزمینِ عشق ہے!

ہاں یہ بہشتی سرزمیں اک سازِ وجد انگیز ہے!
جس کے سنہری پردوں میں ہر نغمہ خواب آمیز ہے!
اور "دیوتائے عشق" کی پرواز سے لبریز ہے!
ہم رنگِ خوابِ رائگاں!
اک سرزمینِ عشق ہے!

اک وادیٔ اسرار ہے، اک جلوہ گاہِ ناز ہے!
جس کی فضا میں موجزن اک سرمدی آواز ہے!
اور جس کا ہر نغمہ گدازِ روح کی پرواز ہے!
ہمزلفِ بوئے گلستاں!
اک سرزمینِ عشق ہے!

دُعا!

مجسّمہ فرض کرکے!

تاروں بھری رات سو رہی ہے
فطرت مدہوش ہو رہی ہے!
ہیں وادی و کوہسار خاموش
ہر پھول، ہر آبشار خاموش
اس اُجلے سمے میں اک پری ہے
گویا کوئی شکل حرمری ہے!
کم سن، معصوم، بھولی بھالی
چہرے پہ گلاب کی سی لالی

ایک دُکھ بھرا گیت گا رہی ہے — روتی ہوئی اڑتی جا رہی ہے
پھیلائے ہوئے ہے اپنا دامن — ہونٹوں پہ ہے دل گداز شیون
بکھرے ہوئے بال اڑ رہے ہیں — ظلمات کے جال اڑ رہے ہیں
غمگیں نظریں اُٹھا رہی ہے — اور تاروں کی سمت جا رہی ہیں
خالق کے حضور میں چلی ہے — کچھ رحم کی بھیک مانگتی ہے
آنکھوں میں چھلک رہے ہیں آنسو — گالوں پہ ڈھلک رہے ہیں آنسو

سازِ زخمی کی ہے صدا یہ !
ٹوٹے ہوئے دل کی ہے دعا یہ

اِندر سبھا میں!

وہ بے نقاب سامنے آ کر چلی گئیں — بجلی سی میرے دل پہ گرا کر چلی گئیں
سینے میں سو رہی تھیں جوانی کی حسرتیں — نظروں کی پنکھیوں سے جگا کر چلی گئیں
تھا صبر کی شراب سے لبریز جامِ دل! — بے درد بن کے ٹھیس لگا کر چلی گئیں
جادو سا کر رہی تھیں نشیلی نگاہ سے — ساری "سبھا" کو اپنا بنا کر چلی گئیں
یوناں کے شوخ و شنگ کماندار کی طرح — ننھا سا ایک تیر چلا کر چلی گئیں
ایک ایک کو کنول سی وہ سرشار انکھڑیاں — مستی کے دو دو جام پلا کر چلی گئیں
دل کے سیاہ خانے میں، برقِ جمال سے — ارمان کا چراغ جلا کر چلی گئیں
میرے ہر اک خیال کی دنیا بدل گئی — کچھ ایسا خواب مجھ کو دکھا کر چلی گئیں

سینے میں ہلکی ہلکی نگاہوں کے وار سے
اک میٹھا میٹھا درد اُٹھا کر چلی گئیں

رنج والم کے، حسرت و ارماں کے، ہجر کے
کیا کیا کھلونے دل کو دلا کر چلی گئیں

سرشار آنکھ، نیند کی مستی، خمارِ حسن
لاکھوں شراب خانے لٹا کر چلی گئیں

آنکھیں ہی کھل گئیں کہ وہ منظر بدل گیا
پردہ سا سامنے سے اُٹھا کر چلی گئیں

کعبے کا راستہ مرے دل سے بھلا دیا
بیت الصنم کی راہ دکھا کر چلی گئیں

اُن انکھڑیوں کی یاد میں اس طرح مست ہوں
گویا مجھے شراب پلا کر چلی گئیں

رنگیں لباس کی نظر آشوبیاں نہ پوچھ
محفل پہ اپنا رنگ جما کر چلی گئیں

دُہرا رہا ہوں اب تک اُنہی کے خیال کو
اللہ کیا سبق وہ پڑھا کر چلی گئیں

وہ جس طرف چلی ہیں، اُدھر یوں چلا ہوں میں
گویا وہ چلتے چلتے بلا کر چلی گئیں

مجھ کو، کہ پہلے اپنی نظر میں کچھ اور تھا
کچھ اور سے کچھ اور بنا کر چلی گئیں

کب آئیں، کب گئیں، مجھے اخترؔ خبر نہیں
ہاں اتنا ہوش ہے کہ بس آکر چلی گئیں

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے!
اے وادیٔ گنگا، ترے شاداب نظارے!
یہ بکھرے ہوئے پھول، یہ نکھرے ہوئے تارے!
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے!

یہ چاندنی رات، اور یہ پر خواب فضائیں!
اک موجِ طرب کی طرح بے تاب فضائیں!
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں!
مہکے ہوئے منظارے ہیں بہکے ہوئے تارے!

یہ تارے ہیں یا نور کے پیمانے ہیں روشن!
معصوم پری زادوں کے کاشانے ہیں روشن!
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں روشن!
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے!

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے!
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے!
مرمر کی صراحی مے سیمیں سے بھری ہے!
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے!

نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں!
گلزار ہیں گلریز، گہر بار ہوائیں!
ہیں نور میں بھیگی ہوئی سرشار ہوائیں!
یا بال فشاں، مستی و نکہت کے نظارے!

ساحل ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں!
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں!

فردوس کی مستانہ بہاروں کے شبستاں!
اختر کی تمنا ہے یہیں رات گزارے!

عشق و آزادی !!!

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

سلمیٰ

نور جہاں کے مزار پر

فضائے غم میں مسرت سی جھلملائی ہے
خزاں کی شام پہ صبحِ بہار چھائی ہے
مزارِ نور جہاں پر وہ شوخ آئی ہے!

گماں ہے خلد سے حورِ جناں نکل آئی
نقابِ گل سے شمیمِ نہاں نکل آئی
کہ اپنی قبر سے نورِ جہاں نکل آئی!

اندھیرے مقبرے میں غم سے یوں پریشاں ہے
فضا کی گود میں گویا کہ شمعِ گریاں ہے
شبِ سیاہ میں سیارہ اشک افشاں ہے

طلائی ہاتھ اُٹھے کس کے فاتحہ کے لئے   فضائیں ہوگئیں بیتاب التجا کے لئے
خدائی کانپ اُٹھی جذبۂ دعا کے لئے

یہ رنگ دیکھ کے رنجور ہو رہا ہوں میں   شرابِ درد سے مخمور ہو رہا ہوں میں
بیانِ حال پہ مجبور ہو رہا ہوں میں

گداز دل میں، جنوں سر میں، لب پہ شیون بھی   وہ شیون آہ کہ رو دے وہ چشمِ پُرفن بھی
مگر میں کیا کروں، ہے ساتھ شیر افگن بھی

الٰہی گر اسے نورِ جہاں بنانا تھا   مرے نصیب کو یوں کامراں بنانا تھا
مجھے بھی خسروِ ہندوستاں بنانا تھا

کہ ایک دن یہی نورِ جہاں مری ہوتی   جو آج غیر کی ہے دلستاں مری ہوتی
یہ غم زدہ بدلِ شادماں مری ہوتی

یہ کس نے چپکے سے تربت کی سمت اشارہ کیا   بتا کے حُسن کا انجام، دل دو پارہ کیا
اور اپنا رازِ غمِ عشق آشکارہ کیا

یہ کس کو شکوہ ہے تربت کی بے نوائی کا   مزارِ شوہرِ ملکہ کی خوش نمائی کا
اور اس کے ساتھ ہی مردوں کی بیوفائی کا

اُٹھی ہیں قبر پہ یہ کس کی سوگوار آنکھیں   کہ ذرّے ذرّے کی ہیں غم سے بیقرار آنکھیں
فضا میں کچھ نہیں باقی پر اشکبار آنکھیں

شعاعِ ماہِ جواں کو فگار دیکھا ہے؟   شمیمِ خلد کو ماتم گسار دیکھا ہے؟
کسی نے حُسن کو یوں سوگوار دیکھا ہے؟

شکوہ

میری خوابیدہ امیدوں کو جگایا کیوں تھا
دل جلانا تھا تو دل تم نے لگایا کیوں تھا؟

مجھ کو اس طرح گرانا تھا اگر نظروں سے
پھر مرے عشق کو سینے میں بسایا کیوں تھا؟

اک "شکستہ سا کھلونا" ہی سہی دل میرا!
اس کو تحفے کی طرح تم نے منگایا کیوں تھا؟

غیر کی یاد کو ممنون اگر کرنا تھا!
خلوتِ دل میں مرے غم کو بسایا کیوں تھا؟

عشق تھا تم کو تو دل میں اسے پنہاں رکھتیں
اپنا یہ رازِ حسیں مجھ کو بتایا کیوں تھا؟

"چاندنی رات" میں "الفت کا سبق" دینے کو
مجھ کو "جمنا" کے کناروں پہ بلایا کیوں تھا؟

عمر بھر پاس نہ آنے کا ارادہ تھا اگر
پھر مجھے دور سے دیوانہ بنایا کیوں تھا؟

میری راتوں میں سمائے ہیں تمہارے کاکل
تم نے یہ خواب مجھے آہ دکھایا کیوں تھا؟

یاس کی نیند سلانا ہی اگر تھا منظور
میری امید کی راتوں کو جگایا کیوں تھا؟

اتنی خوددار اگر تھیں تو مرے دل کے عوض
اپنا سب کچھ مرے قدموں پہ لٹایا کیوں تھا؟

تلخ انجامیٔ الفت سے اگر ڈرتی تھیں
یہ خطرناک سبق مجھ کو پڑھایا کیوں تھا؟

روٹھ جانا ہی اگر حسن کا شیوا ٹھہرا
میری روٹھی ہوئی قسمت کو منایا کیوں تھا؟

"آؤ اب صلح کریں، عشق کریں، پیار کریں"
مجھ کو یہ زمزمۂ شوق سنایا کیوں تھا؟

ولولہ اپنی محبت کا گھٹانا تھا اگر
حوصلہ میری تمنا کا بڑھایا کیوں تھا؟

اٹھ نہ سکتا تھا اگر صدمۂ فرقت تم سے
پھر مرے دل کا عبث ناز اٹھایا کیوں تھا؟

نالۂ درد کی تلخی سے اگر نفرت تھی!
بربطِ عشق کے تاروں کو جگایا کیوں تھا؟

لب پہ اس طرح لگائی تھی اگر مہرِ سکوت — پھر مجھے نغمۂ اُمید سُنایا کیوں تھا؟
بے نیازی ہی سکھانی تھی اگر جلووں کو — میرے خوابوں کی فضاؤں کو بسایا کیوں تھا؟
نامۂ شوق ہمیشہ جو نہ لکھ سکتی تھیں — "بندگی نامہ" عبث ہم سے لکھایا کیوں تھا؟
پاس کرنا تھا اگر اپنی نزاکت کا تمہیں — دل پہ پھر بارِ غمِ عشق اُٹھایا کیوں تھا؟
وادیوں میں لئے پھرتا تھا اگر شوقِ شکار — دُور سے میری طرف تیر چلایا کیوں تھا؟
بادۂ عشق میں ایسی ہی اگر تلخی تھی! — پہلے اس جام کو ہونٹوں سے لگایا کیوں تھا؟
گر نظر آتی تھی دشوار وفا کی منزل — پھر قدم راہِ محبت میں اُٹھایا کیوں تھا؟
میرے سجدوں کیلئے اور ٹھکانے تھے بہت — آستاں اپنا مجھے تم نے بنایا کیوں تھا؟

الغرض، عشق کا بھولا ہوا یہ تلخ سبق!
بھولنے والی! مجھے یاد دلایا کیوں تھا؟

وقت کی قدر

دعوت

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ! — چمن کی گود میں آ کر سما بھی جا سلمےٰ!
کلی کلی میں بہاریں بسا بھی جا سلمےٰ! — مجھے جنوں کا سبق پھر پڑھا بھی جا سلمےٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

"ملیں گے حشر میں" مت کہہ یہ بار بار مجھے
ہو کیسے حشر کے وعدے پہ اعتبار مجھے
خدا کے دل پہ نہیں کوئی اختیار مجھے
خدا کو مان، یہیں حشر اُٹھا بھی جا سلمےٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

نشاطِ عمر کو اُمید پر نثار نہ کر
وصالِ صبحِ قیامت کا انتظار نہ کر
ریاضِ خلد کی باتوں کا اعتبار نہ کر
فریبِ وعدۂ فردا مٹا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

کسے خبر ہے قیامت میں ہم ملیں نہ ملیں
فضائے روضۂ جنّت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیت بُھلا بھی جا سلمےٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

گنوا نہ سوگ میں اپنے شباب کی راتیں
نظر نہ آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
یہ نکہتوں کا ہجوم اور یہ خواب کی راتیں
فضا میں خوابِ حسیں بن کے چھا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

خبر ہے جلد کہ عمرِ عزیز فانی ہے
سرائے دہر کی ہر چیز آنی جانی ہے
بہ رنگِ ابر، رواں فصلِ نوجوانی ہے
چھلکنے والا ہے ساغر پلا بھی جا سلمےٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

کسے خبر یہ گھٹائیں رہیں رہیں نہ رہیں
یہ نکہتیں یہ ہوائیں رہیں رہیں نہ رہیں
یہ مستیاں، یہ فضائیں رہیں رہیں نہ رہیں
شرابِ وصل کا ساغر پلا بھی جا سلمےٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

ثباتِ عہدِ زمانے میں کس نے پایا ہے　　زمانہ رنگ بدلنے کو رنگ لایا ہے
بہارِ عمرِ رواں بادلوں کا سایا ہے　　بہارِ عمر کی خوشیاں منا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

ترے خیال کو دل میں بسائے بیٹھے ہیں　　خدائی ہو کہ خدا ہو، بھلائے بیٹھے ہیں
سرورِ عہدِ جوانی لٹائے بیٹھے ہیں　　تو آ کے قدرِ جوانی سکھا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

یہ فصل اور یہ بہاریں نظر نہ آئیں گی پھر　　یہ بادلوں کی قطاریں نظر نہ آئیں گی پھر
یہ ہلکی ہلکی پھواریں نظر نہ آئیں گی پھر　　شرابِ عیش و مسرت لنڈھا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

بتا تو کیا یہ نظارے اجڑ نہ جائیں گے؟　　یہ ندیاں یہ کنارے اجڑ نہ جائیں گے؟
یہ چاند اور یہ ستارے اجڑ نہ جائیں گے؟　　ستارہ وار شعاعیں لٹا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

غموں پہ کی ہیں فدا شادمانیاں ہم نے　　خدا کے نام پہ تج دیں جوانیاں ہم نے
گزار دیں ہیں یونہی زندگانیاں ہم نے　　دمِ اخیر تو غم سے چھڑا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

فنا نصیب ہیں یہ سبزہ زار کے منظر　　یہ کوہسار و لبِ جوئبار کے منظر
نظر نہ آئیں گے، پھر یہ بہار کے منظر　　ابھی سماں ہے بہاریں دکھا بھی جا سلمیٰ!
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

خبر لے جلد کہ بہکی ہوئی بہار ہے آج — نشاطِ خلد سے معمور سبزہ زار ہے آج
اجل پہ بھی مری ہستی کو اختیار ہے آج — غرورِ عشق کی ہمت بڑھا بھی جا سلمےٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

تو حکم دے تو ستاروں کو چھین لاؤں میں — فلک سے اس کے نظاروں کو چھین لاؤں میں
ارم کی مست بہاروں کو چھین لاؤں میں — خدائی کو یہ تماشا دکھا بھی جا سلمےٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

تو سامنے ہو تو کون و مکاں کو گم کر دوں — خمِ طرب میں خمِ آسماں کو گم کر دوں!
دوئی ہو فرد تو دونوں جہاں کو گم کر دوں — برنگِ رُوح بدن میں سما بھی جا سلمےٰ!

بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمےٰ!

ایک خط کی رسید

جنّتِ حسن کی بُو، حُورِ صبا لائی ہے
چار سُو رقص کناں مستی و رعنائی ہے
میرے افکار پہ پھولوں کی گھٹا چھائی ہے
وادیٔ سندھ سے اک دعوتِ عشق آئی ہے

کوئی سلمیٰ! مرے سجدوں کی تمنائی ہے

کس نے لکھا ہے کہ تم سندھ کو کیوں بھول گئے؟
تب میں چرچا ہے کہ تم سندھ کو کیوں بھول گئے؟
"سخت شکوہ ہے کہ تم سندھ کو کیوں بھول گئے؟
"کس نے پوچھا ہے کہ تم سندھ کو کیوں بھول گئے؟
کیسے بتلاؤں کہ اندیشۂ رسوائی ہے؟

جس کے ذرّوں پہ فدا ہیں مہ و خورشید و فلک
جس کے ہر پھول پہ قربان ہے فردوس تلک
کھاتے ہیں جس کی لطافت کی قسم، حور و ملک
جس نے دیکھی تھی کبھی تیغِ محمد کی جھلک
اب وہ میدان میرے خامے کا تماشائی ہے!

غائب از چشم ہے پھر جلوہ نما ہے یہ کون؟
نظر آتا نہیں، منظر دل میں چھپا ہے یہ کون؟
دل کو معلوم نہیں، دل میں بسا ہے یہ کون؟
دُور سے، کان میں یوں نغمہ سرا ہے یہ کون؟
کن طلسمات میں حیرت مجھے لے آئی ہے!

کون آمادہ ہے سینے میں در آنے کے لئے
دل کے ظلمت کدے میں شمع جلانے کے لئے
شامِ اذکار کو خوشبو سے بسانے کے لئے
کون بے پردہ ہوا جلوہ لٹانے کے لئے
کہ تصوّر کو خیالِ چمن آرائی ہے!

لکھا ہے "سنتہ بھی وعدے کو وفا کر دے گا"
"تم اگر یاد کرو گے، حق ادا کر دے گا"
"صارِ عشق، شبہ حسن عطا کر دے گا"
"دردِ دل خوب بڑھاؤ کہ دوا کر دے گا"
یہ حقیقت ہے کہ یارب سخن آرائی ہے!

عشق کے ولولے پھر جاگ اُٹھے سینے میں
نقشِ ارماں پھر اُبھر آئے اس آئینے میں
لطف آنے لگا صہبائے جنوں پینے میں
لذتیں خلد کی پیدا ہوئیں پھر جینے میں
شوق و اُمید کے پھولوں میں بہار آئی ہے!

بعض رومانی لمحات کی یاد

در عنفوانِ جوانی چنانکہ افتد دانی ....

(سعدیؒ)

عشق کا موسم، غم کی ہوائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے
دل میں تمنا، لب پہ دعائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

یاروں کا گہری نیند میں سونا، دل کا کسی کی یاد میں کھونا
شوق کو یہ ضد سب کو جگائیں، اُف رے جوانی، ہائے زمانے

عشق کی نادانی کا فسانہ، عقل کی حیرانی کا زمانہ
سر میں جنوں، آنکھوں میں حیائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

شوق کی پہلی نیند اُچٹنا، عشق کی پچھلی رات نہ کٹنا
دل میں امیدیں، لب پہ دعائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

دُور سے ان کو دیکھتے رہنا، مُنہ سے مگر اک حرف نہ کہنا
سادہ نگاہیں، بھولی ادائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

پاک سہانی گھر کی فضائیں، بُوئے حنا سے مست ہوائیں
صحن میں بنتِ عم کی صدائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

چاندنی راتیں سوئی ہوئی سی، نیند میں فطرت کھوئی ہوئی سی
مست فضائیں، سرد ہوائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

گھر پہ کسی کے رات گزرنا، اور وہ اس کا صبح کو ڈرنا
"دیکھو کنیزیں دیکھ نہ پائیں" اُف رے جوانی ہائے زمانے

جھولے پہ ان کو چھیڑتے رہنا، اور وہ اُن کا ناز سے کہنا
"آپ نہ جھولا اب سے جھلائیں" اُف رے جوانی ہائے زمانے

اُن کا بلانا، آپ نہ جانا، راہ دکھانا رات جگانا!
تاکہ ابھی وہ اور منائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

صحن چمن اور بادہ پرستی، رات کا منظر عالم مستی
قدموں پہ ساغر سر پہ گھٹائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

وہ مری راتیں بہکی ہوئی سی، وہ مری باتیں بہکی ہوئی سی
مرنے کے دن جینے کی دعائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

ایک گلی سے روز گزرنا، گرچہ کسی سے بات نہ کرنا
سینے میں دھڑکن، منہ پہ ہوائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

گھر پہ وہ اک مہ پارہ کا آنا، بات نہ کرنا آنکھ چرانا
دل ہی خلش تنہا کبھی پائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

چاندنی اور دریا میں سفینہ، ہاتھ میں مینا ساتھ حسینہ
ساز کے لب پر مست صدائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

باغ کا وہ پھولوں سے مہکنا، وقت کا خوشبو بن کے لہکنا
چاندنی راتیں، مست ہوائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے
گاؤں کے جس پنگھٹ پہ بھی جانا بے کہے گاگر سر پہ رکھانا
ہنستی رہیں گھونگھٹ میں ادائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے
یاد میں آنسو بہتے ہیں اختر کھوئے ہوئے سے رہتے ہیں اختر
دل سے ہمے وہ کیسے بھلائیں، اُف رے جوانی ہائے زمانے

عید کا چاند
عربی ریگستان میں

عرب کی شام کا دلکش سماں ہے — فضا سے کیفِ رنگینی عیاں ہے
سوئے منزل رواں اک کارواں ہے
مسافر ہیں، تھکے ہیں، جا رہے ہیں — حُدی کے مست نغمے گا رہے ہیں
سکونِ دشت کو تڑپا رہے ہیں!
یہ صحرا ہے کہ ہے دامانِ نکہت — سوادِ شام ہے یا جانِ نکہت
بپا ہے چار سو طوفانِ نکہت!
مسافر مست نغمے کیفِ نوا سے — کہ ماہِ عید نے جھانکا فضا سے
ہر اک بے خود ہوا ذوقِ دعا سے!

ہیں سجدے شکر کے مضطر جبیں میں
ہے سر خم در گہِ جاں آفریں میں
سرشکِ شوق ہیں چشمِ حزیں میں!

ہلالِ عید بر روئے فلک ہے
کہ قوسِ سیمِ ابروئے فلک ہے
طلائی کشتی اور جوئے فلک ہے!

طراوت آگئی موجِ صبا میں
بہاریں کھیلتی ہیں اس فضا میں
بسی ہے عید کی نکہت ہوا میں!

عرب کی شام کا دلکش سماں ہے
فضا سے کیفِ رنگینی عیاں ہے
سوئے منزل رواں اک کارواں ہے!

یادگارِ علیؑ

فرازِ چرخ سے ہمدوشِ افتخارِ علیؑ
چراغِ مہر ہے اک پرتوِ وقارِ علیؑ!
بہارِ باغِ جناں، خاکِ رہ گذارِ علیؑ!
فضائے دہر پہ ازیادِ سوگوارِ علیؑ!
قلم فدائے علیؑ ہے، زباں نثارِ علیؑ!
علیؑ کی یاد ہے، دنیا میں یادگارِ علیؑ!

علیؑ کہ نقشۂ خیبر مٹا دیا جس نے
فضائے جنگ میں محشر جگا دیا جس نے
حصارِ چرخِ بریں کو ہلا دیا جس نے
جہاں کو تیغ کا جوہر دکھا دیا جس نے
ہے اب بھی یاد زمانے کو ذوالفقارِ علیؑ!
علیؑ کی یاد ہے دنیا میں یادگارِ علیؑ!

وہ دلق پوش کہ سب بادشاہ کہیں جس کو　　وہ خاکسار کہ شیرِ خدا کہیں جس کو
وہ اُس کا نام کہ مشکل کشا کہیں جس کو　　وہ اُس کا خلق کہ شمعِ ہدا کہیں جس کو

ہے فیض پرتوِ حق خُلقِ لطف بار علیؑ!
علیؑ کی یاد ہے دنیا میں یادگارِ علیؑ!

وہ اُس کی تیغ کہ جب رُخ سوئے مصاف کیا　　ذرا سی دیر میں کتنی صفوں کو صاف کیا
کبھی نہ فطرتِ اخلاق کے خلاف کیا　　وہ اُس کا رحم کہ قاتل کو بھی معاف کیا

ہے لطف و رحم بھی سو جان سے نثارِ علیؑ!
علیؑ کی یاد ہے دنیا میں یادگارِ علیؑ!

سرِ نیاز ہے خالق کا آستانہ ہے　　زبانِ شوق پہ تصدیق کا ترانہ ہے
رگِ گلو ہے کہ جلّاد کا نشانہ ہے　　یہ موت موت نہیں کیفِ عاشقانہ ہے

مدام رحمتِ حق باد ہمکنارِ علیؑ!
علیؑ کی یاد ہے دنیا میں یادگارِ علیؑ!

انتظار!

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

خوش ہوائیست فرح بخش خدایا بفرست　　نازنینِ کہ برویش مے گلگوں نوشم

بہار و کیف کی بدلی اتر آئے گی وادی میں
سُرور و نور کا کوثر چھڑک جائے گی وادی میں

نسیم بادیہ، منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

ابھی سے جاؤں اور وادی کے نظّاروں سے کہہ آؤں
بچھا دیں فرشِ گُل وادی میں گلزاروں سے کہہ آؤں
چھڑک دیں مستیاں، پھولوں کی مہکاروں سے کہہ آؤں
کہ سلمیٰ، میری سلمیٰ نور برسائے گی وادی میں!
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو وادی میں آئے گی!
برائے سیر اس پھولوں کی آبادی میں آئے گی!
غزالِ دشت بن کر رنگِ آزادی میں آئے گی!
اور آ کر ناز کی بستی بسا جائے گی وادی میں!
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

بہارِ وادیٔ رنگیں کو یہ مژدہ سُنا آؤں!
زمیں کو نکہتِ گلہائے رعنا سے بسا آؤں!

اور اُس پر نازنیں کلیوں کا اک بستر بچھا آؤں
کہ وہ نازک بدن ہے اور تھک جائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

زمیں پر بھیج دے آج اے بہشت اپنی بہاروں کو
بچھا دے خاک پر اے آسماں اپنے ستاروں کو
خرام و رقص کا دے حکم فطرت، ابر پاروں کو
وہ بےخود چاندنی نظروں سے گھبرائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

مرے آغوش میں ہو گا وہ جسمِ مرمریں اُس کا
وہ اُس کے کاکلِ مشکیں، وہ رُخِ نازنیں اُس کا
وہ رخسارِ حسیں اُس کے، وہ حُسنِ یاسمیں اُس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں!
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں!

تمنا و حیا کی کشمکش کیوں کر مٹاؤں گا!
میں اُس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گدگداؤں گا!

اور اُس کے لعلِ لب سے کس طرح رنگت چراؤں گا!
وہ پھولوں اور ستاروں سے بھی شرمائیگی وادی ہیں!
سُنا ہے میری سلمٰی رات کو آئے گی وادی میں!

خیر مقدم!

راہِ دہلی سے صبا عطر فشاں آتی ہے
خبر آئی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

پھر اُٹھا وادیٔ جمنا سے وہی ابرِ بہار
جس کے سائے میں وہ خوشبوئے رواں آتی ہے

جس کے پہلو میں میسر تھی کبھی راحتِ جاں
حرمِ جاں میں وہی راحتِ جاں آتی ہے

جسمِ پنجاب تھا بے روح و رواں مدت سے
جسمِ پنجاب میں پھر روحِ رواں آتی ہے

گل و گلشن سے کہو خاکِ رہِ شوق بنیں
وہ گلِ سر سبدِ گلبدناں آتی ہے

عندلیبانِ چمن گرمِ غزل خوانی ہوں
کہ بہار آتی ہے اور خلد فشاں آتی ہے

نو بہاروں سے کہو محوِ گل افشانی ہوں
کہ وہ رشکِ رُخِ نسریں بدناں آتی ہے

فرشِ گلبرگ بچھا دے رہِ گلشن میں نسیم
آج وہ نازشِ گل پیرہناں آتی ہے

نور برسائیں فضا میں مہ و انجم مل کر
کہ وہ غیرتِ دہِ صد سیمتناں آتی ہے

کشتیٔ ماہِ زر افشاں پہ سرِ ابرِ رواں!
مُسکراتی ہوئی وہ ماہِ رواں آتی ہے

گلشنِ دہلی میں دل اُس کا نہ بہلا شاید
سوئے لارنس جو وہ سروِ رواں آتی ہے

موجِ رفتہ کی طرح دور رہی جو راوی سے
لبِ راوی پہ وہی موجِ رواں آتی ہے

مٹنے والی ہے جہانگیریٔ شامِ فرقت
کہ سحر بن کے کوئی نور جہاں آتی ہے

لبِ شیریں کو سکھاتی تھی جو شیریں دہنی
پھر وہی حیرتِ شیریں دہناں آتی ہے
دامنِ دل کو سکھانے کے لئے درسِ جنوں
مصرِ دہلی سے زلیخائے جواں آتی ہے
نئی دہلی کی فضائیں نہیں معطر جس سے
سوئے لاہور وہ فردوسِ رواں آتی ہے
پھر مئے شوق سے سرشار ہوا ہوں اختؔر
پھر مرے لب پہ غزل رقص کناں آتی ہے

پیاری چلی جاؤ گی کیا؟

مجھ کو تڑپتا چھوڑ کر، پیاری چلی جاؤ گی کیا؟
میری نگاہِ شوق کو فرقت میں ترساؤ گی کیا؟
اُف حشر تک یہ چاند سی صورت نہ دکھلاؤ گی کیا؟
اور پھر نہیں آؤ گی کیا؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا؟

کیا جنّتِ دیدار سے محروم ہو جاؤں گا میں؟
اس محشرِ انوار سے محروم ہو جاؤں گا میں؟
ہاں کیا تمہارے پیار سے محروم ہو جاؤں گا میں؟
اُف، یہ ستم ڈھاؤ گی کیا؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا؟

کیا سُن رہا ہوں آہ میں دشمن کے گھر جاؤ گی تم !
اور اس قفس سے پھر رہا ہونے نہیں پاؤ گی تم !
میری تسلی کے لیئے واپس نہیں آؤ گی تم !
سچ سچ نہیں آؤ گی کیا ؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا ؟

کیا یہ دفا ہے بے وفا، ایسی وفا ہوتی ہے کیا ؟
دنیا میں رسمِ وعدہ اب یونہی ادا ہوتی ہے کیا ؟
یہ ہے دفا تو وہ جو اک شے ہے "وفا" ہوتی ہے کیا ؟
دل میں نہ شرماؤ گی کیا ؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا ؟

کس کو خبر تھی، آسمان آتش فشاں ہو جائے گا !
فردوس زارِ آرزو، نذرِ خزاں ہو جائے گا !
اور یہ گُلِ طلعت، نصیب دشمناں ہو جائے گا !
دشمن کی ہو جاؤ گی کیا ؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا ؟

تم جس کی قسمت میں ہو وہ فرخندہ اختر کون ہے؟
کہہ دو تمہارے عشق میں وہ میرا ہمسر کون ہے؟
وہ میرا دشمن لیکن اب، میرا مقدر کون ہے؟
مجھ کو نہ بتلاؤ گی کیا؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا؟

تم سے گلہ، لیکن نہیں، اصلاً نہیں، حاشا نہیں
مجبور ہو، مجبور سے کچھ جبر کا شکوہ نہیں
لیکن کروں کیا، دل کو بھی تو ضبط کا یارا نہیں
کہہ دو کہ پھر آؤ گی کیا؟
پیاری چلی جاؤ گی کیا؟

شامِ بنگال

ایک ایسے مسافر کے نقطۂ نظر سے جو پہلے بھی کئی بار شامِ بنگال سے لطف اندوز ہو چکا ہے

گنگناتی ہوئی، ہنستی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی
شامِ بنگال اٹھی زلفوں کو بکھراتی ہوئی
چشم میگوں میں لئے خوابِ زلیخا کے ہجوم
چاک دامانیٔ یوسف کی قسم کھاتی ہوئی

یادِ ایام کے جذبوں کو جگا کر دل میں
پھول کی طرح مری یاد کو مہکاتی ہوئی

بھر کے دامن میں حسینوں کا لہکتا ہوا نور
قصۂ طور کو ہر گام پہ دہراتی ہوئی

سارے غم بھول کے اک عالمِ سرمستی میں
قہقہہ بن کے ہر اک ہونٹ پہ لہراتی ہوئی

خاکِ کلکتہ پہ برسا کے شمیم و مستی
میری گزری ہوئی راتوں کی قسم کھاتی ہوئی

تازہ ہو کر مرے خوابوں میں ستاروں کی طرح
بھولے بسرے ہوئے کچھ خواب سے دکھلاتی ہوئی

ہر قدم پر نئے جادوں کو نمایاں کر کے
ہر قدم پہ نئے جلوے سے برساتی ہوئی

آ کے پہلو میں مرے، لیٹ گئی جیسے کوئی حور!
بسترِ گل سے اُٹھے صبح کو شرماتی ہوئی

اِسلام کا شکوہ

مسلمانوں سے

اے مسلماں تیری وہ دیرینہ عظمت کیا ہوئی
وہ حمیت، وہ دلیری، وہ شجاعت کیا ہوئی؟

کفرزارِ دہر کا تجھ پر اثر کیوں ہو گیا؟
وہ عرب والوں کی اسلامی صداقت کیا ہوئی؟

یاس کی تاریکیوں میں راہ گم کردہ ہے تو
آج وہ اُمید کی پُر نور صورت کیا ہوئی؟

جو نہ کرتی تھی تمیزِ بندہ و آقا کبھی
آہ وہ یک رنگیٔ جوشِ اخوت کیا ہوئی؟

جس کی کیفیت میں گم تھی روحِ سلمانؓ و بلالؓ
بادۂ عرفاں کی وہ مستانہ لذت کیا ہوئی؟

جن کی ہیبت سے کبھی کانپ اُٹھتے تھے روم و فرنگ
تیری تکبیروں کی وہ شیرانہ صولت کیا ہوئی؟

صفحۂ تاریخ پر جو آج تک تابندہ ہے
آج تیری وہ تحیر خیز شوکت کیا ہوئی؟
جو چلا دیتی تھی خشکی پر کبھی سو سو جہاز
آج تیرے دستِ بازو کی وہ ہمت کیا ہوئی؟
جس نے جا گاڑا تھا یورپ میں علَم اسلام کا
آہ تیرے بازوؤں کی اب طاقت کیا ہوئی؟
سینۂ افریقہ تھا جس کا مزارِ دائمی
تیرے ماضی کی وہ طوفاں خیز عظمت کیا ہوئی؟
دجلہ و نیل آج تک ہیں جس کے غم میں اشکبار
وہ خلافت کیا ہوئی؟ وہ اس کی سطوت کیا ہوئی؟
روک سکتا تھا نہ کوئی جن کو بحرِ بیکراں
تیرے وہ بیڑے کہاں ہیں؟ ان کی قوت کیا ہوئی؟
رو رہے ہیں آج تک جس کو کھنڈر اسپین کے
وہ حکومت کیا ہوئی؟ وہ اس کی شوکت کیا ہوئی؟
یاد کر للّٰہ! آج ان رفعتوں کو یاد کر!
تیرے دل کو کیا ہوا، اس کی وہ غیرت کیا ہوئی؟

اُٹھ رہا کر دل کو خوابِ عیش کی زنجیر سے!
گونج اُٹھیں پھر فضائیں نعرۂ تکبیر سے!

ھرجائی!

عشق میں تجھ کو بھی اپنا ہم زباں سمجھا تھا میں
تیرے دل کو درد دل کا رازداں سمجھا تھا میں
آہ اُس دن جب کہ تو پہلے پہل آ کر ملی
ساری پچھلی زندگی کو رائگاں سمجھا تھا میں
ہائے وہ رات اور وہ اُس رات کی رنگینیاں
جس کے ہر لمحے کو عمر جاوداں سمجھا تھا میں

دامنِ لارنس میں ہر سمت وہ خوابیدہ پھول
ذرّے ذرّے کو چمن زارِ جناں سمجھا تھا میں
صحنِ گلشن میں ترا حُسنِ خراماں دیکھ کر!
تجھ کو اک سیّارۂ بے آسماں سمجھا تھا میں
آہ وہ رنگین فضا، وہ چاندنی وہ بے خودی
اس سمے میں تجھ کو اک حُورِ جناں سمجھا تھا میں
گونجتا ہے اب بھی کانوں میں ترا اظہارِ عشق
جس کو اُس رات اک سرودِ آسماں سمجھا تھا میں
پھرتے ہیں آنکھوں میں وہ بے تاب آنسو آج بھی
جن کو تیرے رنج و غم کا ترجماں سمجھا تھا میں
چاند کی کرنوں سے گھبرا کر وہ خلوت کی تلاش
جس کو اپنے ضبط کا اک امتحاں سمجھا تھا میں
پھر وہ خلوت میں ہم آغوشی کی پنہاں کوششیں
تیری بے تابی کا جن کو رازداں سمجھا تھا میں
مینہ برستے میں وہ لے جانا بیاباں کی طرف
جن کو تیری وحشتوں کا ترجماں سمجھا تھا میں
وہ تری مستی بھری لَے اور وہ رنگیں غزل
جس سے تیرے ذوقِ شعری کو جواں سمجھا تھا میں

شکوہ کرنا چشمِ میگوں[۱] کا وہ لحنِ مست سے
جس کو صرف اک شوخئ نازِ بتاں سمجھا تھا میں
وعدہ لینا رازداری کا وہ ہنگامِ وداع
جس کو تیری پاکبازی کا نشاں سمجھا تھا میں
آج اے ..... مگر آنکھوں سے پردہ اُٹھ گیا
ایک دھوکے کو حقیقت کا نشاں سمجھا تھا میں
تھا ترا زرّیں پیکر اک بساطِ رہ گزر!
جس کو آغوشِ حریمِ کہکشاں سمجھا تھا میں
تیرا جسم اک زخم تھا اک زخمِ پنبہ دردہاں
جس کو انبارِ حریر و پرنیاں سمجھا تھا میں
تیرے سینے میں تھا رقصاں حرص کا آتشکدہ
جس کو نورِ شمعِ عشقِ جاوداں سمجھا تھا میں
تیرے ہونٹوں سے اُبلتی تھی ہوس کی تیرگی
جس کو غم کی پاک آہوں کا دھواں سمجھا تھا میں
تیرے پہلو سے نکلتی تھی گناہوں کی بھبک
جس کو بوئے دامنِ حورِ جناں سمجھا تھا میں

---

[۱] "چشمِ میگونِ تو گویاست کہ صہبا زدہ ای!
نوشِ جاں بادو لے حیف کہ بے ما زدہ ای"

چاند کی طرح ارزاں تھا ترا حُسن و شباب
جس کو اک دن چاند سے بڑھ کر گراں سمجھا تھا میں

تیرے ذوقِ شعر سے منکر نہیں لیکن اسے
آسمانی رفعتوں کا ترجماں سمجھا تھا میں

تیرا اک اک سانس تھا، اک دوزخِ حرص و ہوا
لیکن اس کو سوزِ الفت کا نشاں سمجھا تھا میں

کون واقف تھا تری ہستی ہے وقفِ این و آں
آہ تجھ کو ماورائے این و آں سمجھا تھا میں

تیرے ہونٹوں پر تھیں عفّت کے لہو کی سرخیاں
جن کو رنگِ غنچہ ہائے ارغواں سمجھا تھا میں

آہ! تو نکلی فریبِ حُسن کی زندہ مثال
تجھ کو اک حُسنِ حقیقت ترجماں سمجھا تھا میں

تو وہ ساغر تھی ہر اک کے ہونٹ جس کو چھو سکیں
ساغرِ خورشید و مہ کا ہمعناں سمجھا تھا میں

ہر مکاں نکلا تری جلوہ گری سے آشنا
تیرے ہر جلوے کو نورِ لامکاں سمجھا تھا میں

ایک ناگن بن کے لہراتی ہے تو افکار میں
حُسن کی اک سلسبیلِ بے کراں سمجھا تھا میں

چودھویں سالگرہ کا تحفہ

ستارے نذر کروں آفتاب نذر کروں ؟ کلی کا حسن کہ گلوں کا شباب نذر کروں ؟
ریاضِ خلد کی شادابیاں کروں حاضر ؟ نگاہِ حور کا رنگیں حجاب نذر کروں ؟
صباحتِ رُخِ شیریں کا ارمغاں بھیجوں ؟ لبِ سلمیٰ کا لعلِ خوش آب نذر کروں ؟
غزالِ دیدۂ لیلائے نجد بھجوا دوں ؟ خمارِ چشمِ زلیخا کا خواب نذر کروں ؟
کھلونا چاہیئے گر کوئی کھیلنے کے لئے چرا کے زہرہ کا زرّیں نقاب نذر کروں ؟
یہ سن ہے وہ کہ ستاروں سے بھی ہے پردہ ضرور شعاعِ مہر کا زرّیں نقاب نذر کروں ؟
مطالعے کی تمنا ہو گر نگاہوں کو تو کہکشاں کی طلائی کتاب نذر کروں ؟
مذاقِ شعر کی لازم اگر رعایت ہو تو شاعرانِ جہاں کا جواب نذر کروں ؟
زبسکہ سالگرہ چودھویں ہے حسرت ہے کہ میں بھی چودھویں کا ماہتاب نذر کروں ؟
قبول ہوں نہ یہ تحفے تو کیا کروں آخر ؟ کہو تو میں دلِ خانہ خراب نذر کروں ؟

اڈیٹر کی شان میں

اُردو اخبار نویسوں کا تعارف

قلم ہے ہاتھ میں، سگریٹ ہے مُنہ میں، تن کے بیٹھے ہیں
صحافیات کی کرسی پہ یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں!

متانت، لاکھ مصنوعی ہو، لیکن شبہ ہوتا ہے
وزیرِ ہند، وائٹ ہال میں لندن کے بیٹھے ہیں
غم ملت میں چہرے سے عیاں ہے موت کی سختی
مطلب ہیں آپ گویا ڈاکٹر برمن[1] کے بیٹھے ہیں
بس اب انگریزی اخباروں کی شامت آنے والی ہے
کہ قینچی ہاتھ میں ہے، بل جبیں پر، تن کے بیٹھے ہیں
اکڑ فوں ان کی کہتی ہے بنا لو کارٹون آ کر
کہ ہم بن کر بھتیجے قیصر[2] جرمن کے بیٹھے ہیں
ہزاروں ہند اور ایران قرباں ان کے تیور پر
گماں ہوتا ہے کوئی جانشیں کرزن کے بیٹھے ہیں
چمک آنکھوں کی گر تقریر کے عالم میں ظاہر ہو
تو ہو معلوم جہاں وادیٔ ایمن[3] کے بیٹھے ہیں
اگر غم خواریٔ ملت کریں ظاہر تو یہ شک ہو
بزرگِ خاندانی کوئی سن یٹ سن[4] کے بیٹھے ہیں

---

[1] کلکتہ کے احباب خصوصاً داد دیں۔

[2] قیصر کی مونچھیں یاد کر کے فاتحہ پڑھیے۔

[3] مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری کا تصور نہ کیا جائے ع پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

[4] کلکتہ کے چائنا بازار سے رسیاں تڑا کر بھاگ نکلے ہیں۔

تحکم آپ کا دیکھے تو نازی کو بھی ہو دھوکا
"مجسّم" صدر ہیں، مشروطۂ جرمن کے بیٹھے ہیں
اگر قومی مصائب کا بیاں چھیڑیں مجالس میں
تو شک ہو روضہ خواں کوئی کسی مدفن[1] کے بیٹھے ہیں
خطابیات کو گر رنگ اُلفت سے رنگیں، شک ہو
کہ پردادا ابیشرہ کے چچا بیسٹن کے بیٹھے ہیں
اصولوں پر جو چھیڑیں بحث، امریکہ یقیں کرلے
کہ اُستادِ یگانہ حضرتِ ولسن[2] کے بیٹھے ہیں
اگر افسانہ چھیڑیں اقتصادیاتِ عالم کا!
تو ہو معلوم ابوالآبا کوئی لیسنن کے بیٹھے ہیں
غرور آمیز نظریں پڑتی ہیں پبلک پہ یوں گویا
کلینر این۔ ڈبلو۔ آر کے انجن کے بیٹھے ہیں
علیقیات کے ماہر انہیں دیکھیں تو بول اُٹھیں
کہ وارث تخت گاہِ خسرو وبہمن[3] کے بیٹھے ہیں

---

[1] نہ ہوئے عارف فرذیبنی ہندوستان میں۔
[2] حبشہ کو آج ان کی بری طرح ضرورت ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!
[3] قابل توجہ محکمہ آثارِ قدیمہ ہند

کوئی کاتب نہ مانگے ان سے مضموں بار بار آکر
کہ جو نہ بن کے اُٹھیں گے، طمانچہ بن کے بیٹھے ہیں
عرب ہوٹل کا "خشکہ" ختم ہو جانے کو ہے بالکل
کہ چمچہ[1] ہاتھ میں ہے، مُنہ کھلا ہے، ٹن کے بیٹھے ہیں
لکھے ابنِ بطوطہ کب تلک تعریف حضرت کی
صحافیات کے گنبد پہ ہُد ہُد بن کے بیٹھے ہیں

بیوفائی زمانہ

قطعہ!

شکستہ دلوں سے منار اک بنا دیں
اور اُس پہ سے بزمِ جہاں میں صدا دیں
کہ نو واردانِ بساطِ زمانہ!
یہاں آکے درسِ محبت بھلا دیں
دماغوں سے فکرِ وفا محو کر دیں!
دلوں سے صداقت کے جذبے مٹا دیں
یہ باغ، ایسے پھولوں کے قابل نہیں ہے
خدارا اُمیدوں کی شمعیں بجھا دیں
خدائی ہے محروم صدق و صفا سے
خدائی میں صدق و صفا کو بھلا دیں

---

[1] چمچہ یا چپّو ؟ جناب سندباد جہازی مدیر مطائبات روزنامہ "احسان"، توجہ فرمائیں ع آپ کا سر ہے سلامت تو ہزاروں چپّو!

وہ سینے ہیں حساس دل جن میں لرزاں — انہیں سنگ ریزہ دل کا مسکن بنا دیں
وہ دل، جن میں ہیں عشق کے شعلے رقصاں — انہیں خاکِ داں حسرتوں کا بنا دیں
وہ آنکھیں ہے نورِ وفا جن میں روشن — انہیں بے حسی آئینے کی سکھا دیں
وہ جذبات، اخلاص سے ہیں جو رنگیں — انہیں تیرگیٔ ریا سے چھپا دیں
وہ افکار گہوارہ ہیں جو وفا کا — انہیں شیوۂ بے وفائی سکھا دیں

کہ دنیا ہے بیگانۂ عشق و وفا سے!
پھر انسانیت منحرف ہے خدا سے!

ایک تصویر دیکھ کر

یہ حسنِ نازنیں، یہ جلوۂ ناز آفریں تیرا
یہ معصومانہ چہرہ غنچۂ شاداب کا عالم
یہ مستانہ نگاہیں، اک بہشتی خواب کا عالم

سراپائے خیالِ حور، جسمِ نازنیں تیرا
مجسّم خندۂ خوابِ پری، روئے حسیں تیرا
یہ موتی، یہ جبیں، یا انجم و مہتاب کا عالم
پریشاں خواب کا سا گیسوئے شبتاب کا عالم

چمن زارِ شعاعِ نور، عکسِ دل نشیں تیرا

تو از سر تا بپا اک نکہت و تنویر ہے سلمیٰ!

شراب و شعر و موسیقی میں پنہاں تیری رنگت ہے
مرے خاموش دل میں موجزن تیری محبت ہے
بہار اور خواب کا ہیکل، تری تصویر ہے سلمیٰ

ادا اس طرح فرضِ رونمائی کچھ تو کر جاؤں!
تری تصویر سینے سے لگا لوں اور مر جاؤں!

سلمیٰ

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ!
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ!

شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارہ ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ!

جہانِ فارس کا تو ایک فردوسی فسانہ ہے

تجھے مصرِ جمال و ناز کی اک ساحرہ کہئے
صنم آبادِ عفت کی مقدس کافرہ کہئے
ربابِ حُسن کا تو ایک الہامی ترانہ ہے!
پرستانِ لطافت کی تو اک رنگیں کہانی ہے
جوانِ فطرت کا تُو اک گمشدہ خوابِ جوانی ہے

ایک دوست کی خودکشی پر

آرزو تھی، ہم بہم دیکھیں تماشائے فنا
تھی مقدر، لیکن اس کی ابتدا میرے لئے!
کتنی آساں ہو گئی راہِ فنا تیرے لئے!
کھنچ گیا آنکھوں میں نقشِ حُسنِ لیلائے فنا!
پی گیا تو بے تامل، جامِ صہبائے فنا!
خواب تھا، اک خواب، یہ ارض و سما تیرے لئے
ایک دھوکا تھا سکوں زارِ بقا تیرے لئے
جنبشِ خنجر میں پوشیدہ تھی دنیائے فنا!

غالب و خیام کے شعروں کا تو دیوانہ تھا!
جن کے دیوانوں میں اک کیفِ رواں ہو زندگی

طائرانِ رنگ و بو کا کارواں ہے زندگی
اُن کی طفلانہ بقا سے تو مگر بیگانہ تھا!
حُسن تھا مطلوب اُن کو عمرِ فانی کے لئے!
اور تیری موت، حسنِ جاودانی کے لئے!

ایک نوجوان بُت تراش کی آرزو!

ایک ایسا بت بناؤں کہ دیکھا کروں اُسے
آسودہ ہے خیال کا پیکر بنا ہوا
خوابِ عدم میں مست ہے جوہر بنا ہوا
اک مرمریں حجاب سے پیدا کروں اُسے
پھولوں میں جیسے جذبۂ نکہت نہفتہ ہو
یا جلوے بے قرار ہوں امواجِ رنگ میں
یوں اُس کی روح خفتہ ہے آغوشِ سنگ میں
ظلمت میں جیسے نُور کی صورت نہفتہ ہو

دن رات، صبح و شام، میں پُوجا کروں اُسے
میرا گدازِ روح، جبیں سے مچل پڑے
اس کی نظر سے جذبِ محبت اُبل پڑے

سازِ نفس کو توڑ کے گویا کروں اُسے
فن، خوابِ مرگ بن رہے ہے بت ساز کے لئے
دُنیا پکارتی رہے آواز کے لئے

"پ" کا نغمہ سن کر

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا
شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
افق پر موجزن مستانہ خوابوں کی ہوائیں ہیں

فضا میں بس رہی ہے نور کی آبادیاں گویا
خلا میں پُرفشاں ہیں حُسن کی شہزادیاں گویا
بہار و کیف سے لبریز فردوسی ہوائیں ہیں
اور اُن میں منتشر غمگین رُوحوں کی صدائیں ہیں

مہیا ہیں سکون و ہوش کی بربادیاں گویا

وہ دنیا ہے جہاں جنّت کے نظارے برستے ہیں
شفق کی سطح پر آبادہ خوابوں کے جزیرے ہیں
ستاروں کے سمندر، ماہتابوں کے جزیرے ہیں

بہاریں منظروں میں پھول اور تارے برستے ہیں

فضا ہے مست، موجِ نکہتِ بادِ بہاری ہے!
اور اس پہ تیرتا پھرتا ہوں میں بے اختیاری سے!

دُنیا کی بہاریں

یہ دُنیا، یہ منظر اور یہ رنگینی فضاؤں میں
یہ جلوے چاند سورج کے، یہ تابانی ستاروں کی
یہ نزہت لالہ زاروں کی یہ رفعت کوہساروں کی
یہ بھینی بھینی، آوارہ سی خوشبوئیں ہواؤں میں
یہ بکھری بکھری مستی جھومنے والی گھٹاؤں میں
یہ تیزی آبشاروں کی، روانی جوئباروں کی
یہ پھولوں کا ہجوم اور یہ لطافت سبزہ زاروں کی
یہ موسیقی جو رقصاں ہے پرندوں کی صداؤں میں

یہ نغمے، یہ ترانے، یہ شراب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکانوں کی، یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی، یہ صحبت نازنینوں کی
یہ عمریں، یہ بہاریں، یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خلد میں یارب! یہیں رہنے دے تو مجھ کو

یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو!

کلوپیڑا!

وادیٔ نیل پہ طاری تھا بہاروں کا سماں
جلوۂ سبزہ و گل سے تھیں فضائیں شاداب
نشّۂ بادِ بہاری سے ہوائیں شاداب

محوِ پرواز تھا رنگین ستاروں کا سماں
مائلِ رقص ہو جس طرح شراروں کا سماں
نورِ انجم سے تھیں منظر کی ادائیں شاداب
نکہت و رنگ کی آوارہ گھٹائیں شاداب

چار سو، بال فشاں میکدہ زاروں کا سماں

یک بیک اک شفق اندام ستارہ ٹوٹا!
بن کے اک غنچۂ زرکار گرا وادی میں!
اور اک خواب نما پھول گرا وادی میں!
دیکھتے دیکھتے نیرنگِ نظارہ لوٹا!
جلوۂ فطرتِ رنگیں کی تھی تنویر اُس میں
ایک عورت کی پریشان تھی تصویر اُس میں

عورت
(فنونِ لطیفہ کی دنیا میں)

کہیں وہ شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے
مصوّر کی نظر میں اس کی تصویریں پریشاں ہیں!
ادب کی محفلوں میں اس کی تنویریں پریشاں ہیں!
مغنّی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہے!
نقابِ ساز میں آہنگ ہو کر تھرتھراتی ہے!
نقوشِ آب و گِل میں اس کی تصویریں پریشاں ہیں
صنم سازوں کے دل میں اُس کی تفسیریں پریشاں ہیں
حریمِ رنگ و بو میں نشہ بن کر لہلہاتی ہے

ہر اک تصویر کے رنگوں میں نکہت اس کی آوارہ!
حسین اور خوشنما اشعار، شاداب اُس کے نغموں سے
ہمارے بربطوں کے تار بے خواب اس کے نغموں سے
بتوں کے مرمریں پردوں میں رنگت اس کی آوارہ!
غرض جب تک یہ دنیا اور اس کی خوشنمائی ہے
ہماری زندگانی بھر یہ عورت کی خدائی ہے

لالۂ صحرا

بہارِ صبحِ عریانی ہے، جسمِ یاسمیں اُس کا
لباسِ سادہ ہے تزئین کی صورت سے بیگانہ
یہ صحرائی حسینہ ہے ہر اک زینت سے بیگانہ
نہیں ممنون غازہ کا، جمالِ دل نشیں اُس کا
معرا ہے ہر آرائش سے حسنِ نازنیں اُس کا
تکلف سے بری اور ناز کی عادت سے بیگانہ
ہر اک رنگیں نظر، غمزے کی کیفیت سے بیگانہ
مگر ہے عشق سے لبریز، قلبِ آتشیں اُس کا

محبت، جب کسی کے جذبِ دل کو گدگداتی ہے
نہیں کرتی ہے فرقِ شہر و صحرا ماہتاب آسا
چلی آتی ہے ہر دوشیزہ کے دل میں حجاب آسا
اور اگر ساز کے تاروں کی تہہ میں مسکراتی ہے
فضا میں، موجزن، نغمات کا نظارہ ہوتا ہے
اور ایک اک نغمہ، سوزِ عشق کا گہوارہ ہوتا ہے

نوائے غیب

مجھے تاروں کی آبادی سے اک آواز آتی ہے
کوئی کرنوں کے بربط پر سنہری گیت گاتا ہے
اور اپنے گیت سے خوابیدہ دنیا کو جگاتا ہے
فضاؤں میں بہارِ کیف و نکہت مسکراتی ہے
خدائی سلسبیل بے خودی میں ڈوب جاتی ہے
یہ نغمہ روح کے پردوں کو جا کر گدگداتا ہے
اور اپنی مست لَے میں یہ سندیسہ لے کر آتا ہے
کہ فطرت اپنے شعرستان میں مجھ کو بلاتی ہے

یہ کون آباد ہے ان روشن و رنگیں ستاروں میں؟
ہے کس کا نورِ عریاں کہکشاں کی شاہراہوں پر؟
ہیں کس کے نغمے رقصاں ان طلائی جلوہ گاہوں پر؟
یہ کس کی لَے چھپی ہے بربطِ انجم کے تاروں میں؟
یہ کس کے جلوے مضطر ہیں قمر کے آبگینے میں؟
یہ کون آ کر سمایا جا رہا ہے میرے سینے میں؟

لالۂ طور

اختر شیرانی کے کلام کا تیسرا مجموعہ

نذر

"ش"

اے ہدہدِ صبا بہ سبا می فرستمت
بنگر کہ از کجا بہ کجا می فرستمت

زنہار عرضہ دہ بر جاناں پیام ما
(زینجا بہ آشیان وفا می فرستمت)

"در راہِ عشق" مرحلۂ قرب و بُعد نیست
می بینمت عیان و دعا می فرستمت

ہر صبح و شام قافلۂ از دعائے خیر
در صحبتِ شمال و صبا می فرستمت

در روئے خود تفرجِ صنعِ خدائے کُن
کائینۂ خدائے نما می فرستمت

تا لشکرِ غمت نکند ملکِ دل خراب
جانِ عزیزِ خود بفدا می فرستمت

ہردم غمِ فرست مراد بگو بساز
کایں تحفہ از برائے خدا می فرستمت

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می گویمت دعا و ثنا می فرستمت

تا مطرباں ز شوقِ منت آگہی دہند
نظم و غزل بہ ساز و نوا می فرستمت

جشنِ بہار

جب وادیٔ گل کے شعرستاں پر خاموشی چھا جاتی ہے
جب لیلیٔ شب کی زلفِ سیہ، سینے تک لہرا جاتی ہے
جب موجِ ہوائے ساحل کو، نشّوں بھری نیند آجاتی ہے
جب چاندنی دشت و گلشن میں موتی سے برسا جاتی ہے

جب زمزمۂ زارِ ہستی اک ہو کی بستی ہو جاتا ہے!
جب نیند کی گہری مستیوں میں سارا عالم سو جاتا ہے!

تب وادی کی کم سن کلیوں تک زہرہ کی شعاعیں آتی ہیں
اور ان کے رنگ و بو کے رسیلے پردوں میں بس جاتی ہیں
پھر شبنم بوسے لیتی ہے، ہستی کی بہاریں چھاتی ہیں
اور ماہوشانِ کاہکشاں، گل ہائے طلا برساتی ہیں

جس وقت یہ سب رنگینیاں اس وادی میں یک جا ہوتی ہیں
تب کلیوں کے رنگیں پہلو سے کچھ حوریں پیدا ہوتی ہیں!

پھر حوریں یہ ساری مل جل کر اک نغمۂ رنگیں گاتی ہیں
اور دائرے کی سی صورت میں سب رقص اپنا دکھلاتی ہیں
ایک ایک حوری جنبش سے، جنّت کے سمے برساتی ہیں
اور وادی ماہ و انجم کے نظّاروں کو شرماتی ہیں

سنسان فضا میں نغموں کا اک طوفان بپا ہو جاتا ہے
ویران ہوا میں رقص کا اک ہیجان بپا ہو جاتا ہے
یوں رات بھر ان کے مست ترانے جھومتے ہیں گلزاروں پر
اور رات بھر ان کا رقصِ بہاریں تیرتا ہے کہساروں پر
شاداب و حسیں رعنائیاں سی، چھائی رہتی ہیں تاروں پر
اک حشر سا نورِ و نکہت کا رہتا ہے بپا نظاروں پر
جب صبح کو سورج کی کرنیں مشرق سے اُبھر کر آتی ہے
تب شرم کی ماری یہ کلیوں کے پردوں میں چھپ جاتی ہے

خوش آمدید

شملے وہ ماہِ رواں آنے کو ہے
اس زمیں پر آسماں آنے کو ہے

بہرِ پابوسی بڑھا ابرِ بہار
وہ بہارِ گلستاں آنے کو ہے

جس سے مہکی مہکی ہوئی وادئ سندھ
آج وہ بوئے رواں آنے کو ہے

دامنِ صحرائے عرب کی کر کے سیر
میری سلمائے جواں آنے کو ہے

وادئ شملہ نہ ہو مغرور کیوں
اک ستارہ میہماں آنے کو ہے

وہ ہے زہرہ اور شملہ آسماں
زہرہ سوئے آسماں آنے کو ہے

وہ ہے اک چاند اور شملہ آسماں
چاند سوئے کہکشاں آنے کو ہے

وہ ہے اک حُور اور شملہ اک جناں
حُور پھر سوئے جناں آنے کو ہے

وہ ہے اک سرو اور شملہ گلستاں — سرو سوئے گلستاں آنے کو ہے
وہ ہے اک پھول اور شملہ باغباں — پھول سوئے باغباں آنے کو ہے
جس کے قدموں پہ فدا جانِ جہاں — آج وہ جانِ جہاں آنے کو ہے
زندگانی سے کہو، فانی ہے کیوں؟ — نورِ حسنِ جاوداں آنے کو ہے
ماہ و انجم سے کہو، سجدے کریں — وہ ملائک آستاں آنے کو ہے
طوطیانِ شملہ ہوں شکر شکن — بلبلِ شیریں زباں آنے کو ہے
شاعرانِ شہر سے جا کر کہو! — میرا الہامِ جواں آنے کو ہے
چشمِ انجم نے نہ دیکھا تھا جو حسن — آج وہ حسنِ رواں آنے کو ہے
اُس کا استقبال کرنے کے لئے — دولتِ ہر دو جہاں آنے کو ہے
اُس کا فرشِ راہ بننے کے لئے — خاک پر پھر کہکشاں آنے کو ہے
گردِ رہ سے پاک کرنے کے لئے — گیسوئے حورِ جناں آنے کو ہے
پائے زرّیں اُس کے دھونے کے لئے — سلسبیلِ زر فشاں آنے کو ہے
کیوں نہ شمشاد و صنوبر سر جھکائیں — آج وہ سروِ رواں آنے کو ہے
جا کے وادی میں بچھا دوں فرشِ گل — وہ سراپا پرنیاں آنے کو ہے
جو لٹاتا ہے بہارِ رنگ و بو! — پھر وہی ابرِ رواں آنے کو ہے
مستیاں سی ہیں فضا میں منتظر — اُس کی بوئے دلستاں آنے کو ہے
سندھ کے ساحل پہ لہراتا ہوا — رنگ و بو کا کارواں آنے کو ہے
دامنِ راوی کو مہکاتی ہوئی! — اک نسیمِ گل فشاں آنے کو ہے

شاخِ گل جھک کر نہ کیوں سجدے کرے — وہ بتِ نازک میاں آنے کو ہے
رنگ و بو کی داستاں کہیئے جسے — وہ مجسم داستاں آنے کو ہے
لعلِ لب، دیں نذرِ گل ہائے چمن — وہ گلِ شیریں دہاں آنے کو ہے
بے خودی میں کیوں نہ اختر جان دے
آج وہ جانِ جہاں آنے کو ہے!

اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اے عشق نہ چھیڑ آ آ کے ہمیں، ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ، یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر، بیداد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جس دن سے ملے ہیں دونوں کا سب چین گیا، آرام گیا
چہروں سے بہارِ صبح گئی، آنکھوں سے فروغِ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا، ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگیں نہ بنا، ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

ہم راتوں کو اُٹھ کر روتے ہیں، رو رو کے دعائیں کرتے ہیں

آنکھوں میں تصوّر، دل میں خلش، سر دُھنتے ہیں آہیں بھرتے ہیں
اے عشق! یہ کیسا روگ لگا، جیتے ہیں نہ ظالم مرتے ہیں

یہ ظلم تُو اے جلّاد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

یہ روگ لگا ہے جب سے ہمیں، رنجیدہ ہوں میں، بیمار ہے وہ
ہر وقت تپش، ہر وقت خلش، بیخواب ہوں میں، بیدار ہے وہ
جینے سے ادھر بیزار ہوں میں، مرنے پہ اُدھر تیار ہے وہ

اور ضبط کہے فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جس دن سے بندھا ہے دھیان ترا گھبرائے ہوئے سے رہتے ہیں
ہر وقت تصور کر کر کے شرمائے ہوئے سے رہتے ہیں
کملائے ہوئے پھولوں کی طرح کملائے ہوئے سے رہتے ہیں

پامال نہ کر، برباد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

بیدرد! ذرا انصاف تو کر، اس عمر میں اور مغموم ہے وہ
پھولوں کی طرح نازک ہے ابھی، تاروں کی طرح معصوم ہے وہ
یہ حسن ستم! یہ رنج غضب! مجبور ہوں میں! مظلوم ہے وہ

مظلوم پہ یوں بیداد نہ کر

اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اے عشق خدارا دیکھ کہیں، وہ شوخ حزیں بدنام نہ ہو
وہ ماہ لقا بدنام نہ ہو، وہ زہرہ جبیں بدنام نہ ہو
ناموس کا اس کے پاس رہے، وہ پردہ نشیں بدنام نہ ہو
اس پردہ نشیں کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اُمید کی جھوٹی جنت کے، رہ رہ کے نہ دکھلا خواب ہمیں
آئندہ کی فرضی عشرت کے، وعدوں سے نہ کر بیتاب ہمیں
کہتا ہے زمانہ جس کو خوشی، آتی ہے نظر کمیاب ہمیں
چھوڑ ایسی خوشی کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

کیا سمجھے تھے اور تو کیا نکلا، یہ سوچ کے ہی حیران ہیں ہم
ہے پہلے پہل کا تجربہ اور کم عمر ہیں ہم، انجان ہیں ہم
اے عشق! خدارا رحم و کرم! معصوم ہیں ہم نادان ہیں ہم
نادان ہیں ہم، ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

وہ راز ہے یہ غم آہ جسے، پا جائے کوئی تو خیر نہیں
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں آ جائے کوئی تو خیر نہیں
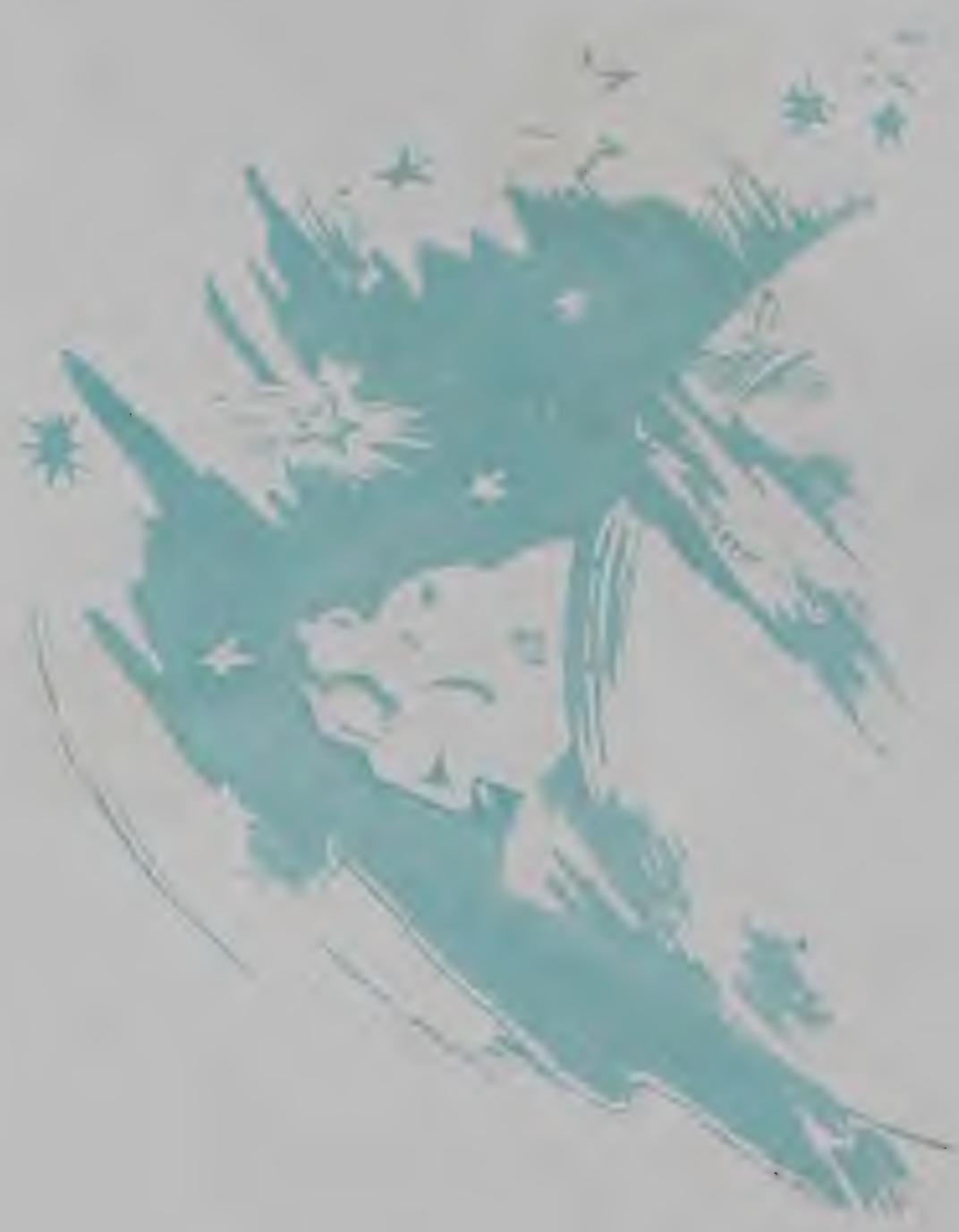
ظالم ہے یہ دنیا، دل کو یہاں بھا جائے کوئی تو خیر نہیں
ہے ظلم، مگر فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

وہ دن ہی ہیں عہدِ طفلی کے، معصوم زمانے بھول گئے
آنکھوں سے وہ خوشیاں مٹ سی گئیں لب کو وہ ترانے بھول گئے
اُن پاک بہشتی خوابوں کے، دل چسپ فسانے بھول گئے
ان خوابوں سے یوں آزاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اُس جانِ حیا کا بس نہیں کچھ، بے بس ہے پرائے بس میں ہے
بے درد دلوں کو کیا ہے خبر، جو پیار یہاں آپس میں ہے
ہے بے بسی زہر اور پیار ہے رس، یہ زہر چھپا اس رس میں ہے
کہتی ہے حیا فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

آنکھوں کو یہ کیا آزار ہوا، ہر جذبِ نہاں پہ رو دینا
آہنگِ طرب پر جھک جانا، آوازِ فغاں پر رو دینا
بربط کی صدا پر رو دینا، مطرب کے بیاں پر رو دینا
احساس کو غم بنیاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

ہر دم ابدی راحت کا سماں دکھلا کے ہمیں دلگیر نہ کر!
للہ حبابِ آبِ رواں پر نقشِ بقا تحریر نہ کر
مایوسی کے رمتے بادل پر امید کے گھر تعمیر نہ کر
تعمیر نہ کر ، آباد نہ کر!
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

جی چاہتا ہے اک دوسرے کو یوں آٹھ پہر ہم یاد کریں
آنکھوں میں بسائیں خوابوں کو اور دل میں خیال آباد کریں
خلوت میں بھی ہو جلوت کا سماں، وحدت کو دوئی سے شاد کریں
یہ آرزوئیں ایجاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

دنیا کا تماشا دیکھ لیا غمگین سی ہے بے تاب سی ہے
امید یہاں اک وہم سی ہے تسکین یہاں اک خواب سی ہے
دنیا میں خوشی کا نام نہیں، دنیا میں خوشی نایاب سی ہے
دنیا میں خوشی کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

(ریو فان کے ایک رند مگر محبِ وطن شاعر کے نقطۂ نظر سے)

پھر امن کی رنگیں وادی سے ہنگامۂ گیر و دار اُٹھا!
دنیائے سکوں کے پہلو میں سر فتنۂ حشر آثار اُٹھا
ہستی کے بہاریں مطلع پر پھر ابرِ شرارہ بار اُٹھا!

بے کار ہیں چنگ و ستار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

پھر کارگہِ انسانی پر خونخواری و وحشت پھیلی ہے
اقصائے زمیں ہے فتنوں سے پُر اور فتنوں کی ہیبت پھیلی ہے
یزداں کی حکومت مٹ سی گئی، شیطاں کی حکومت پھیلی ہے

پھر غلغلۂ تاتار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

پھر طبلِ وغا کا شور ہوا، آفاق کے ایواں کانپ اُٹھے
پھر باغ و گلستاں کانپ اُٹھے، پھر دشت و خیاباں کانپ اُٹھے
صحرا و قہستاں کانپ اُٹھے، دریا و بیاباں کانپ اُٹھے

آوازۂ گیر و دار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

مغرب کی فضائے بحری سے طوفاں کی صدائیں آتی ہیں
یا جوئے ہوا میں مرگ و ہلاکت کی پریاں لہراتی ہیں
اور برق و شرر کے سازوں پر اک نغمۂ خونیں گاتی ہیں

پھر صلصلۂ پیکار اٹھا
اُٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

سربازوں کے جنگی نعروں سے پھر ساحل و میداں گونجتے ہیں
طیاروں کی آتشباری سے دامن و کہستاں گونجتے ہیں
دریاؤں کی تہ میں موتوں کے بپھرے ہوئے طوفاں گونجتے ہیں

یا دیو شرار خوار اٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اٹھا

سُن وقت کی آواز آتی ہے وہ دورۂ غفلت ختم ہوا
ساغر کو اُلٹ، بربط کو اٹھا، ہنگامۂ عشرت ختم ہوا
جانبازی کی ساعت آپہنچی، رویائے محبت ختم ہوا

ہیں جام و سبو بیکار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پہلو سے ہٹا دے دستۂ گل ہنگامِ بہاراں رخصت ہے
نظروں میں ہے نقشہ میداں کا تزئینِ گلستاں رخصت ہے
پھر صبحِ قیامت آپہنچی، پھر لطفِ شبستاں رخصت ہے

پھر مہرِ قیامت بار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماد لفتائے آزادی
دل میرا نثارِ آزادی، جاں میری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لیں ہاتھوں سے لوائے آزادی

وہ ہلہلہ یلغار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

غیرت، کہ عدو کے نرغے میں ہے خاکِ وطن، بستانِ وطن
ناپاک قدم سے غیروں کے آلودہ نہ ہو میدانِ وطن
یہ عمرِ جواں گلبکارِ وطن، یہ عشقِ حسین قربانِ وطن

پھر ولولۂ پیکار اٹھا
اٹھ ساقی، اٹھ تلوار اٹھا

وہ دیکھ، وطن کی سرحد پر دشمن کے عساکر چھانے لگے
موجوں کی طرح بل کھانے لگے، طوفاں کی طرح لہرانے لگے
دامانِ افق سے طیارے آگ اور دھواں برسانے لگے

یا ابرِ سرِ کہسار اٹھا
اٹھ ساقی اُٹھ تلوار اٹھا

ہم مست ہیں لیکن تیغ بکف میدان میں جانے والے ہیں

اعدائے وطن کے سینوں پر بجلی سی گرانے والے ہیں
اور اُن کے وطن میں اُن کی جگہ فریادیں بسانے والے ہیں

یہ چنگ ہٹا ، یہ تار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

دشمن کا لہو پینا ہے ہمیں رہنے دے مئے گلفام نہ دے
تلوار اٹھانے والوں کے ہاتھوں میں چھلکتا جام نہ دے
صہبا کی جگہ رقصاں ہے لہو مستی کا فریبِ خام نہ دے

یہ جام مئے گلنار اٹھا!
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

ناموسِ وطن کو غیروں کے پنجے سے بچانے جاتے ہیں
مدّت سے ہیں پیاسی تلواریں پیاس اُن کی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل اُن کو دکھانے جاتے ہیں

لا برقِ فنا آثار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

وہ دیکھ اُس اونچی چوٹی سے جو دُور ، دکھائی دیتی ہے
لیلائے وطن کی درد بھری آواز سنائی دیتی ہے
جو اڑتے ہوئے پرچم کے تلے رو رو کے دہائی دیتی ہے

سُن ، حشر بسر کہسار اٹھا

اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

میں رک نہیں سکتا جاؤں گا اور دھوم مچاتا جاؤں گا
بربط کی طرح ان وادیوں میں تلوار بجاتا جاؤں گا
اس سازِ حسیں پر حبِ وطن کے نغمے سناتا جاؤں گا
بربط کو ہٹا، ہتھیار اُٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اُٹھا

اٹھ، نام و شرف کی موت اچھی، بے نام و شرف کے جینے سے
ہے خونِ عدو پینے میں سوا لذت مئے سادہ پینے سے
بپھری ہوئی اک مستانہ صدا آتی ہے فضا کے سینے سے
پھر عہد سرشار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پھر چشم براہ جرأت ہے لیلائے شہادت میداں میں
شاداب ہوا کرتی ہے سدا ہر قوم کی عظمت میداں میں
تلواروں کی خونیں بارش سے کھل جاتی ہے جنت میداں میں
گلہائے طرب کا ہار اٹھا
اٹھ ساقی اُٹھ، تلوار اٹھا

بجلی کی طرح رگ رگ میں رواں پھر عشقِ تپانِ ملت ہے
شیرانہ سوئے جنگاہ دواں ایک ایک جوانِ ملت ہے

اور قومی نشاں ہیں بال فشاں پھر شوکت و شانِ ملت ہے

وہ رایتِ عظمت بار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

خاموش کر اپنے بربط کو خوابوں کا اثر ہر تار میں ہے
وہ لطف کہاں اس ساز میں جو تلوار کی اک جھنکار میں ہے
ہنگامۂ قتل و غارت کا ارمان دلِ سرشار میں ہے

یہ بربطِ راحت بار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

ہشیار، کہ ہو جائے نہ کہیں پامال خزاں، گلزارِ وطن!
گلہائے ارم سے بڑھ کے ہمیں محبوب ہے اک اک خارِ وطن!
گہوارۂ ماہ و انجم ہے رفعت کدۂ کہسارِ وطن!

پھر دل میں سرِ پندار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

مانا کہ کوئی ذرہ بھی یہاں، آزادِ غمِ ایام نہیں
قابو میں کسی کے صبح نہیں، قبضے میں کسی کے شام نہیں
پر عشقِ وطن کے ماروں کا مرنے کے سوا کچھ کام نہیں

آنکھیں ہوئیں کیوں خونبار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ، تلوار اٹھا

نذرِ وطن

نذرِ وطن، پھر اسے دلِ دیوانہ چاہیئے
پھر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیئے

پھر سرزمیں وطن کی ہے نظروں کے سامنے
پھر لب پہ ایک نعرۂ مستانہ چاہیئے

بچپن کی یاد لیتی ہے پھر دل میں چٹکیاں
پھر بے خودئ محبتِ طفلانہ چاہیئے

برسوں کے بعد آئے ہیں باغِ وطن میں ہم
پھر ہر کلی کو سجدۂ مستانہ چاہیئے

کہسار سبزپوش نظر آئے دُور سے
پھر لب پہ چاربیت کا افسانہ چاہیئے

جس کوچے میں ہوئیں کبھی رسوائیاں نصیب
اُس کا طواف، با دلِ دیوانہ چاہیئے

بخشا تھا جس نے پہلے پہل، دل کو دردِ عشق
پھر اُس کے در پہ سجدۂ شکرانہ چاہیئے

مدت کے بعد سامنے ہوگی وہ شمع رو
پھر دل کو سوزشِ پرِ پروانہ چاہیئے

پھر دل کو ہو یقین نہ کسی کے وصال کا
پھر واقعہ بصورتِ افسانہ چاہیئے

پھر شوق سے ملیں گے کسی گلعذار سے
پھر لب پہ شورِ بلبلِ مستانہ چاہیئے

جھولا جھلائیں گے کسی مستِ شباب کو
رقصاں فضا میں پھر مئے میخانہ چاہیئے

پائے طلب کو وادیٔ پرویں ہے نیم گام
پھر آرزو کو منزلِ جانانہ چاہیئے

پھر حسنِ مہ وشوں کو ہیں درکار بجلیاں
پھر بے حجاب، جلوۂ جانانہ چاہیئے

پھر ذوقِ مےکشی کو ہے معراج کی طلب
کوثر کا بادہ، چاند کا پیمانہ چاہیئے

پھر شوق بن کے دل میں دھڑکتی ہے زندگی
پھر جنبشِ تبسمِ جانانہ چاہیئے

پھر سینۂ امید میں رقصاں ہے برقِ طور
پھر پرسشِ مذاقِ کلیمانہ چاہیئے

پھر سینۂ امید میں رقصاں ہے برقِ طور
پھر پرسشِ مذاقِ کلیمانہ چاہیئے
بالائے کوہ سایۂ ابرِ بہار میں
پھر دین و ماہتاب کا کاشانہ چاہیئے
پھر اس حریمِ نور کے آغوشِ ناز میں
اک گلکدہ برنگ پریخانہ چاہیئے
پھر ابر و باغ و نکہت و گل کے ہجوم میں
شمع و سرود و بادہ و پیمانہ چاہیئے
پھر اس کی چشمِ مست پہ گیسو ہوں پرفشاں
پھر ابر بر شام گوں سرِ میخانہ چاہیئے
پھر چاندنی میں دامنِ دریا پر اے ندیم
رقصِ شراب و گردشِ پیمانہ چاہیئے
جوشِ طرب نے حشر سا دل میں کیا بپا
پھر بے خودی کو گریۂ مستانہ چاہیئے

اختر، وطن میں آکے کھلا یہ حسین راز
اس مختصر سی عمر میں کیا کیا نہ چاہیئے

میرا موجودہ مشغلہ

زبانِ خامہ ہے پھر گل کھلانے کی تمنا ہے
کہ اک گلرخ نے پوچھا ہے "تمھارا شغل اب کیا ہے"

پریشاں حالیاں، اس پرسشِ احوال کے قرباں
مرا ہر شعر، اس کی زلف کے ہر بال کے قرباں
مری چشمِ حزیں اس دل ربا تحریر کے صدقے
دلِ دیوانہ، اس مشکیں ادا زنجیر کے صدقے
حسیں الفاظ میں جذبوں کا اک طوفاں پنہاں ہے

اثر سے جس کے دل میں بجلیوں کا جوش رقصاں ہے
جبینِ بندگی آمادہ ہے سجدے لٹانے کو
زبانِ شوق مضطر ہے سرودِ عشق گانے کو
دلِ مضطر کو ارماں ہے مچل کر خامہ بن جائے
تمنّا کو یہ حسرت ہے اُبل کر نامہ بن جائے
جنوں کہتا ہے پندارِ جنوں کی انتہا کر دوں
مہ و انجم کو اُس کے پائے نازک پر فدا کر دوں
جوانی مضطرب ہے شوق کا اظہار کر آؤں
اور اُس بلقیس وش کے گیسوؤں کو پیار کر آؤں
محبت مسکراتی ہے کہ ان کا سامنا ہوگا
تو دل ہی کو نہیں، دونوں جہاں کو تھامنا ہوگا
جنونِ بے خودی بس کر کہ عرضِ داستاں کر لوں
حضورِ حسن میں کچھ مشغلہ اپنا بیاں کر لوں
ادب سے جا کے کہنا اے صبا اُس شوخِ پُرفن سے
کہ رونا اور محبت مشغلہ ہے میرا بچپن سے
محبت کے لئے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کر لہلہاتی ہے مرے دل میں
ہر اک شاعر مقدر اپنا اپنے ساتھ لایا ہے

محبت کا جنوں تنہا مرے حصّے میں آیا ہے
محبّت ابتدا میری، محبت انتہا میری
محبت سے عبارت ہے بقا میری، فنا میری
محبت ہی مرے نزدیک معراجِ عبادت ہے
محبت ہی مرے نزدیک سرتاجِ عبادت ہے
محبّت مبتدا میرا، محبت منتہا میرا
حقیقت میں محبت ہی محبت ہے خدا میرا
محبت ہی مری طاقت، محبت ہی جوانی ہے
محبت گر نہ ہو، ویران میری زندگانی ہے
محبت میری دولت ہے، محبت میری عظمت ہے
محبت ہی سے مصرِ شعر پر میری حکومت ہے
محبت کتنی ہی بے مایہ ہو، شاہانہ رہتی ہے
خرابِ آبادِ دل میں صورتِ سلطانہ رہتی ہے
محبت ہی سے روشن جلوہ زارِ کبریائی ہے
محبت جس کو کہتے ہیں حقیقت میں خدائی ہے

شب و روز، اک نیا پیغام لاتے ہیں محبت کا
گل و انجم، مجھے نغمہ سناتے ہیں محبت کا
سحر کی حور، جب زلفِ سمن پر گنگناتی ہے

محبت رنگ ولو ہو کر فضا میں پھیل جاتی ہے
سرِ کہسار جب مستانہ بادل گھر کے آتے ہیں
محبت کے حسین اور خوشنما موتی لٹاتے ہیں
جواں مہتاب جب سطحِ فلک پر جگمگاتا ہے
محبت کی حسین و مرمریں کرنیں لٹاتا ہے
عروسِ شام، شرماتی ہے جب دن کے نظاروں سے
محبت نچی نظریں بن کے گرتی ہے ستاروں سے
سحر دم جب گھنی شاخوں میں چڑیاں چہچہاتی ہیں
محبت کی جہانگیری کے شیریں گیت گاتی ہیں
محبت ہی نے مجھ کو درسِ گل چینی سکھایا ہے
اور اک مدت سے اپنے باغ کا مالی بنایا ہے
وداعِ شب، اٹھاتا ہے پائیں باغ میں مجھ کو
ستارہ صبح کا پاتا ہے پائیں باغ میں مجھ کو
سحر خیزی مری پھولوں کو بیداری سکھاتی ہے
مری آمد نوا سنجانِ گلشن کو جگاتی ہے
خوشی کی بے خودی بے حد و بے اندازہ ہوتی ہے
فضاؤں سے لپٹ جانے کی حسرت تازہ ہوتی ہے
اور اس کے بعد میں ہوتا ہوں اور وجدان کا عالم

محبت، شاعری، احساس اور ہیجان کا عالم
مزا آتا ہے وہ رنگِ گل و آہنگِ بلبل میں
سحر سے شام کر دیتا ہوں اکثر گوشۂ گل میں
ہجومِ گل میں کھو جاتی ہیں اکثر چاندنی راتیں
مری معبود ہو جاتی ہیں اکثر چاندنی راتیں
چمن کے مست نظارے مجھے مسرور رکھتے ہیں
مرے دل کو گدازِ نغمہ سے معمور رکھتے ہیں
اسیرِ کیف کر دیتی ہے یہ پھولوں کی آبادی
مجھے خوشبو سے بھر دیتی ہے یہ پھولوں کی آبادی
شرابِ رنگ و بو ایسی برستی ہے نظاروں سے
لپٹ جاتا ہوں جوشِ بے خودی میں شاخساروں سے
ہر اک لمحہ چمن کا نشہ بن بن کر گزرتا ہے
کہ ہر پھول اور ستارہ جامِ مستی پیش کرتا ہے
اسی عالم میں یاد آتی ہیں کچھ بیتی ہوئی راتیں
جوانی کی بہاروں کا لہو پیتی ہوئی راتیں
گزشتہ زندگی دہراتے ہیں یہ چاند یہ تارے
سمے بچپن کے پھر دکھلاتے ہیں یہ چاند، یہ تارے
کہانی سی کوئی دہراتی ہیں یہ چاندنی راتیں

کہاں سے جا کے پھر لوٹ آتی ہیں یہ چاندنی راتیں
وہی ہیں چاند تارے اب بھی اور ویسی ہی رات اب بھی
مرا بچپن نہیں باقی وہی ہے کائنات اب بھی!
مجھے جب یادِ ماضی حال سے بیزار کرتی ہے
تو مستقبل کی امید آ کے دل کو پیار کرتی ہے
میں کھو جاتا ہوں آئندہ مسرت کے خیالوں میں
خوشی کا رنگ بھر دیتا ہوں ماضی کے ملالوں میں
محبت کی سی، کوئی چیز پیدا دل میں ہوتی ہے
ستارے توڑ لانے کی تمنا دل میں ہوتی ہے
خوشی کے جذبے طوفاں سے بسا جاتے ہیں سینے میں
زمین و آسماں آ کر سما جاتے ہیں سینے میں
مگر اک دل سمندر کا نشیمن بن نہیں سکتا
ذرا سا قطرہ طوفانوں کا مسکن بن نہیں سکتا
مرا دل ڈوبنے لگتا ہے اس انبارِ ارماں سے
یہ کشتی تہہ نشیں ہو جاتی ہے ٹکرا کے طوفاں سے
میں اس دھن میں مکان و لامکاں کو بھول جاتا ہوں
خیالِ گلستاں میں گلستاں کو بھول جاتا ہوں
غرض کیا پوچھتی ہو مشغلہ الفت کے ماروں سے

یہ وحشی کھیلتے رہتے ہیں پھولوں سے بہاروں سے

اور

اور اس وحشت میں چنتے پھرتے ہیں ہم پھول گلشن میں
صبا شاید گرا دے جا کر ان کو تیرے دامن میں

فراق

حیراں ہے آنکھ جلوۂ جاناں کو کیا ہوا

حیراں ہے آنکھ جلوۂ جاناں کو کیا ہوا
ویراں ہیں خواب گیسوئے رقصاں کو کیا ہوا
قصرِ حسیں خموش ہے ایوان پر سکوت
آواز ہائے سرو خراماں کو کیا ہوا
پردوں سے روشنی کی کرن پھوٹتی نہیں
اُس شمع رنگ و بوئے شبستان کو کیا ہوا
دنیا سیاہ خانۂ غم بن رہی ہے کیوں
اللہ! میرے ماہِ خراماں کو کیا ہوا
طوفاں اٹھا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں
اُس دستِ بزم و ساعدِ لرزاں کو کیا ہوا
نادان آنسوؤں کو ہے مدت سے جستجو
آرام گاہِ گوشۂ داماں کو کیا ہوا
سیراب کارئ لبِ گلگوں کدھر گئی
ہیں تشنہ کام ساغرِ جاناں کو کیا ہوا
کشتِ مراد ہو چلی نذرِ سمومِ غم
یارب نمودِ ابرِ خراماں کو کیا ہوا

روتا ہے بات بات پہ یوں زار زار کیوں
اختر خبر نہیں دلِ ناداں کو کیا ہوا؟

ساقی سے

(عالم رقص و نغمہ میں)

اٹھ ساقیِ گلفام، اٹھا پھول، اڑا پھول
بے تاب ہیں مے خوار، پلا پھول، لٹا پھول
ہاں پھول کھلا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ــــــــــــ لا پھول پلا پھول

دنیا کے ستم بھول، زمانے کے الم بھول
فریاد و فغاں کس لیے سنسار کے غم بھول
غم بھول، اڑا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ــــــــــــ لا پھول پلا پھول

مینا کی طرف گام بڑھا، گام بڑھا، گام!
لا جام بڑھا، جام بڑھا، جام بڑھا، جام
اور جام میں لا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ــــــــــــ لا پھول، پلا پھول

دل سرد ہے، دل سرد ہے، دل سرد ہے دنیا
بیدرد ہے، بیدرد ہے، بیدرد ہے دنیا
عشرت کے کھلا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ——————— لا پھول پلا پھول

تاروں سے مرصع ہو مئے ناب کا ساغر
ناہید کا پیمانہ ہو، مہتاب کا ساغر
ساغر میں کھلا پھول

اٹھ پھول اٹھا پھول ——————— لا پھول پلا پھول!

خاتمۂ جنگ

سامانِ بہار و طرب و رنگ کا دن ہے!
افسوں گری سازو نے و چنگ کا دن ہے!
دورِ مے و نوش لبِ گلرنگ کا دن ہے
لا جام کہ پھر نکہت و آہنگ کا دن ہے
اُٹھ ساقیا اُٹھ، خاتمۂ جنگ کا دن ہے

کیا کیا نہ کیا تنگ غم و کرب و بلا نے
کیا کیا نہ مظالم کیے اربابِ جفا نے
آخر سنی مظلوموں کی فریاد خدا نے
پھر امن کے نغماتِ خوش آہنگ کا دن ہے
اُٹھ ساقیا اُٹھ خاتمۂ جنگ کا دن ہے

جرمن ہوں کہ جاپانی ہوں، برباد ہوئے سب

جو ملک تھے قبضے میں وہ آزاد ہوئے سب
سُن کر خبرِ فتح کو دل شاد ہوئے سب
لا بادہ کہ پھر بادۂ افرنگ کا دن ہے
اُٹھ ساقیا اُٹھ خاتمۂ جنگ کا دن ہے

آزاد بلا ہو گئی لیلائے تمدن!
پھر جلوہ نما ہے رُخِ زیبائے تمدن!
لبریز مئے امن ہے مینائے تمدن:
لا بھر کے گلابی، مئے افرنگ کا دن ہے
اُٹھ ساقیا اٹھ! خاتمۂ جنگ کا دن ہے

پھر مطلعِ عالم سے چھٹے جنگ کے بادل
اللہ کی رحمت سے گھٹے جنگ کے بادل
پھر مشرق و مغرب سے ہٹے جنگ کے بادل
پھر فتح کا دن "فاتحۂ جنگ" کا دن ہے!
اٹھ ساقیا اٹھ! خاتمۂ جنگ کا دن ہے

گُل بانگِ قفس

مدت سے نہ آئی کوئی خبر، یارانِ گلستاں کیسے ہیں؟
اے بادِ صبا، اتنا تو بتا، سرو و گل و ریحاں کیسے ہیں

پابندِ قفس تو کیسے کہیں اور کس سے کہیں رودادِ قفس
آزادِ قفس بتلائیں ہمیں، اربابِ گلستاں کیسے ہیں؟

ہر ایک قدم یاں مجلسِ غم، ہر تازہ ستم اک مسترِ الم
اس حال میں پوچھیں کس سے یہ ہم، غمدیدہ کنعاں کیسے ہیں؟

ہمدرد ہے اپنا کون یہاں، لا تو ہی خبر اے بادِ خزاں
اس سال وطن کے باغوں میں گلہائے بہاراں کیسے ہیں؟

غربت ہی نہ تھی کم ہوش رُبا، اُس پر یہ اسیری رنج فزا
ہے کون جو پوچھے آکے ذرا، ہم خستہ تن حرماں کیسے ہیں؟

صیاد نے کیوں چُن چُن کے کیا، بے جرم و خطا محبوسِ بلا
ہے کس کو غرض، جو پوچھے ذرا، آبادِ یہ زنداں کیسے ہیں؟

اے موجِ نسیمِ صبحِ چمن، خوش باش، سنا پھر حالِ وطن
کہسار و دمن کس حال میں ہیں، وادی و خیاباں کیسے ہیں؟

کیا پوچھتی ہے اے شامِ قفس، افسانۂ رنگِ لیلیٰ چمن
ہم قیدیوں کو کیا علم کہ اب، گل کیسے ہیں گلستاں کیسے ہیں؟

گلبانگ قفس ہی بن جائے، اے کاش نوائے آزادی
کیا کہیے کہ اختر سینے میں مچلے ہوئے ارماں کیسے ہیں؟

آمدِ بہار

ہے فصلِ گرما قریبِ رخصت، فضائے عالم بدل رہی ہے
خیال ہوتا ہے بزمِ فطرت اک اور سانچے میں ڈھل رہی ہے
حسین چہروں پہ اب پسینہ سے غازہ کم چھوٹنے لگا ہے
سیاہ زلفوں کی چھاؤں میں پھر شگفتگی سی مچل رہی ہے
بہار آنے لگی ہے راتوں پہ کیف بن بن کے رفتہ رفتہ
برنگِ مہتاب، حورِ فطرت ادا سے رنگت بدل رہی ہے
ہواؤں میں سردی سی آ چلی ہے، فضا پہ مستی سی چھا چلی ہے
جوان راتوں کے گیسوؤں سے بہارِ تازہ ابل رہی ہے
صبا جب آتی ہے گلستاں سے، شبِ بہاراں کی کہکشاں سے
یہی گماں ہوتا ہے جہاں سے، پریٔ فطرت نکل رہی ہے
گداز ہونے لگا ہے پیدا سحر کے مستانہ منظروں سے
بہار کی روشنی سی بن بن کے روحِ انساں مچل رہی ہے
یہ مست و شوخ ادائیں اختر، یہ جہاں خزاں کائنات اختر
ادھر نظارے لٹا رہی ہے، ادھر ستارے اگل رہی ہے

پاؤں زخمی ہونے پر

یارب اول تو مرے زخم نہ آیا ہوتا
شدتِ درد نے اتنا نہ ستایا ہوتا!

یا یہ صورت تھی مناسب کہ مرا قلبِ رقیق
دردِ احساس سے تو نے نہ بنایا ہوتا

گر یہ ممکن نہ تھا یارب تو مرے سینے میں
میرا دل اپنا نہیں بلکہ پرایا ہوتا

یہ بھی مشکل تھا الٰہی تو مرے پاؤں کا زخم
ساتھ تیمور کی تقدیر بھی لایا ہوتا

یہ بھی امید سے بڑھ کر ہے تو میرے معبود
بارِ تن ہی کا سا حاصل مجھے پایا ہوتا

اور اگر زخم ہی آنا تھا بہر رنگ تو یہ
ملک کے واسطے، میدان میں آیا ہوتا

میدان کی آرزو

گل کی ہے آرزو نہ گلستاں کی آرزو
سینے میں حشر خیز ہے میداں کی آرزو

مردوں کو مطرب و مے و مینا سے کام کیا
ہے نبردِ تیغ و خنجرِ براں کی آرزو

ہے بارِ گوش، زمزمۂ سازِ دل نواز
بیتاب کن ہے نعرۂ میداں کی آرزو

ساقی سے مطلب اور نہ میخانہ سے غرض
سرباز کو ہے تیغ و پیکاں کی آرزو

کم ہمتوں سے کہہ دو کہ آئیں نہ میرے ساتھ
ہے مجھ کو جنگِ رستمِ دستاں کی آرزو

ہو سیلِ میکدہ کا اثر ہم پہ کیا مجال
لرزاں ہے دل میں خون کے طوفاں کی آرزو

پھولوں سے کھیلنے کا زمانہ گزر گیا
ہے دل کو جورِ خارِ مغیلاں کی آرزو

اختر کے نام میں بھی اثر "شیر" کا ہے پھر
کیوں ہو نہ جنگِ شیرِ نیستاں کی آرزو

بڑھے چلو
(ایک جنگی ترانہ)

دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
یلانِ زلزلہ فگن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
غضنفرانِ پیل تن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

سنو، سنو کہ وقت کا کچھ اور ہی پیام ہے
اٹھو، اٹھو کہ خطرے میں وطن کا ننگ و نام ہے
بڑھو، بڑھو کہ غازیوں کو بڑھنے ہی سی کام ہے
برنگِ جہلم و چمن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

رکو نہیں جو دشت و ریگ زار آئیں سامنے

بچو نہیں جو سیل و جوئبار آئیں سامنے
ہٹو نہیں، جو بحر و کوہسار آئیں سامنے
ہو راہ کتنی ہی کٹھن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

بڑھو کہ ڈھل چلا ہے دن، قریب وقتِ شام ہے
افق کے دست زرد میں، شفق کا سُرخ جام ہے
سوادِ غرب کو روانہ مہرِ تیز گام ہے
بڑھی شعاعِ ضوفگن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

اٹھو، کہ رزم گہ ہے پھر تمھارے انتظار میں
تڑپ رہی ہیں بجلیاں فضائے شعلہ کار میں
ہیں مضطرب شجاعتیں، سوادِ کارزار میں
مثالِ برقِ شعلہ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

بجا کہ راہ پُرخطر ہے اور اندھیری رات ہے

مگر تمھاری پاسباں، خدا کی پاک ذات ہے
اُسی کے اختیار میں حیات اور ممات ہے
کرو نہ فکرِ جان و تن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

تمھاری تیغِ تیز پر وطن کو افتخار ہے!
وطن کی مرگ و زیست کا تمھیں پہ انحصار ہے
تمھیں ہو جن کے دل میں اس کا عشق بیقرار ہے
لگائے دل میں یہ لگن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

اٹھاؤ تیغِ بے اماں، وطن کے پاک نام پر
لٹا دو عمرِ نوجواں، وطن کے پاک نام پر
نثار کر دو اپنی جاں، وطن کے پاک نام پر
صدائیں دیتا ہے وطن بڑھے چلو، بڑھے چلو
دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

وطن کی عظمتِ کہن، دکھا دو اس جہاں کو پھر

بدل دو اپنی ٹھوکروں سے گردشِ زماں کو پھر
برنگِ ابر نعرہ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

اگرچہ سام و تہمتن، زمانے سے گزر گئے
مگر سپاہیانہ زندگی سے نام اپنا کر گئے
بڑھو، کہ کوئی کہہ نہ دے یلانِ ہند ڈر گئے
مثالِ سام و تہمتن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

سنو! کہ آج خطرے میں، وطن کا نام و ننگ ہے
اٹھو، کہ چرخِ نیل فام کا کچھ اور رنگ ہے
چلو، کہ راہ سخت ہے، بڑھو کہ وقت تنگ ہے
بھلا کے فکرِ ما و من، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

بجا ہے یہ کہ سخت و صعب رہ گزار آئیں گے
درست ہے کہ دشت و راغ و ریگ زار آئیں گے

صحیح ہے جبال و قلعہ و حصار آئیں گے
جبیں پہ ہو نہ اک شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

تمھارے دم قدم ہی سے ہے شان و شوکتِ وطن
تمھاری تیغِ تیز ہے، نشانِ غیرتِ وطن
تمھی ہو عزّتِ وطن، تمھی ہو عظمتِ وطن
بڑھائے عظمتِ وطن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

تمھارے نعروں سے سوادِ کارزار کانپ اُٹھے
فضائے کارزار تھرتھرائے، کوہسار کانپ اُٹھے
ہر ایک قلعہ گونج اُٹھے، ہر اک حصار کانپ اُٹھے
مثالِ بحرِ جوش زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

سپاہیانہ زندگی جو قسمتِ سعید ہے
تو رزم گہ کی موت بھی سپاہیانہ عید ہے

جیا تو فخرِ قوم ہے، مرا تو وہ شہید ہے
سروں سے باندھ کر کفن بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

سوادِ جنگ کر رہا ہے، تیغ کا اشارہ پھر
وطن کی خاک دیکھتی ہے خونفشاں نظارہ پھر
افق پہ جگمگا رہا ہے فتح کا ستارہ پھر
بفضلِ ربِ ذوالمنن، بڑھے چلو، بڑھے چلو

دلاورانِ تیغ زن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بہادرانِ صف شکن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!

بادل

دھوم سی مچ گئی، کس دھوم سے آئے بادل — ساری دنیا کی فضاؤں پہ ہیں چھائے بادل
دل کو بھائے مری آنکھوں میں سمائے بادل!

سال بھر بعد بہاروں کے یہ دن پھر آئے — شوخ و شاداب نظاروں کے یہ دن پھر آئے
سال بھر بعد پھر اس رنگ کے آئے بادل

بادل آئے، بھری برسات کے ساماں لئے — اپنے دامن میں بہاروں کے شبستاں لائے
گل و گلشن کے لئے تازگی لائے بادل

کیف و مستی سے یوں جھومتے کیوں آئے ہیں باغ و کہسار کا منہ چومتے کیوں آئے ہیں
کیا کسی شوخ کا پیغام ہیں لائے بادل

یہ سماں دیکھ کے دل اپنا بھر آتا ہے کسی گل رخ کا تصور ہمیں تڑپاتا ہے
اختر اس حال میں ہم کو نہ ستائے بادل

برکھا رُت

گھٹاؤں کی نیل فام پریاں، اُفق پہ دھومیں مچا رہی ہیں
ہواؤں میں تھرتھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں

چمن شگفتہ، دمن شگفتہ، گلاب خنداں، سمن شگفتہ
بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں، پتیاں مسکرا رہی ہیں

یہ مینہ کے قطرے مچل رہے ہیں، کہ ننھے سیارے ڈھل رہے ہیں
اُفق سے موتی اُبل رہے ہیں، گھٹائیں موتی لٹا رہی ہیں

بہار ہندوستاں یہی ہیں، ہماری فصلوں کی جاں یہی ہیں
بہشت کو نشاں یہی ہیں، جو بدلیاں دل لبھا رہی ہیں

نہیں تو کچھ فرق بحر و بر میں، کھنچا ہے نقشہ یہی نظر میں
کہ ساری دنیا ہے اک سمندر، بہاریں جس میں نہا رہی ہیں

چمن ہے رنگیں، بہار رنگیں، مناظر سبزہ زار رنگیں
ہیں وادی و کوہسار رنگیں، کہ بجلیاں رنگ لا رہی ہیں

چمن میں اخترؔ بہار آئی، لہک کے صوتِ ہزار آئی
صبا گلوں میں پکار آئی، اُٹھو گھٹائیں پھر آ رہی ہیں

ننّھا قاصد

ترا ننھا سا قاصد، جو ترے خط لے کر آتا تھا
نہ تھا معلوم اُسے، کس طرح کے پیغام لاتا تھا
سمجھ سکتا نہ تھا وہ خط میں کیسے راز پنہاں ہیں
حروفِ سادہ میں کس حشر کے انداز پنہاں ہیں
اُسے کیا علم ان رنگیں لفافوں میں چھپا کیا ہے
کسی مہوش کا ان کے بھیجنے سے مدعا کیا ہے

مگر مجھ کو خیال آتا تھا اکثر اس زمانے میں
کہ اُس کی حیرتِ طفلی ہے کیوں گم اس فسانے میں
وہ با ایں کم سنی، کیا یہ نہ دل میں سوچتا ہوگا
کہ "باجی نے ہماری" اپنے خط میں کیا لکھا ہوگا؟
"اور آخر وہ اسی کو نامہ لکھ کر بھیجتی کیوں ہیں"؟
"کبھی بھیجا تو بھیجا لیکن اکثر بھیجتی کیوں ہیں"؟

"وہ پہلے سے زیادہ بھائی کو کیوں پیار کرتی ہیں"؟
"لفافہ دے کے لطفِ خاص کا اظہار کرتی ہیں"
پھر "ایسے اجنبی" پر اُس کی باجی مہرباں کیوں ہیں؟
"اگر ہیں بھی تو گھر والوں سے یہ باتیں نہاں کیوں ہیں؟"
اور اُس کے شبہے کی، اس سے بھی تو تائید ہوتی ہے
چھپا کر خط کو لے جانے کی کیوں تاکید ہوتی ہے؟
"یہ تو خیر اجنبی جانے کہاں سے اکثر آتا ہے"
"جب آتا ہے تو باجی کی طرح خط لکھ کے لاتا ہے"
"عزیزوں کی طرح یہ کیوں مکاں میں آ نہیں سکتا؟"
جب اُس سے پوچھتا ہے وہ اُسے سمجھا نہیں سکتا
کھلونے دے کر اُس کو مسکرا دیتا ہے وہ اکثر
اور اک ہلکا سا تھپڑ بھی لگا دیتا ہے وہ اکثر

ترے قاصد کے یہ افکار دل کو گدگداتے تھے
اور اپنے بھولپن سے میرے جذبوں کو ہنساتے تھے
نہیں موقوف اُنہی ایام پر جب بھی خیال آیا؛
تصور تیرے بعد اُس کا بھی نقشہ سامنے لایا!
مگر آج اس طرح دیکھا ہے وہ نقشِ حسیں میں نے

کہ رکھ دی خاکِ حیرت پر محبت کی جبیں میں نے
وہی ننھا سا قاصد نوجواں ہو کر ملا مجھ کو
زمانے کے تغیر نے پریشاں کر دیا مجھ کو
جنونِ ابتدائے عشق نے کروٹ سی لی دل میں
پس از مدت، یہ لیلےٰ آ گئی پھر اپنے محمل میں
ترے قاصد سے ملتے وقت مجھ کو شرم آتی تھی
مگر اُس کی نگاہوں میں شرارت مسکراتی تھی

شرارت کا یہ نظارہ مری حیرت کا ساماں تھا
کہ اس پردہ کے اندر نیز ارازِ عشق عریاں تھا

ایک پیغام!

(پائیں باغ سے)

مرے چمن کی فضا، تم کو یاد کرتی ہے
بہار اور اُس کی ہوا تم کو یاد کرتی ہے

ہر ایک پھول ہے مضطر گلے لگانے کو
ہر اک کلی کی ادا تم کو یاد کرتی ہے

جو چھیڑتی تھی تمھاری طلائی زلفوں کو
وہی شریر صبا تم کو یاد کرتی ہے

بسی ہوئی ہے جو اب تک تمھاری خوشبو سے
وہی مہکتی ہوا تم کو یاد کرتی ہے

چمن میں سر کو اٹھائے شجر ہیں چشم براہ | افق پہ مست گھٹا تم کو یاد کرتی ہے
ہر ایک شاخ کی زر بفتی سرسراہٹ میں | نسیم نغمہ سرا تم کو یاد کرتی ہے
وہ جس سے اب بھی چھلکتی ہے عہدِ رفتہ کی یاد | وہ بلبلوں کی نوا تم کو یاد کرتی ہے
جو گدگداتی ہے بچپن کے خواب بن بن کر | وہ بادلوں کی صدا تم کو یاد کرتی ہے
بہارِ رفتہ کی یادوں کا جو پرستاں ہے | وہ منظروں کی ادا تم کو یاد کرتی ہے
تمہاری اوڑھنی بچپن میں ہو گئی تھی جو گم | وہ آج بن کے گھٹا تم کو یاد کرتی ہے
وہ قمریوں کے ترانے وہ کوئلوں کی پکار | وہ صبح اور وہ صبا تم کو یاد کرتی ہے
گزار دیتے تھے ہم جس کی گود میں راتیں | وہ چاندنی وہ ضیا تم کو یاد کرتی ہے
جو پردہ بن کے گرا کرتی تھی شبستاں پر | وہ مشک فام گھٹا تم کو یاد کرتی ہے
وہ جس کے خوف سے اک دن تلاشِ پہلو تھی | وہ سرد سرد ہوا تم کو یاد کرتی ہے
نسیمِ صبح کی اٹھکھیلیوں کے پردے میں | کسی کی "شوخ" دعا، تم کو یاد کرتی ہے
تم ایک دن جسے سمجھی تھیں میرے غم کا غرور | وہ آنسوؤں کی حیا، تم کو یاد کرتی ہے
جفائے ناز کی عادت سہی، انھیں لیکن | مری غریب وفا، تم کو یاد کرتی ہے

ہے جس کی آرزو، اختر کو مدتوں سے مگر
ہوئی نہیں جو خطا، تم کو یاد کرتی ہے

فریبِ ہستی!

"ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے"
(غالب)

زندگیِ گزراں، عمرِ رواں کچھ بھی نہیں
ساقیا جام کہ بنیادِ جہاں کچھ بھی نہیں

اعتبارات پہ قائم ہے نظامِ ہستی
یہ زمیں کچھ بھی نہیں دورِ زماں کچھ بھی نہیں

ایک امیدِ خیالی پہ جیے جاتے ہیں
ورنہ بنیادِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں

کاکلِ دوست کا ہے ایک فریبِ رنگیں
ورنہ یہ سلسلۂ دورِ زماں کچھ بھی نہیں

نکہت و ناز و نواہائے حسیناں موہوم
کاکل و دیدہ و لبہائے بتاں کچھ بھی نہیں

زہرہ و ماہ و ثریا ہیں نگاہوں کی جھلک
آبِ جو، نکہتِ گل، بادِ وزاں کچھ بھی نہیں

لالۂ و یاسمن و گل ہیں بہاروں کا فریب
سبزۂ و گلکدۂ و جوئے رواں، کچھ بھی نہیں

سرو و شمشاد و صنوبر ہیں نظر کا دھوکا
شاخسار و چمن و آبِ رواں کچھ بھی نہیں

رنگِ زیبائشِ رنگیں بدناں، لاحاصل
طرزِ آرائشِ گل پیرہناں، کچھ بھی نہیں

شفق آرائیِ لعلِ لبِ میگوں، بے کار
غالیہ سائیِ گیسوئے بتاں کچھ بھی نہیں!

میکدہ کاریِ چشم و نظر، اک موجِ سراب
ارغواں زاریِ رخسار و دہاں کچھ بھی نہیں

مطربِ یکسن و آہنگِ کہن، سب بے معنی
ساغرِ کہنہ و ساقیِ جواں، کچھ بھی نہیں

بزمِ اسکندر و کاؤس ہے، لایعنی شے
تختِ مفقود و نیرہ و تاجِ کیاں کچھ بھی نہیں

حسنِ نو کچھ بھی نہیں، عشقِ جواں کچھ بھی نہیں

ہوش اے دل کہ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں

بلبلِ زار ہے فریاد و فغاں پر مجبور
گرچہ مستقبلِ فریاد و فغاں، کچھ بھی نہیں

ایک مستیٔ ابد ہے رگ و پے میں ساری
دل کی نظروں میں خراباتِ جہاں کچھ بھی نہیں

ایک موہوم سی منزل کی طرف ہیں راہی
زہرہ و ماہ و نجوم گزراں، کچھ بھی نہیں

اس زمانہ میں ہیں ایمان و وفا خوابِ کہن
بہ حقیقت بھی نہاں ہو کہ عیاں کچھ بھی نہیں

اور ہی چیز ہے جو دل میں اتر جاتی ہے
نطقِ بیتاب و لبِ شعلہ چکاں کچھ بھی نہیں

اور بھی "بخشش" ہیں مسجد میں عبادت کے سوا
اور صنم خانوں میں جز حسنِ بتاں کچھ بھی نہیں

زندگی ہی میں جو حاصل نہ ہو وہ کیا نعمت
وادیٔ کوثر و گلزارِ جناں، کچھ بھی نہیں

ایک ٹھوکر سے اڑا دیتے ہیں تختِ جم و کے
گو فقیرانِ درِ پیرِ مغاں، کچھ بھی نہیں

رات دن کشمکشِ رنج و الم ہے برپا
جان ہی کو نہ ہو راحت تو جہاں کچھ بھی نہیں

سبزۂ گور کی جنبش سے صدا آتی ہے
یہ جہاں آہ جہانِ گزراں، کچھ بھی نہیں!

کوئی شاداب حقیقت ہے تو ہے بزمِ مغاں
ورنہ اختر یہ جہانِ گزراں، کچھ بھی نہیں

طلوعِ محبت سے پہلے

جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

یہ زمیں سادہ تھی، جنت نہ ہوئی تھی پیدا
زندگی میں کوئی لذت نہ ہوئی تھی پیدا

ذہن اور فکر میں عظمت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک، دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

میرے افکار کے پھولوں میں بہار آئی نہ تھی
میرے اشعار میں رنگینی و رعنائی نہ تھی
میری تخئیل میں ندرت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

بے اثر تھی، مری نظروں میں ستاروں کی بہار
کتنی افسردہ تھی قدرت کے نظاروں کی بہار
کسی منظر میں لطافت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

آرزوئیں تھیں نہ یہ حُسن بھرا خواب اُن کا
نہ اُمنگیں تھیں، نہ یہ نشۂ شاداب اُن کا
کسی جذبے میں طراوت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

یہ جہاں سادہ تھا بے کیف فضا غمزدہ تھا
ایک اک ذرہ پریشان تھا، ماتم زدہ تھا
باغِ ہستی میں مسرت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

نہ گھٹاؤں میں تھا یہ رنگِ خراماں پہلے
نہ ہواؤں میں تھی یہ بوئے پرافشاں پہلے
رنگ و بو میں یہ حلاوت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

حسن خنداں تھا نہ دیوانے نظر آتے تھے
شمع روشن تھی نہ پروانے نظر آتے تھے
یہ جنوں اور یہ وحشت نہ ہوئی تھی پیدا!
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

مصرِ افکار تھا بیگانہ زلیخاؤں سے
میرے ارماں کدے محروم تھے سلماؤں سے
فکر اور شعر میں لذّت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

شیراں آئی تھی نہ ایراں کی فضا سے اب تک
کوئی بلقیس نہ اُٹھی تھی سبا سے اب تک
اور سلیماں کی عظمت نہ ہوئی تھی پیدا
جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں، جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں !
اور چوم آ جا کر روئے وطن، ابرِ دئے وطن، اے ابرِ رواں!
دامن میں چھپا لا، بوئے وطن، خوشبوئے وطن، اے ابرِ رواں!
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن، جا سوئے وطن اے ابرِ رواں!

اے ابرِ رواں !

اے ابرِ رواں، میرا غمِ دل، یارانِ وطن کو جا کے سُنا !
اس بلبلِ دشتِ غربت کا افسانہ چمن کو جا کے سُنا !
ہر سنبل و گل کو جا کے سُنا، ہر سرو و سمن کو جا کے سُنا !
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن، جا سوئے وطن اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں !

کہنا کہ دیارِ غربت میں اک غمزدہ روتا رہتا ہے
دن رات تمھاری فرقت میں منھ اشکوں سے دھوتا رہتا ہے
گلہائے محن کو آنسوؤں کے تاروں میں پروتا رہتا ہے
اے ابرِ رواں، جا سوئے وطن، جا سوئے وطن اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں !!

کہنا کہ وطن سے ہو کے جُدا، ہم سبز گلستاں کھو بیٹھے !

وہ صحنِ چمن، وہ جلوۂ مہ، وحسنِ بہاراں کھو بیٹھے
وہ شوخیٔ گل، وہ رنگِ سمن، وہ نکہتِ ریحاں کھو بیٹھے
اے ابرِ رواں جا سوئے وطن، جا سوئے وطن، اے ابرِ رواں

اے ابرِ رواں !!

کہنا کہ ہر اک راحت سے یہاں، بیگانہ سے ہیں، مہجور سے ہیں
قابو میں نہیں ہے یاد تری، اے خاکِ وطن مجبور سے ہیں
غمگیں سے ہیں، غمدیدہ سے ہیں، رنجیدہ سے ہیں رنجور سے ہیں

اے ابرِ رواں !!

نغمۂ بہار

پھر بہار آئی ہواؤں کو گل افشاں کردیں
ساغرِ حُسن و گل و نغمہ کو رقصاں کردیں
سوز و سازِ دلِ بے تاب کو ارزاں کردیں
ایک شعلے سے جہاں بھر میں چراغاں کردیں
گل و گلشن کو مے و میکدہ ساماں کردیں!
حُسن نوشابۂ بینائی کو عریاں کردیں
نرگس و زہرہ و مہتاب کو حیراں کردیں
باغ میں ساغرِ گل پوش کو رقصاں کردیں

شاہد و شمع کو دیں حکمِ چمن آرائی
نغمہ و نور بہم دست و گریباں کر دیں
رامش و رنگ کو بخشیں سر و برگِ معراج
نکہت و ناز کی پریوں کو پرافشاں کر دیں
راحت و راح و ریاحین کے صنم خانہ میں
مے و مستی و مسیحائی کو ارزاں کر دیں
پھول کے بدلے کریں شاخ پہ جام آویزاں
ساغروں کی جگہ پھولوں کو فروزاں کر دیں
شاخساروں پہ ہوں ناہید وشین نغمہ فشاں
اس ادا سے کہ عنادل کو بھی حیراں کر دیں
پھول برسائیں درختوں سے سمن رو، ہر سو
ایسی شوخی سے کہ تاروں کو پریشاں کر دیں
بام اشجار پہ بھی مست نوا ہوں، گل رُخ
اس حلاوت سے کہ بلبل کو غزلخواں کر دیں
شمع و فانوس سے آراستہ ہوں نخل و شجر
لالہ و گل کی بہاروں کو نمایاں کر دیں
سبزے کے فرش پہ گل در بر و ساغر در کف
ساقیانِ سمن اندام کو رقصاں کر دیں

شمع رو، ناز سے صف بستہ ہوں، بزمِ گل ہیں
سرو و ریحاں کی فضاؤں میں چراغاں کر دیں
دستِ ہر غنچہ میں اک جامِ طلائی رکھ دیں
کفِ ہر جام کو پھولوں سے گلستاں کر دیں
سایۂ زلف میں چہروں کو فروزاں کر کے
وادیٔ ابر میں انجم کو درخشاں کر دیں
ایک اک بال میں شبنم کے پرو دیں موتی
زلف کے شبکدے میں نور کا ساماں کر دیں
مرمریں سینے ہوں گلہائے شفق گوں سی عیاں
ارغواں زار میں روشن سمنستاں کر دیں
کبھی اس بُت کا گلِ عارضِ رنگیں چھو لیں
کبھی اُس شوخ کی زلفوں کو پریشاں کر دیں
مائلِ بندہ نوازی ہوں گل اندام ایسے
کہ خدائی میں خدائی کو بھی آساں کر دیں
ساغرِ گل میں پئیں بادۂ گلگوں پیہم!
اس لطافت سے کہ غنچوں کو بھی خنداں کر دیں
مطلعِ جام سے لہرا کے خوشی کی بجلی،
غم کو موجِ مئے گلرنگ میں پنہاں کر دیں

چھیڑ کر حور وشانِ حرم صومعہ کو
لالہ رویانِ خرابات کو خنداں کر دیں
مئے ہر رنگ ہو، ہر رنگ کی طلعت افشاں
بند شیشوں میں شگفتہ گل و ریحاں کر دیں
دل سے دارا و سکندر کے بھلا دیں قصّے
اس طرح رونقِ جام کو رقصاں کر دیں
عظمتِ فقر کے رخشندہ جمالوں کی قسم
ذرّے ذرّے کو حریفِ مہِ تاباں کر دیں
بے نوایانِ درِ پیرِ مغاں کو ہمدم
قیصرِ عالم و شاہنشہِ دوراں کر دیں
کر کے تقسیم، زرِ انجم و سیمِ مہتاب
دستِ مفلس کی طرح، چرخ کو ویراں کر دیں
بے نیازی سے نہ دیکھیں جم و کسریٰ کی طرف
بے رخی سے، ہتکِ خسرو و خاقاں کر دیں
ایک سلطان کو کشکولِ گدائی دے کر
ہر گدا کو کئی معموروں کا سلطاں کر دیں
ایک کیخسرو و خاقاں سے حکومت لے کر
کئی محتاجوں کو کیخسرو و خاقاں کر دیں

منتظر عالمِ نو کا ہے جہانِ کہنہ،
شبِ تیرہ سے عیاں، صبح درخشاں کر دیں
عدل کے نام سے یہ ظلم نہ ہوں دنیا میں
مورِ کمزور کو ہمتائے سلیماں کر دیں
شیخِ کعبہ کو سزا دیں یہ ریاکاری کی
جام درکف کسی بُت خانے میں رقصاں کر دیں
برہمن کو دیں یہ انعام شر انگیزی کا
کہ مقرر کسی مسجد کا نگہباں کر دیں
شہرت آئے تو اُسے بھیج دیں زاہد کی طرف
ہوس آئے تو کسی پیر پہ احساں کر دیں
دولت آئے تو اُسے بھیج دیں سوئے مفلس
ذلت آئے تو رواں جانبِ سلطاں کر دیں
حوریں آئیں تو اُنھیں بخش دیں ہم واعظ کو
کوثر آئے تو سوئے کعبہ خراماں کر دیں
قیس کی لے کسی جوشِ جنوں کے بدلے
لیلئ نجد کو رسوائے بیاباں کر دیں
دامنِ رنج رسیدہ کے سکوں کی خاطر
مثلِ گیسو، دلِ عذرا کو پریشاں کر دیں

دستِ فرہاد کے زخموں پہ رکھیں یوں مرہم
لبِ شیریں کو پُر از شورِ نمکداں کردیں
انتقامِ خلشِ قلبِ زلیخا کے لئے
پارہ پارہ، مہِ کنعاں کا گریباں کردیں
غیرت اے مے طلبی، المدد اے تشنہ لبی!
جامِ خالی سے بپا نوح کا طوفاں کردیں
جن سے برسات کی راتوں میں برستی ہے شراب
اُن گھٹاؤں کو فضاؤں میں خراماں کردیں
مریمِ توبہ گر اس بزم میں آنا چاہے
خیر مقدم کے لئے وا، درِ عصیاں کردیں
زلفِ شب بڑھنے نہ دیں تا بہ کمرِ حشر تلک
اور بڑھے تو اُسے شانوں پہ پریشاں کردیں
صبح کو بار نہ دیں تا ابد اس محفل میں
یا مقدر، درِ گلزار کا درباں کردیں
اس طرح اس ارمِ خواب نما میں اختر
اپنے افکار کی عذراؤں کو عُریاں کردیں

ایک خط!

اے روحِ قرارِ بے قراراں
سامانِ سکونِ دلِ فگاراں
اے مرکزِ انتظارِ آغوش
عیدِ نگہ و بہارِ آغوش
اے لالہ رُخ و چمن تماشا
رشکِ گل و یاسمن تماشا
اے صبحِ بہار و شامِ مہتاب
اے خوابِ شباب و عشقِ شاداب
اے رونقِ نو بہارِ بستر
اے طالعِ کامگارِ بستر
اے جشن گہِ سعیدِ پہلو
نورو زِ نگاہ و عیدِ پہلو
مدت سے نہ لی خبر ہماری
حسرت زدہ ہے نظر ہماری
اے جانِ عزیز و روحِ محبوب
عرصے سے نہ خط لکھا نہ مکتوب
پہلے تو یہ بے رخی نہیں تھی
الطاف میں یوں کمی نہیں تھی
محروم کرم نہ تھا دلِ زار
پامالِ الم نہ تھا دلِ زار
آخر کو یہ کج ادائیاں کیوں
ہم سے بے اعتنائیاں کیوں
اے جانِ بہار و روحِ گلشن
محروم ہے کیوں نظر کا دامن
دیدار کو دل ترس رہا ہے
آنکھوں سے لہو برس رہا ہے
اے ماہ رخ و ستارہ اندام
نیندیں ویران ہیں راتیں ناکام
صدمے ہم جھیلتے ہیں شب بھر
انگاروں سے کھیلتے ہیں شب بھر
اے رونقِ مہر و رشکِ مہتاب
دن کو مضطر ہیں شب کو بیخواب

کیوں ہو گئیں اس طرح خفا تم — رہنے لگیں ہم سے کیوں جدا تم؟
کیوں بھول گئیں، وفا کے انداز — سیکھے کس سے جفا کے انداز؟
دل ہجر میں خون ہو رہا ہے — بادل کی طرح سے رو رہا ہے
اب بھی جو ترس نہ کھاؤ گی تم
زندہ ہم کو نہ پاؤ گی تم!

بستی کی لڑکیوں کے نام
ایک شہری شاعر کا پیغام

اے صبا، گر بگذری بر ساحلِ رودِ ارس!
بوسہ زن بر خاکِ آں وادی و مشکیں کن نفس!

چل اے نسیمِ صحرا، روحِ روانِ صحرا — میرا پیام لے جا، سوئے بتانِ صحرا
صحرائی مہوشوں کی خدمت میں جا کے کہنا — بھولے نہیں تمھیں ہم، اے دخترانِ صحرا
گر بس چلے تو آئیں اور دردِ دل سنائیں — تم کو گلے لگائیں، ہم پھر میانِ صحرا
تم "نجد" میں پریشاں، شہر و نمیں ہم ہیں حیراں — اللہ کی اماں ہو تم پر بتانِ صحرا!
تم اُس طرف غموں سے بے حال ہو رہی ہو — ہم اس طرف ہیں مضطر، دامن کشانِ صحرا
ہم پاس آئیں کیوں کر، تم کو بلائیں کیونکر — یہ دکھ مٹائیں کیونکر، واماندگانِ صحرا
بیتاب ہیں الم سے، بیخواب رنج و غم سے — کیا پوچھتی ہو ہم سے، اے دلبرانِ صحرا

تم یاد کر رہی ہو، بیداد کر رہی ہو
برباد کر رہی ہو، اے گلرخانِ صحرا
یہ کیا کہا کہ "تم ہو رنگینیوں کے خوگر"
غمگیں ہیں تم سے بڑھ کر اے غمکشانِ صحرا
یہ رات یہ گھٹائیں، یہ شور، یہ ہوائیں
بچھڑے ہوئے ملیں گے کیونکر، میانِ صحرا
شہروں کی زندگی سے ہم تنگ آ چکے ہیں
صحرا میں پھر بلا لو، اے ساکنانِ صحرا
"بادِ سموم" ہو یا "صرصر کے تند طوفاں"
ڈرتے نہیں کسی سے دلدادگانِ صحرا
آبادیوں میں حاصل، آزادیاں نہیں ہیں
آجاؤ تم ہی اڑ کر اے طائرانِ صحرا
صحرا کی وسعتوں میں ہم کو نہ بھول جانا
او دخترانِ صحرا، او آہوانِ صحرا!
اے ابر چُپ نہ رہنا، میرا فسانہ کہنا
مل جائے گر کہیں وہ سروِ روانِ صحرا

وحشت کی دُھن میں ساقی، اک نغمۂ عراقی
ہاں پھر سنا بیادِ گل چہرگانِ صحرا

آنکھوں میں بس رہا ہے نقشِ بتانِ صحرا
او داستان سرا، چھیڑ، اک داستانِ صحرا
مستانہ جا رہا ہے پھر کاروانِ صحرا
ہاں جھوم کر حدی خواں اک داستانِ صحرا
دیہات کی فضائیں آنکھوں میں پھر رہی ہیں
دل میں سما رہی ہے یادِ بتانِ صحرا
نظروں پہ چھا رہا ہے وہ چاندنی کا منظر
صحرا میں کھیلتی تھیں جب حوریانِ صحرا
وہ چاندنی کا موسم، وہ بیخودی کا عالم
وہ نور کا سمندر، ریگِ روانِ صحرا
جلوے مہ جواں کے، وہ رنگ کارواں کے
وہ نغمے ساربان کے، رقصاں میانِ صحرا
کیونکر نہ یاد آئیں، وہ سیمگوں فضائیں
وہ آسمانِ صحرا، ماہِ روانِ صحرا
وہ کمسنوں کے گانے، وہ کھیل وہ ترانے
بے فکری کے فسانے، وردِ زبانِ صحرا

کھیتوں میں گھومتے تھے، ہر گل کو چومتے تھے
مستی میں جھومتے تھے جب میکشانِ صحرا
وہ گاؤں وہ فضائیں، وہ فصل، وہ ہوائیں
وہ کھیت وہ گھٹائیں، وہ آسمانِ صحرا
پھر یاد آ رہی ہیں، پھر دل دُکھا رہی ہیں
مجنوں بنا رہی ہیں، لیلےٰ وشانِ صحرا
رانوں کو چھپ کے آنا اور شانے کو ہلانا
ہے یاد وہ جگانا، ہم کو میانِ صحرا
وہ اُن کی شوخ آنکھیں، وہ ان کی سادہ نظریں
بیخود بنا رہی ہیں دوشیزگانِ صحرا
وہ عشق پیشہ ہوں میں، جس کے جوان نغمے
گاتا ہے چاندنی میں ہر نوجوانِ صحرا

اک بدویت کا عاشق، صحرائیت سے بیخود
اختر بھی اپنی دُھن میں ہے اک جوانِ صحرا

آزادی

صبا پلاتی ہے ہر وقت جامِ آزادی
شمیم لاتی ہے ہر دم، پیامِ آزادی
مہ و ستارہ کی آزاد کرنیں کہتی ہیں
پیامِ چرخِ بریں ہے، پیامِ آزادی
پکارتی ہے ہمالہ کی رفعتِ آزاد
کہ ہے ستاروں کا ہمسر مقامِ آزادی
چلی نسیم اٹھیں نکہتیں، اُڑے طائر
چمن میں دیکھے کوئی اہتمامِ آزادی
سبق یہ ملتا ہے دریاؤں کی روانی سے
جہاں میں کوئی نہ ہو تشنہ کامِ آزادی
جو بوالہوس ہیں وہ تکلیف اعتنا نہ کریں
مقامِ عیش نہیں ہے مقامِ آزادی
کرے نہ مرغِ چمن حوصلہ تو کس کا قصور
قفس سے دُور نہیں ہے مقامِ آزادی

ہو طعنہ زن کوئی کیوں ہم پہ حضرتِ اختر

غلام بھی ہیں تو ہم ہیں غلامِ آزادی

ابر سے

برس، نہ دیر کر اے ابرِ نوبہار برس — برس کہ دیر سے تھا تیرا انتظار برس!

برس، کہ سوز کا گہوارہ بن رہی ہے زمیں — برس، کہ تشنہ ہیں وادی و سبزہ زار برس

برس، کہ آگ برستی ہے کُل فضاؤں سے — برس کہ شعلے لٹاتے ہیں کوہسار برس

فسردگی سی ہے طاری گُلِ دریاچیں پر — الم زدہ سے ہیں اشجار و شاخسار برس

ترشح سے نہیں تسکینِ قلبِ سوزاں کو — برنگِ جوششِ طوفانِ آبشار برس

برس کہ رنگ ابھی بدلا نہیں درختوں کا — ہیں انتظارِ جدائی میں لالہ زار برس

برس کہ خاک کا دل ہو نہیں سکا سیراب — ہیں صیدِ تشنہ لبی، اب بھی غنچہ زار برس

برس نہ شہر پہ گر شہریوں کو نفرت ہو
مگر ہیں منتظرِ لطف، کاشتکار برس

مرنے کے بعد

چمن زار، شاداب و خنداں رہیں گے — درختوں پہ طائر غزل خواں رہیں گے

فضاؤں میں بادل پرافشاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

گھٹائیں گلستاں پہ چھایا کریں گی — فضائیں یونہی لہلہایا کریں گی

درختوں کے دامن گل افشاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
چمن کی فضائیں مہکتی رہیں گی صبا کے اثر سے لہکتی رہیں گی
گل و غنچہ و برگ رقصاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
یہ شہر اور دیہات بستے رہیں گے صداؤں سے معمور رستے رہیں گے
بپا زندگانی کے طوفاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
گھٹائیں یونہی گھر کے آیا کریں گی یونہی بلبلیں گیت گایا کریں گی
یونہی گلستاں، گل بداماں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
عروس سحر، روز آیا کرے گی فضا نور سے جگمگایا کرے گی
مناظر، سحر خیز و خنداں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے
یہ راتیں یونہی جھلملایا کریں گی ستاروں کی شمعیں جلایا کریں گی
سرِ چرخ روشن، چراغاں رہیں گے
مگر ہم تہِ خاک پنہاں رہیں گے

کہستاں سے چشمے اُبلتے رہیں گے سرِ راہ موتی بکھلتے رہیں گے
یہ سیلابِ سیمیں، خراماں رہیں گے
مگر ہم تہ خاک پنہاں رہیں گے
غرض یہ خدائی کے رنگیں نظارے یہ شام و سحر کے بہاریں نظارے
خرامان و رخشاں و رقصاں رہیں گے
مگر ہم تہ خاک پنہاں رہیں گے

میری داستانِ حیات

ستاروں کی کہانی کہیے، خوابوں کا بیاں لکھیے
وہ کہتی ہیں کہ اپنی زندگی کی داستاں لکھیے
ہماری زندگی، نیرنگیِ عالم کا منظر ہے
کبھی آرامِ دل کہیے، کبھی آزارِ جاں لکھیے
چمن میں برگِ گل پر قطرۂ شبنم جو لرزاں ہے
اُسے پیشِ نظر رکھیے، ہماری داستاں لکھیے
کبھی ہر سانس کو اک نکہتِ آبِ بقا کہیے
کبھی ہر لمحے کو پیغامِ مرگِ ناگہاں لکھیے
کبھی خوابِ زلیخا کہیے ہر شب کے نظاروں کو
کبھی افسانۂ یوسف بدستِ کارواں لکھیے

کبھی پھولوں کی سیجوں کو ہمارا داورِ سر کہیئے
کبھی جنگل کے کانٹوں کو ہمارا آشیاں لکھیئے

کبھی ہر لمحۂ غم کو خلاصہ کہیئے دوزخ کا
کبھی ہر فرصتِ رنگیں کو عمرِ جاوداں لکھیئے

کبھی بیگانگیٔ دیر و کعبہ کا بیاں کیجئے
کبھی افسانۂ رسوائیٔ کوئے بتاں لکھیئے

کبھی شادابیٔ گلہائے نو کا تذکرہ کیجے
کبھی افسانۂ بربادیٔ برگِ خزاں لکھیئے

کبھی پریوں کے سینوں کو ہمارا رازداں کہیئے
کبھی حوروں کے ہونٹوں کو ہمارا ہم زباں لکھیئے

کبھی سلمیٰ کے رومانِ حسیں کے تذکرے کیجے
کبھی عذرا کے افسانے کو عشقِ رائگاں لکھیئے

کبھی نسریں کی الفت کو گلے کا ہار کہہ لیجے
کبھی ریحانہ کی بدویتوں کو حرزِ جاں لکھیئے

کبھی پروین کی مرگِ عاشقی پر فاتحہ پڑھیئے
کبھی شمسہ کے زہر آلود ہونٹوں کا بیاں لکھیئے

کبھی حسنِ ثریا کو ہمارا آئینہ کہیئے
کبھی ناہید کے دل کو ہمارا آشیاں لکھیئے

کبھی شیریں کے مستانہ تبسم کا بیاں کیجیے
کبھی لیلے کے خونیں آنسوؤں کی داستاں لکھیے

کبھی دہرائیے قصہ جہانگیر ابنِ اکبر کا
کبھی اپنے اودھ کے جانِ عالم کا بیاں لکھیے

کبھی غالب کو اور مومن کو کہیے ہم صفیر اپنا
کبھی خیام و حافظ کو ہمارا ہم زباں لکھیے

الف سے ی تلک، القصہ جو بھی نام دلکش ہو
ہر اک سے بدگماں ہو کر، ہر اک کی داستاں لکھیے

کبھی فرطِ غم و آلام کو مہرِ زباں کہیے
کبھی افکارِ شعر و عشق کو جنبے رواں لکھیے

کبھی ہر بے دلی کو غم کا اک تحت الثریٰ کہیے
کبھی ہر آرزو کو ایک خوابِ کہکشاں لکھیے

کبھی ہر صبح کو دردِ خمارِ ناگہاں کہیے
کبھی ہر شب کو طوفانِ نشاطِ نوجواں لکھیے

کبھی جنت کی حوروں کو گدائے در سمجھ لیجے
کبھی مفلس گداؤں کو ہمارا ہم زباں لکھیے

غرض اختر کی ساری زندگی کا یہ خلاصہ ہے
کہ پھولوں کی کہانی کہیے، شعلوں کا بیاں کہیے!

شکستِ طلسم

عدو کی ہو چکیں جب تم تو دعویٰ کیوں ہے عفت کا؟
کسی کا ہو رہے کوئی تو پھر عفت کہاں باقی ؟
محبت کی لطافت، جسم کی عصمت کہاں باقی ؟
مری گستاخیوں سے پھر یہ شکوہ کیوں ہے عفت کا؟
تمھیں مجھ سے محبت تھی، مجھے تم سے محبت تھی!
میں سو جاں سے تمھاری عفتوں کی قدر کرتا تھا!
تمھاری عظمتوں کی، عصمتوں کی قدر کرتا تھا
تمھاری روح میں اور جسم میں جب تک لطافت تھی!
مگر اب جب، عدو کی ہو گئے، تم ان سب کو کھو بیٹھیں
تمھارا جسم جھوٹا ہو چکا، انکار بھی جھوٹے
تمھارے ہونٹ جھوٹے ہو چکے اور پیار بھی جھوٹے
تم اپنے ہاتھوں اپنی عفتوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں
تو پھر، مجھ کو، مجھ ہی کو شوق کیوں ہو پارسائی کا
تمھیں بھی چاہیے تھا پاس میری نارسائی کا

یادِ رفتہ

محبت کی امنگیں میرے دل کو گدگداتی ہیں
کہ اک بھولی ہوئی مہ رو کو جا کر پیار کر آؤں
سرورِ عشقِ رفتہ سے اسے سرشار کر آؤں

کہوں جا کر "تری پچھلی وفائیں یاد آتی ہیں،
تری نظریں تصور میں ابھی تک مسکراتی ہیں"

وہ نظریں، چاہتا ہوں پھر انھیں بیدار کر آؤں
جہاں بھر کے خیال و خواب سے بیزار کر آؤں

یہ بیخود آرزوئیں مجھ کو دیوانہ بناتی ہیں
مگر، پھر سوچتا ہوں، جاؤں کیونکر اُس کے ایواں تک

کہ اُس نے مدتوں سے اک نئی دنیا بسائی ہے
وہ دنیا آہ جو میری نہیں، ہمدم، پرائی ہے

تصور بھی پہنچ سکتا نہیں، جس کے شبستاں تک،
تو ہمدم، اپنے غم کا کس طرح اظہار کر آؤں؟
اور اُس بھولی ہوئی مہ رو کو کیوں کر پیار کر آؤں؟

انانیّت

چھا رہی ہوں پستیوں پر دیو داروں کی طرح
اور بلندی پر عقابِ پرفشاں کی شکل میں
اک نگاہِ بے صدا و بے نشاں کی شکل میں

سربلندی پائی ہیں نے کوہساروں کی طرح
کوہساروں سے بھی برتر، ابر پاروں کی طرح
حدِ آخر، میری طلعت آسماں کی شکل میں
عظمتوں سے کھیلتی ہوں کہکشاں کی شکل میں

خندہ زن ہوں بزمِ خاکی پر ستاروں کی طرح
رعد کی صورت گرجتی ہوں، بساطِ خاک پر
کانپ اُٹھتے ہیں سمندر جس سے وہ طوفاں ہوں میں
سینۂ ہستی کی اک فکرِ شرر افشاں ہوں میں

ہیں قدم میرے زمیں پر، سر مرا افلاک پر
صورتِ اندیشہ مستی میں بکھر جاتی ہوں میں
پردہ ہائے ماہ و انجم سے گزر جاتی ہوں میں

میرا راز!

تیرا دل، موسیقیٔ احساس کا اک ساز ہے

جس کی فریاد، اشکِ خونیں ہو کے بہہ سکتی نہیں
اور خموشی بن کے سینے میں بھی رہ سکتی نہیں

یعنی تیرے دل میں مضطر، کوئی غمگیں راز ہے
جو ہم آہنگِ فغاں ہو کر بھی بے آواز ہے

روح تیری جس کی بے تابی کو سہہ سکتی نہیں
اور کہنا بھی اگر چاہے تو کہہ سکتی نہیں

نالۂ مجبورِ سکوں، حالات کا اعجاز ہے!
لیکن اے شیریں، زمانے میں اک ایسا دل بھی ہے

جو ترے احساس کی آواز سے ہے آشنا
تیرے سازِ دل کے غمگیں راز سے ہے آشنا

جس کا اندازہ تجھے آساں بھی ہے مشکل بھی ہے!
محوِ حیرت ہو کے اب کیوں گوش بر آواز ہے؟
آہ، تیرے ساز کی تفسیر میرا راز ہے!

عشرتِ رفتہ

تجھے کیوں عشرتِ رفتہ کی یاد آتی ہے رہ رہ کر
مرے نادان دل کچھ تو بتا یہ ماجرا کیا ہے؟
پُرانے قصّے دہرانے سے آخر فائدہ کیا ہے؟
بتا ماضی کی دُھن کیوں اتنا تڑپاتی ہے رہ رہ کر؟

کسی کا حال دنیا میں کبھی یکساں نہیں رہتا
جہاں دیکھو تغیّر ہی تغیّر کی حکومت ہے
تغیّر، اصل ہستی ہے تغیّر اصل فطرت ہے
تغیّر ہو نہ جس انساں میں وہ انساں نہیں رہتا
خزاں کے بعد آتی ہیں بہاریں باغِ عالم میں
بہاریں ختم ہونے پر خزاں کا دور آتا ہے
چمن روتا ہے اک دن، دوسرے دن مسکراتا ہے
غرض عمریں گزر جاتی ہیں یوں شادی و ماتم میں

تو اپنے رنج کو راحت بنا سکتا نہیں اے دل!
بلا کر عشرتِ رفتہ کو لا سکتا نہیں اے دل!

دُنیا

تری دنیا میں گر مکار ہی مکار بستے ہیں!
تو میرا سینہ کیوں اخلاص سے معمور ہے یارب؟
مرا ہی دل مئے الفت سے کیوں مخمور ہے یارب؟
ترے خانۂ ہستی میں گر عیار بستے ہیں!
تری دنیا اگر بے درد انسانوں کا مسکن ہے!
تو مجھ کو کیوں کیا ہے دردِ دل سے آشنا تو نے؟
مجھ ہی کو کیوں بنایا پیکرِ رحم و وفا تو نے؟
تری دنیا اگر خونخوار حیوانوں کا مسکن ہے!
اگر اپنوں کے غم پر مسکراتے ہیں ترے بندے!
تو مجھ کو کیوں پرائے غم پہ بھی رونا سکھایا ہے؟
مری آنکھوں میں کیوں سارے جہاں کا دکھ بسایا ہے؟
اگر اس حال میں آنکھیں چراتے ہیں ترے بندے!
تری دنیا کی رونق، مکر، جھوٹ اور بیوفائی ہے!
یہاں تیری خدائی ہے کہ شیطاں کی خدائی ہے؟

عذرا!

پری وحور کی تصویرِ نازنیں، عذرا

شہیدِ جلوۂ دیدار کر دیا تُو نے!
نظر کو محشرِ انوار کر دیا تُو نے!

بہار و خواب کی تعبیرِ مرمریں، عذرا
شراب و شعر کی تفسیرِ دل نشیں، عذرا

دل و دماغ کو سرشار کر دیا تو نے
شباب و عشق کو بیدار کر دیا تو نے

مری حسین، مری نازہ آفریں عذرا
دیارِ دل میں تُو آئی بہار کی صورت!

گدائے حسن سے اظہارِ عشق تُو نے کیا
گناہگار سے اقرارِ عشق تو نے کیا

بسی دماغ میں کیف و خمار کی صورت

مٹا سکے گا نہ اب پیرِ آسماں مجھ کو
کہ ہے نصیب ترا عشق نوجواں مجھ کو

حوصلے

تو وہ خاک تھی یکسر تری دنیائے حیات!

خونِ دل سے، اسے گلزار بنایا میں نے
اپنے افکارِ جمالی سے بسایا میں نے

روشِ خلد کا محرم نہ تھا صحرائے حیات
زینت و ذوق سے بیگانہ تھی لیلائے حیات

نکہت و رنگ کا انداز بتایا میں نے
نغمہ و حُسن کا اعجاز سکھایا میں نے

رشکِ صد طور و ارم بن گیا سینائے حیات
تیری دنیا تھی محبت سے سراسر محروم

میں نے یہ وردِ حسیں آکے سکھایا اس کو
کیفِ صہبائے غمِ روح بتایا اس کو

ورنہ یہ خاک تھی لذّت سے سراسر محروم!
آخری پردہ بھی اک روز اُٹھا ہی دوں گا!
تیری صورت بھی زمانے کو دکھا ہی دوں گا!

زندگی

زندگی مست ہے اس طائرِ ناداں کی طرح
جو ہو تنہا نگراں دُور فضاؤں کی طرف
مہ و خورشید کی زرکار ضیاؤں کی طرف

محوِ نظارہ کبھی نرگسِ حیراں کی طرح
اور کبھی پال فشاں بُوئے خیاباں کی طرح
مُسکراتی ہوئی شاداب گھٹاؤں کی طرف
وادیٔ کوہ کی مستانہ ہواؤں کی طرف

نکہتِ گُل کدہ و سیلِ بیاباں کی طرح
آرزو اُڑنے کی کرتی رہے بے تاب سدا
پر نظر آئے نہ تسکین کا انداز اس کو
یونہی ترساتی رہے حسرتِ پرواز اس کو

نارسائی کی خلش سے رہے بیخواب سدا
کبھی آرام نہ دے حسرتِ پرواز جسے
اپنا انجام نظر آئے نہ آغاز جسے

اپنی موہوم محبوبہ سے

حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے ڈیڑھ سو سال قبل چین پر نوجوان شہنشاہ ووتی کی حکومت تھی۔ ایک دن یکایک اُس کی محبوبہ لی فوجین کا انتقال ہوگیا۔ شہنشاہ کو اُس کی دائمی مفارقت کا بےحد صدمہ ہوا۔ اُس نے ملک بھر کے نامور جادوگروں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور کہا کہ جس طرح بھی ہوسکے وہ لی فوجین کی روح سے اُس کی ملاقات کرائیں، کہتے ہیں کہ جادوگروں نے سچ مچ ایک پردہ میں پر شہنشاہ کی محبوبہ کا عکس دکھا دیا۔ ذیل کی نظم اس سوگوار شہنشاہ کی لکھی ہوئی ہے جس کے ایک ایک مصرعہ سے یاس و حسرت ٹپک رہی ہے

سرسراہٹ ریشمیں ملبوس کی خاموش ہے
فرشِ قصرِ مرمریں کا گرد میں روپوش ہے
پائے نازک کی صدا آتی نہیں ایوان سے
شمعِ زرّیں، خواب گہ کی، تیرگی بردوش ہے
بام و در پہ برگ ہائے خشک کے انبار ہیں
صحنِ گلشن غنچہ و گل سے تہی آغوش ہے
آہ وہ جانِ جہاں دنیا سے رخصت ہو چکی!
دل ہیں جو مہمانِ تُربت ہو چکی!

افکارِ پشتو!

جب التجائے بوسہ کی محبوبۂ طناز سے
ابریشمیں لب ہو گئے چسپیدہ باہم ناز سے
جیسے کوئی نازک کلی
نازاں مگر محجوب ہو

محبوبۂ شیریں ادا بستر پہ یوں خوابیدہ ہے
جیسے غزالِ نازنیں مدہوش و آرامیدہ ہے
پھولوں کی نازک سیج پر
جو روح کو مرغوب ہو

گر میرا تکیہ بن سکیں وہ بازوئے سیمیں کبھی
سر کو اٹھاؤں میں نہ پھر اے خاطرِ غمگیں کبھی
اس حال میں کیا سو گیا
تا حشر جو مطلوب ہو

طیور آوارہ

اختر شیرانی کے کلام کا چوتھا مجموعہ

چہرہ نما

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست
صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل است

(حافظ شیرازی)

جلوہ آنکھوں پہ چھا گیا کس کا؟

جلوہ آنکھوں پہ چھا گیا کس کا؟ شوق، دل میں سما گیا کس کا؟
صورت آنکھوں میں کھب گئی کس کی؟ نقش دل کو لبھا گیا کس کا؟
پھر کٹی ساری رات آنکھوں میں جلوہ پھر یاد آ گیا کس کا؟
میرے دل سے بھلا گیا سب کچھ یہ خیال آہ، آ گیا کس کا؟
شوق ہے پھر بھی دیکھنے کا اُسے شوق، مجنوں بنا گیا کس کا؟
یاد سب کچھ بھلا گئی کس کی؟ دھیان سب کچھ بھلا گیا کس کا؟
کس سے ملنے کی ہیں یہ تدبیریں؟ دل میں ارماں سما گیا کس کا؟
دل میں لی پھر حیا نے چٹکی سی لب پہ پھر نام آ گیا کس کا؟

بیٹھے بٹھلائے رو دیئے اختر
دھیان اس وقت آ گیا کس کا؟

شب کو پہلو میں جو وہ ماہِ سیہ پوش آیا!

شب کو پہلو میں جو وہ ماہِ سیہ پوش آیا
ہوش کو اتنی خبر ہے کہ نہ پھر ہوش آیا
بے خودی سمجھی، ہم آغوش ہوئی مجھ سے بہار
کچھ اس انداز سے وہ یاسمن آغوش آیا

جب نشاں تک نہ رہا قبر کا میری باقی
تب مری قبر پہ وہ زود فراموش آیا

پھول بکھراتا ہوا، نکہتیں برساتا ہوا
وہ سمن رنگ وسمن بوے وسمن پوش آیا

ماہ وانجم سے کہو، زینتِ کاشانہ بنیں
کہ پھر آغوش میں وہ عشرتِ آغوش آیا

اُن کا زانو تھا مرا سر، مرا دل ہات اُن کا
بے خودی تیرا بُرا ہو مجھے کب ہوش آیا!

دو گھڑی مل بھی گئی گر غمِ دنیا سے نجات
چٹکیاں لیتا ہوا دل میں غمِ دوش آیا

کس لئے رو دیئے یوں بیٹھے بٹھائے اختر
آج کیا یاد کوئی یادِ فراموش آیا؟

دل وماغ کو رو لوں گا، آہ کر لوں گا

دل و دماغ کو رو لوں گا، آہ کر لوں گا
تمھارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا

اگر مجھے نہ ملیں تم، تمھارے سر کی قسم!
میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا

مجھے جو دیر و حرم میں، کہیں جگہ نہ ملی
ترے خیال ہی کو سجدہ گاہ کر لوں گا
جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرفِ گناہ کر لوں گا
"رقیب" سے بھی ملوں گا، تمھارے حکم پہ میں
جواب تک نہ کیا تھا اب آہ کر لوں گا!
تمھاری یاد میں، میں کاٹ دوں گا حشر کے دن
تمھارے ہجر میں راتیں سیاہ کر لوں گا
ثواب کے لئے ہو جو گنہ وہ عین ثواب
خدا کے نام پہ بھی اک گناہ کر لوں گا
حریمِ حضرتِ سلمیٰ کی سمت جاتا ہوں
ہوا نہ ضبط تو چپکے سے آہ کر لوں گا
یہ نو بہار، یہ ابر و ہوا، یہ رنگِ شراب
چلو جو ہو سو ہو اب تو گناہ کر لوں گا
کسی حسینہ کے معصوم عشق میں اختر
جوانی کیا ہے میں سب کچھ تباہ کر لوں گا

مستانہ پیئے جا یونہی مستانہ پیئے جا

مستانہ پیئے جا، یونہی مستانہ پیئے جا
پیمانہ تو کیا چیز ہے، مے خانہ پیئے جا

کر غرقِ مئے و جام، غمِ گردشِ ایام
ہاں اے دلِ ناکام حکیمانہ پیئے جا

مے نوشی کے آداب سے آگاہ نہیں تو
جس طرح کہے ساقیٔ مے خانہ پیئے جا

کشکول ہو یا ساغرِ جم، نشہ ہے یکساں
شاہانہ پیئے جا کہ فقیرانہ، پیئے جا

اس ابر کی بستی میں ہے مستی ہی سے ہستی
دیوانہ بن اور بادلِ دیوانہ پیئے جا

ہر جام میں رقصاں ہے پریخانۂ مستی
آنکھوں سے لگا کر یہ پریخانہ پیئے جا

مے خانے کے ہنگامے ہیں کچھ دیر کے مہماں
ہے صبح قریب اخترِ دیوانہ پیئے جا

دلِ شکستہ حریفِ شباب ہو نہ سکا

دلِ شکستہ حریفِ شباب ہو نہ سکا
یہ جام ظرف نوازِ شراب ہو نہ سکا

کچھ ایسے رحم کے قابل تھے ابتدا ہی سے ہم
کہ اُن سے بھی ستمِ بے حساب ہو نہ سکا

نظر نہ آیا کبھی شب کو اُن کا جلوۂ رُخ
یہ آفتاب کبھی ماہتاب ہو نہ سکا

نگاہِ فیض سے محروم، برتری معلوم
ستارہ چمکا مگر آفتاب ہو نہ سکا

ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی
یہ سیلِ نور، ستم ہے شراب ہو نہ سکا

یہ مے چھلک کے بھی اُس حُسن کو پہنچ نہ سکی
یہ پھول کھل کے بھی اُس کا شباب ہو نہ سکا

کسی کی شوخ نوائی کا ہوش تھا کس کو
ہیں ناتواں تو حریفِ خطاب ہو نہ سکا

ہوں تیرے وصل سے مایوس اس قدر گویا
کبھی جہاں میں کوئی کامیاب ہو نہ سکا

وہ پوچھتے ہیں ترے دل کی آرزو کیا ہے
یہ خواب ہائے کبھی میرا خواب ہو نہ سکا

تلاشِ معنیٔ ہستی میں فلسفہ نہ خرد
یہ راز آج تلک بے حجاب ہو نہ سکا

شرابِ عشق میں ایسی کشش سی تھی اختر
کہ لاکھ ضبط کیا اجتناب ہو نہ سکا

دلِ مہجور کو تسکین کا ساماں نہ ملا

دلِ مہجور کو تسکین کا ساماں نہ ملا
شہرِ جاناں میں ہمیں مسکنِ جاناں نہ ملا

کوچہ گردی میں کٹیں شوق کی کتنی راتیں
پھر بھی اُس شمعِ تمنا کا شبستاں نہ ملا

پوچھنے منزلِ سلمیٰ کی خبر ہم جس سے
وادیٔ نجد میں ایسا کوئی انساں نہ ملا

یوں تو ہر راہ گزر پر تھے ستارے رقصاں
جس کی حسرت تھی مگر وہ مہِ تاباں نہ ملا

لالہ و گل تھے بہت عام چمن میں لیکن
ڈھونڈتے تھے جسے وہ سروِ خراماں نہ ملا

جس کے پردوں سے مچلتی ہو دبی نکہتِ شوق
بے خودی کی قسم ایسا کوئی ایواں نہ ملا

بختِ بیدار کہاں، جلوۂ دلدار کہاں
خواب میں بھی ہمیں وہ غنچۂ خنداں نہ ملا

بے کسی، تشنہ لبی، دردِ حلاوت طلبی
چاندنی راتوں میں بھی چشمۂ حیواں نہ ملا

یوں تو ہر در پہ لپکتے نظر آئے دامن
کھینچئے ناز سے جس کو وہی داماں نہ ملا

کس کے در پر نہ کیے سجدے نگاہوں نے مگر
ہائے تقدیر وہ غارت گرِ ایماں نہ ملا

کون سے بام کو رہ رہ کے نہ دیکھا لیکن — نگہِ شوق کو وہ ماہ خراماں نہ ملا

درِ جاناں پہ فدا کرتے دل و جاں اختر

وائے برحالِ دل و جاں، درِ جاناں نہ ملا

بے وفا کو عبث الزامِ جفا دینا تھا

بے وفا کو عبث الزامِ جفا دینا تھا — ہم ہی بھولے کہ تجھے دل سے بھلا دینا تھا

حُسن والفت میں نہیں تفرقۂ فردِ دوئی — جذبِ کامل کو یہ پردہ بھی اُٹھا دینا تھا

مبتلا ہو کے ترے عشق کی سرمستی میں — دل سے نقشِ غمِ ہستی کو مٹا دینا تھا

رسمِ فرہاد جو دنیا میں ابھی تک زندہ — یہ تماشا بھی کبھی اُن کو دکھا دینا تھا

ہو کے ناکام، ہوس کار بنے کیوں اختر

یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا

دل میں خیالِ نرگسِ جانانہ آگیا

دل میں خیالِ نرگسِ جانانہ آگیا — پھولوں سے کھیلتا ہوا دیوانہ آگیا

بادل کے اُٹھتے ہی مے و پیمانہ آگیا — بجلی کے ساتھ ساتھ پری خانہ آگیا

مستوں نے اس ادا سے کیا رقصِ نوبہار — پیمانہ کیا کہ وجد میں مے خانہ آگیا

اُس چشمِ مے فروش کی تاثیر کیا کہوں — آنکھوں تک آج آپ ہی پیمانہ آگیا

معلوم کس کو قیس کی دیوانگی کی شان — ہنگامہ سا بپا ہے کہ دیوانہ آگیا

اختر، غضب تھی عہدِ جوانی کی داستاں
آنکھوں کے آگے ایک پریخانہ آ گیا

جھوم کر اُٹھی ہے پھر کہسار سے کالی گھٹا

جھوم کر اُٹھی ہے پھر کہسار سے کالی گھٹا
کیسی مستانہ گھٹا ہے، کتنی متوالی گھٹا
دیکھنا کیسا یہ برکھا رُت نے جادو کر دیا
ہر کلی بجلی بنی ہے اور ہر ڈالی گھٹا
سبزہ و گل جھومتے ہیں، دشت و گلشن مست ہیں
مے کدے برسا رہی ہے ہو کے متوالی گھٹا
چھائی ہے کس دھوم سے گلزار و کوہ و دشت پر
آہ یہ پہلی گھٹا، رنگیں گھٹا، کالی گھٹا
اُن کی زُلفِ مشکبو کی بُو چُرا کر لائی ہے
ورنہ کیوں آتی ہے اتراتی ہوئی کالی گھٹا
سبز مخمل سی بچھی جاتی ہے فرشِ خاک پر
ہر طرف لہکا رہی ہے کیسی ہریالی گھٹا
دل سے آتی ہیں صدائیں، بیخودیِ شوق میں
میرے سینہ میں سما جائے یہ متوالی گھٹا

اُن کو بھی ہمراہ لے آتی تو کوئی بات تھی
ورنہ اختر سچ یہ ہے کس کام کی کالی گھٹا

وعدہ اُس ماہرو کے آنے کا

وعدہ، اُس ماہرو کے آنے کا
یہ نصیبہ، سیاہ خانے کا!

کہہ رہی ہے نگاہِ دُزدیدہ
رُخ بدلنے کو ہے زمانے کا

ذرّے ذرّے ہیں بے حجاب ہیں وہ
جن کو دعویٰ ہو منہ چھپانے کا

حاصلِ عمر ہے شباب، مگر
اک یہی وقت ہے گنوانے کا

چاندنی، خامشی اور آخرِ شب
آ! کہ ہے وقت دل میں آنے کا

ہے قیامت ترے شباب کا رنگ
رنگ بدلے گا پھر زمانے کا

تیری آنکھوں کی ہو نہ ہو تقصیر
نام رُسوا شراب خانے کا

رہ گئے بن کے ہم سراپا غم
یہ نتیجہ ہے دل لگانے کا

جس کا ہر لفظ ہے سراپا غم
میں ہوں عنوان اُس فسانے کا

اُس کی بدلی ہوئی نظر، توبہ!
یوں بدلتا ہے رُخ زمانے کا

دیکھتے ہیں ہمیں وہ چھپ چھپ کر
پردہ رہ جائے، منہ چھپانے کا

کر دیا خوگرِ ستم اختر
ہم پہ احسان ہے زمانے کا

آرزوٗ وصل کی، رکھتی ہے پریشاں کیا کیا

آرزوٗ وصل کی، رکھتی ہے پریشاں کیا کیا
کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا

غمِ عزیزوں کا، حسینوں کی جدائی دیکھی
دیکھیں، دکھلائے ابھی گردشِ دوراں کیا کیا

اُن کی خوشبو ہے فضاؤں میں پریشاں ہر سُو
ناز کرتی ہے ہوائے چمنستاں کیا کیا

دشتِ غربت میں رُلاتے ہیں ہمیں یاد آکر
اے وطن تیرے گل وسنبل وریحاں کیا کیا!

اب وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ ملاقاتیں ہیں
محفلیں، خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا

ہے بہارِ گل ولالہ، مرے اشکوں کی نمُود
میری آنکھوں نے کھلائے ہیں گلستاں کیا کیا

ہے کرم اُن کے ستم کا کہ کرم بھی ہے ستم
شکوے سُن سُن کے وہ ہوتے ہیں پشیماں کیا کیا

گیسو بکھرے ہیں مرے دوش پہ کیسے کیسے
میری آنکھوں میں ہیں آباد شبستاں کیا کیا

وقتِ امداد ہے اے ہمتِ گستاخیٔ شوق
شوق انداز ہیں اُن کے لبِ خنداں کیا کیا

سیرِ گل بھی ہے ہمیں باعثِ وحشت اخترؔ
اُن کی اُلفت میں ہوئے چاک گریباں کیا کیا

حزیں ہے، بیکس و رنجور ہے دل

حزیں ہے، بیکس و رنجور ہے دل
محبت پر مگر مجبور ہے دل

تمھارے نور سے معمور ہے دل
عجب کیا ہے کہ رشکِ طور ہے دل

تمھارے عشق سے مسرور ہے دل
ابھی تک درد سے معمور ہے دل

یہ کس کی مست آنکھیں یاد آئیں
کہ اتنا مست ہے مخمور ہے دل

کیا ہے یاد اُس یادِ جہاں نے
الٰہی کس قدر مسرور ہے دل

بہت چاہا نہ جائیں تیرے در پر
مگر کیا کیجیے مجبور ہے دل

فقیری میں اسے حاصل ہے شاہی
تمھارے عشق پر مغرور ہے دل

ترے جلوے کا ہے جس دن سے مسکن
جوابِ جلوہ گاہِ طُور ہے دل

دو عالم کو بھلا دیں کیوں نہ اخترؔ
کہ اُس کی یاد سے معمور ہے دل

تازہ بتازہ، نو بنو، جلوہ بجلوہ، چھائے جا

تازہ بتازہ، نو بنو، جلوہ بجلوہ، چھائے جا
پھولوں میں مسکرائے جا، تاروں میں جگمگائے جا

خواب و خیال کی طرح، آنکھ میں، دل میں آئے جا
آنکھ کو بے قراریاں، دل کو جنوں سکھائے جا

فتنۂ غم جگائے جا، حشرِ ستم اُٹھائے جا
نیچی نظر کیے ہوئے بام پہ مسکرائے جا

ساقیٔ دہر سے کہو، مستِ شرابِ غم ہیں ہم
شام و سحر پلائے جا، ظرف کو آزمائے جا!

میں ہوں وہ مست جس کو ہے کیف کی نذر تونے کا ذوق
شام و سحر کے جام ہیں، شمس و قمر پلائے جا

ہاں تجھے مجھ سے کیا غرض، میری خوشی سے کیا غرض
تُو تو نگاہ پھیر کر دُور سے مُسکرائے جا

دور جہاں سے ساقیا، سرد ہوا ہے دل مرا
برف و شراب کی جگہ، برق و شرر پلائے جا

طور خراب ہو نہ ہو، دید کی تاب ہو نہ ہو
کوئی جواب ہو نہ ہو، برقِ نظر گرائے جا

دل کی رگوں میں مطربؔ شعلے سے تیرنے لگے
بس یہی نغمہ گائے جا، بس اسی دُھن میں گائے جا

منزلِ ماہ و کہکشاں، وسعتِ نیم گام ہے
عشق کی راہ میں یہی نغمۂ شوق گائے جا

تیرے اور اُس کے درمیاں تیری خودی حجاب ہے
اپنا نشان کھوئے جا، اُس کا مقام پائے جا

بھولنے کا خیال بھی ایک طرح کی یاد ہے
ہم نہ بھلائے جائیں گے، لاکھ ہمیں بھلائے جا

نالۂ نیم شب مرا، سُن کے کسی نے دی صدا
طالبِ لذّتِ بقا، درد کو دل بنائے جا

دل مرا سر بسر گداز، تیری حیا عدوئے راز
مجھ سے بھی ضبطِ غم نہ ہو تو بھی نظر چرائے جا

سایۂ ابر ہے شباب، حاصلِ زندگی خراب
سازِ طرب بجائے جا، نغمۂ کیف گائے جا!

زندگیٔ دوام کیا، منّتِ صبح و شام کیا
عمر ہے مختصر تو ہو، عمرِ طرب بڑھائے جا

ہاں یونہی مطربِ فراق، نغمۂ دردِ اشتیاق
اس کے تصورات سے سینے کو جگمگائے جا

جام بہ جام، خُم بہ خُم، غُنچہ بہ غُنچہ، گُل بہ گُل
نکہت و رنگ لائے جا، نور و طرب پلائے جا
پردہ ہے عرضِ حال کا، نغمہ و شعر کی زباں
اختر غم نوا اُنھیں اپنی غزل سُنائے جا

کچھ اُڑا لو مزہ جوانی کا

کچھ اُڑا لو مزہ جوانی کا
کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
دھوم ہے اپنے عشق کی گھر گھر
حق ادا ہو گیا جوانی کا
جس کا پردہ ہو اُس کی باتیں ہیں
کیا کھلے بھید عمرِ فانی کا
کوئی لا دے زبانِ حال مجھے
شکوہ کرنا ہے بے زبانی کا
دن کو آہیں ہیں رات کو آنسو
عشق ہے کھیل آگ پانی کا
وہ جفا ہو کہ ہو وفا اختر
شکر ہے اُن کی مہربانی کا

کچھ تو تنہائی کی راتوں میں سہارا ہوتا

کچھ تو تنہائی کی راتوں میں سہارا ہوتا
تم نہ ہوتے نہ سہی، ذکر تمھارا ہوتا
ترکِ دنیا کا یہ دعوےٰ ہے فضول اے زاہد

بارِ ہستی تو ذرا سر سے اُتارا ہوتا
وہ اگر آ نہ سکے، موت ہی آئی ہوتی
ہجر میں کوئی تو غمخوار ہمارا ہوتا
زندگی کتنی مسرت سے گزرتی یارب
عیش کی طرح اگر غم بھی گوارا ہوتا
عظمتِ گریہ کو کوتاہ نظر کیا سمجھیں؟
اشک اگر اشک نہ ہوتا تو ستارا ہوتا
لبِ زاہد پہ ہے افسانہ، حُورِ جنّت
کاش اس وقت مرا انجمن آرا ہوتا
غمِ اُلفت جو نہ ملتا، غمِ ہستی ملتا
کسی صورت تو زمانے میں گزارا ہوتا
کس کو فرصت تھی زمانے کے ستم سہنے کی
گر نہ اُس شوخ کی آنکھوں کا اشارا ہوتا

کوئی ہمدرد زمانے میں نہ پایا اختر
دل کو حسرت ہی رہی کوئی ہمارا ہوتا

ہزار بزم مہیائے مرگِ نیم شبی است

ہزار بزم مہیائے مرگِ نیم شبی است — ہنوز مضطرب اسیرِ نوائے زیرِ لبی است

زبانِ شوق و گناہِ بیاں چہ بوالعجبی است
هنوز مطرب اسیرِ نوائے زیرلبی است

غرورِ عشق گدارا مجالِ شکوه و داد
ستارۂ سرِ مژگاں دعائے نیم شبی است

چہ طور ضبط کند رازِ ربطِ پنہاں را
نگاهِ شوق کہ مست ادائے بے ادبی است

ز دوستانِ منافق مداد چشمِ وفا
میانِ پیکرِ اسلام روح بولہبی است

دو چیز آں کہ جوان است ہم جوان سازد
نگاهِ شوخ و فسوں سازو بادۂ عنبی است

شہادتے است بآئینِ اختصاصِ کرم
جفائے دوست کہ آئینۂ وفاطلبی است

جوابِ شعرِ گرامی نوشتہ ام اختر
"اگرچہ عرضِ ہنر پیش یار بے ادبی است"

آتی ہے جھومتی ہوئی بادِ بہارِ عید!

آتی ہے جھومتی ہوئی بادِ بہارِ عید
مستِ طرب ہے آج ہر اک میگسارِ عید

لایا ہلال مژدۂ بے اختیارِ عید
شکرِ خدا کہ پھر نظر آئی بہارِ عید

دُنیا سرور و نُور کی موجوں میں غرق ہے
کس درجہ جاں فزا ہے نسیمِ بہارِ عید

کوثر لٹاتی آتی ہیں مستانہ بدلیاں
ہاں تشنہ لب رہے نہ کوئی میگسارِ عید

رحم اے ہوائے صبح، غریب الوطن ہیں ہم
ہم کو سنا نہ مژدۂ بے اختیارِ عید

معصوم بچے جاگتے ہیں کس خوشی سے آج
گویا کہ ہیں ملائکِ شب زندہ دارِ عید

بچھڑی ہوئی سہیلیاں یوں ملتی ہیں گلے
ہو جس طرح کہ عید کوئی ہمکنارِ عید

ان کی طرف گزر ہو تو کہہ دینا اے نسیم
کرتا تھا یاد آج کوئی سوگوارِ عید

کیا ظلم ہے کہ عید پہ بھی تو خبر نہ لے
وہ عمرت درانہ باد فراموش گارِ عید

خلقِ خدا ہے خوش تو ہمیں کیا ہوا کرے
ہم خستہ جاں تو ہجر میں ہیں دل فگارِ عید

اختر کا ہر تبسمِ عریاں فریب ہے
اس پردۂ طرب میں نہاں ہے مزارِ عید

گلزارِ جہاں میں گل کی طرح گو شاد ہیں ہم شاداب ہیں ہم!

گلزارِ جہاں میں گل کی طرح گو شاد ہیں ہم شاداب ہیں ہم
کہتی ہے یہ ہنس کر صبحِ خزاں سب نازِ عبث اک خواب ہیں ہم

کس ماہ لقا کے عشق میں یوں بے چین ہیں ہم، بے تاب ہیں ہم
کرنوں کی طرح آوارہ ہیں ہم، تاروں کی طرح بے خواب ہیں ہم
مٹ جانے پہ بھی مسرور ہیں ہم، مرجھانے پہ بھی شاداب ہیں ہم
شبہائے شباب و عشق کا اک بھولا ہوا رنگیں خواب ہیں ہم
فطرت کے جمالِ رنگیں سے، ہم نے ہی اٹھائے ہیں پردے
بربط ہے اگر فردوسِ جہاں اس کے لئے اک مضراب ہیں ہم
خوش وقتی ہے وجہِ رنج و الم، گلزارِ جہاں میں اے ہمدم
طائر نہ پکاریں شاد ہیں ہم، غنچے نہ کہیں شاداب ہیں ہم
ملنے پہ گر آئیں کوئی مکاں خالی نہیں اپنے جلووں سے
اور گوشہ نشیں ہو جائیں اگر، کمیاب نہیں نایاب ہیں ہم
دو دن کے لئے ہم آئے ہیں، اک شب کی جوانی لائے ہیں
فردوس سرائے ہستی میں ہم رنگِ گل مہتاب ہیں ہم
رسوائیٔ شعر و عشق نے وہ رتبہ ہمیں اختر بخشا ہے!
فخرِ دکن و بنگال ہیں ہم، نازِ اودھ و پنجاب ہیں ہم

لیلئ عشق کو درکار ہیں دیوانے چند

لیلئ عشق کو درکار ہیں دیوانے چند
نجد میں پھر نظر آنے لگے ویرانے چند

اللہ اللہ تری آنکھوں کا چھلکتا ہوا کیف
جیسے مستی میں الٹ دے کوئی پیمانے چند

اب بھی آغازِ جوانی کے فسانے ہیں یاد
اب بھی آنکھوں میں ہیں آباد پری خانے چند

چٹکیاں لینے لگا دل میں نشاطِ طفلی
آج یاد آ گئے بھولے ہوئے افسانے چند

دل کہیں رازِ محبت کو نہ کر دے افشا
آج محفل میں نظر آتے ہیں بیگانے چند

بجلیاں کالی گھٹاؤں میں ہیں یوں آوارہ
جیسے کہسار پہ رقصاں ہوں پری خانے چند

کیا کہوں کیا ہے خدا اور مذاہب کا ہجوم
اک حقیقت پہ ہیں چھائے ہوئے افسانے چند

حافظ و بیدل و خیام ہوں یا غالب و میر
بادۂ شعر کے ہیں بس یہی مستانے چند

بزمِ ہستی سے نکالے گئے اختر کیا جلد
ابھی پینے بھی نہیں پائے تھے پیمانے چند

پھر ستاتی ہے ہمیں گزری ہوئی راتوں کی یاد!!!

پھر ستاتی ہے ہمیں گزری ہوئی راتوں کی یاد!
آہ اُن راتوں کی یاد، اُن پیار کی باتوں کی یاد!

رات کے پردوں میں چھپ چھپ کر جو ہوتی تھیں کبھی
چٹکیاں لیتی ہے دل میں ان ملاقاتوں کی یاد

اب بھی آکر گدگداتی ہے بزمِ شوق کو
سایۂ گیسو میں شرمائی ہوئی راتوں کی یاد

لہلہا اُٹھتی ہے سینے میں بہارِ بےخودی
جب کبھی آتی ہے اُن رنگین برساتوں کی یاد

سینے میں دردِ فراق، آنکھوں میں جوشِ اشتیاق
اب بھی تڑپاتی ہے اُن غمگیں مناجاتوں کی یاد

عشق کی شادابیوں سے جو مہکتی تھیں کبھی
دل میں لہراتی ہے پھر اُن چاندنی راتوں کی یاد

کیا کہیں کس طرح سے اختر رلاتی ہے ہمیں!
عشق کی راتوں کی، باتوں کی، ملاقاتوں کی یاد

نکہتِ زلف سے نیندوں کو بسا دے آکر

نکہتِ زلف سے نیندوں کو بسا دے آکر
میری جاگی ہوئی راتوں کو سلا دے آکر

فکرِ فردا و غمِ دوش، بھلا دے آکر
پھر اسی ناز سے دیوانہ بنا دے آکر

عشق کو نغمۂ امید سُنا دے آکر
دل کی سوئی ہوئی قسمت کو جگا دے آکر

کس قدر تیرہ و تاریک ہے دُنیائے حیات
جلوۂ حسن سے اک شمع جلا دے آکر

عشق کی چاندنی راتیں مجھے یاد آتی ہیں
عمرِ رفتہ کو مری مجھ سے ملا دے آکر

زندگی بن کے مرے دل میں سما جا سلمیٰ
موت اک پردہ ہے یہ پردہ اُٹھا دے آکر

آگ سی دل میں لگا جاتا ہے تیرا ہر خط
آ مرے خرمنِ ہستی کو جلا دے آکر

تیری فرقت میں مرے شعر ہیں کتنے غمگیں
مسکراتی ہوئی نظروں سے ہنسا دے آکر

پھر وہی ہم ہوں، وہی دن ہوں، وہی راتیں ہوں
عہدِ رفتہ کو پھر آئینہ دکھا دے آکر

شوقِ نادیدہ میں لذت ہے مگر ناز نہیں
آ مرے عشق کو مغرور بنا دے آکر

شبِ فرقت پہ مری ہنستے ہیں اخترۂ نور
میرے قدموں پہ ستاروں کو گرا دے آکر

تشنۂ حسن ہوں اے ساقیٔ میخانۂ حسن
اپنے ہونٹوں سے پھر اک جام پلا دے آکر

کب تلک رونقِ شامِ اودھ اے ماہ رواں؟
شامِ لاہور کو بھی صبح بنا دے آکر

ہو چکی سیرِ بہاراں کدۂ قیصر باغ
باغِ لارنس میں بھی پھول کھلا دے آکر

گومتی دیکھ چکی جلوۂ عارض کی بہار
سطحِ راوی کو بھی آئینہ بنا دے آکر

تیرا ارمان نیا خواب ہے اختر کے لئے
آ! اور اس خواب کی تعبیر بتا دے آکر

غم خانۂ ہستی میں ہیں مہماں کوئی دن اور!

غم خانۂ ہستی میں ہیں مہماں کوئی دن اور
کر لے ہمیں تقدیر پریشاں کوئی دن اور
مر جائیں گے جب ہم تو بہت یاد کرے گی
جی بھر کے ستا لے شبِ ہجراں کوئی دن اور
تربت وہ جگہ ہے کہ جہاں غم ہے نہ حیرت
حیرت کدۂ غم میں ہیں حیراں کوئی دن اور
یاروں سے گلہ ہے نہ عزیزوں سے شکایت
تقدیر میں ہے حسرت و حرماں کوئی دن اور
پامالِ خزاں ہونے کو ہیں مست بہاریں!
ہے سیرِ گل و حُسنِ گلستاں کوئی دن اور
ہم سا نہ ملے گا کوئی غم دوست جہاں میں
تڑپا لے غمِ گردشِ دوراں کوئی دن اور
قبروں کی جو راتیں ہیں وہ قبروں میں کٹیں گی!
آباد ہیں یہ زندہ شبستاں کوئی دن اور
رنگینی و نزہت ہے نہ مغرور ہو بلبل!
ہے رنگِ بہارِ چمنستاں کوئی دن اور

آخر کو وہی ہم، وہی ظلماتِ شبِ غم!
ہے نورِ رخِ ماہِ درخشاں کوئی دن اور
آزاد ہوں عالم سے، تو آزاد ہوں غم سے
دنیا ہے ہمارے لئے زنداں کوئی دن اور
ہستی کبھی قدرت کا اک احسان تھی ہم پر
اب ہم پہ ہے قدرت کا یہ احساں کوئی دن اور
لعنت تھی گناہوں کی ندامت مرے حق میں
ہے شکر کہ اس سے ہیں پشیماں کوئی دن اور
شیون کو کوئی خلد بریں میں یہ خبر دے
دنیا میں اب اختر بھی ہے مہماں کوئی دن اور

شعر میں ذکر کسی کا دلِ ناکام نہ کر!

شعر میں ذکر کسی کا دلِ ناکام نہ کر
اُس نے لکھا ہے کہ یوں تو ہمیں بدنام نہ کر
ہر ہوس پیشہ کو ہو جائے نہ الفت کا گماں
اپنے الطاف کو اُو جانِ جہاں عام نہ کر
ہر قدم آگے بڑھے ہمت مردانۂ دل
عشق کی راہ میں فکرِ سحر و شام نہ کر
جس نے خود عشق کا آغاز کیا ہے یارب
کاش یہ بھی وہی کہہ دے غمِ انجام نہ کر
کوئی ہمدرد ہو کیسے کسی کمزور ہی کا!
دلِ ناداں گلۂ گردشِ ایام نہ کر
حشر میں ملنے کی اُمید تھی وہ بھی نہ رہی
وہ یہ کہتی ہیں کہ ناحق طمعِ خام نہ کر

غیرتِ حُسن کو منظور نہیں رُسوائی
آج ہی آج کے دم سے ہے بہارِ ہستی
ناز سے گیسوئے سلمیٰ پہ بڑھا ہاتھ اختؔر

ضبط اے عشق اِس افسانے کو یوں عام نہ کر
فکرِ فردا نہ کر، اندیشۂ انجام نہ کر
یوں گدایانہ تماشائے لبِ بام نہ کر

سوز پھر چھیڑتا ہے رُوح کا ساز

سوز پھر چھیڑتا ہے رُوح کا ساز
دل نے کھائے بہت فریبِ مجاز
قبر پہ آیا ہے وہ پیکرِ ناز
زندگی کی حقیقت آہ نہ پوچھ
آہ! اے عمرِ رفتہ تنہا ہوں!

ذرّہ ذرّہ ہے اک نوائے گداز
آہ او فطرتِ بہانہ طراز
عمرِ رفتہ کو دے کوئی آواز
موت کی وادیوں میں اک آواز
موت کی گھاٹیوں سے دے آواز

آج کہتے ہیں مر گیا اختؔر!
آہ! وہ عشق پیشہ شعر طراز!

نگہِ شوق ہے زبانِ خموش!

نگہِ شوق ہے زبانِ خموش
خوابِ نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار
آہ وہ جذبِ دل کی پہلی نگاہ
تم کو اختؔر بھی یاد آتا ہے!

عشقِ رسوا کی داستانِ خموش
نور و نکہت کی داستانِ خموش
وہ محبت کی چیستانِ خموش
کھویا کھویا سا وہ جوانِ خموش

ہر ذرّہ اُس کے حُسن سے روشن ہے آج کل!

ہر ذرّہ اس کے حسن سے روشن ہے آج کل
امرتسر ایک وادیٔ ایمن ہے آج کل!
اُس حُسنِ بے پناہ نے بے خانماں کیا
جو رہنما تھا عشق میں رہزن ہے آج کل!
جس آستاں کو سجدۂ پرویں بھی بار تھا
وہ آستاں جبیں کا نشیمن ہے آج کل!
راتوں پہ چاندنی ہے، فضا پُر بہار ہے
وحشت ہے، ہم ہیں، دامنِ گلشن ہے آج کل!
ہر گام پر سُرورِ ابد کی تجلیاں!!
عالم تمام عالمِ ایمن ہے آج کل!
پھر بُوئے گل سے آتی ہے اُس گُل بدن کی بُو
پھر دل میں سیلِ خودیٔ کا نشیمن ہے آج کل!
بعد از غمِ جدائیٔ عذرا مرے لئے!
یادِ نہ بود روما تمِ شیون ہے آج کل!
پیرِ فلک نے عیش کے بدلے دیا ہے غم
جو دوست تھا کبھی وہی دشمن ہے آج کل!

چشمِ قمر کو بھی مرے خوابوں پہ رشک ہے!
پیشِ نظر ترا رخِ روشن ہے آج کل!
کس نوبہارِ ناز نے جلوہ دکھا دیا!
لبریزِ گُل نگاہ کا دامن ہے آج کل!
اپنے نیاز پر مجھے پھر ہو چلا ہے ناز!
اک مہ جبیں کے سینے میں مسکن ہے آج کل!
پھر خُلد بن گئی ہے خدائی مرے لئے
اک حور وش کے دل میں نشیمن ہے آج کل!
اخترؔ پھرے نہ کس لئے آوارہ سا یہاں!
امرتسر اُس پری کا نشیمن ہے آج کل!

آؤ بے پردہ تمہیں جلوۂ پنہاں کی قسم!

آؤ بے پردہ تمہیں جلوۂ پنہاں کی قسم!
ہم نہ چھیڑیں گے ہمیں زلفِ پریشاں کی قسم!
چاکِ داماں کی قسم، چاکِ گریباں کی قسم!
ہنسنے والے تجھے اس حالِ پریشاں کی قسم!
میرے ارمان سے واقف نہیں شرمائیں گے آپ!
آپ کیوں کھاتے ہیں ناحق مرے ارماں کی قسم

نیند آئی نہ کبھی تجھ سے بچھڑ کر ظالم!
اپنی آنکھوں کی قسم، تیرے شبستاں کی قسم!

لبِ جاناں پہ فدا، عارضِ جاناں کے نثار
شامِ رنگیں کی قسم، صبحِ درخشاں کی قسم

آج تک صبحِ وطن یاد ہے ہم کو اختر
دردِ ہجراں کی قسم، شامِ غریباں کی قسم!

یقینِ وعدہ نہیں، تابِ انتظار نہیں!

یقینِ وعدہ نہیں، تابِ انتظار نہیں!
کسی طرح بھی دلِ زار کو قرار نہیں!

شبوں کو خواب نہیں، خواب کو قرار نہیں
کہ زیبِ دوش وہ گیسوئے مشکبار نہیں

کلی کلی میں سمائی ہے نکہتِ سلمیٰ!
شمیمِ حور ہے یہ بوئے نو بہار نہیں!

کہاں کہاں نہ ہوئے ماہرو جدا مجھ سے
کہاں کہاں مری اُمید کا مزار نہیں!

غموں کی فصل، ہمیشہ رہی تر و تازہ
یہ وہ خزاں ہے کہ شرمندہ بہار نہیں

بہار آئی ہے، ایسے میں تم بھی آجاؤ
"کہ زندگی کا، برنگِ گل اعتبار نہیں"

کسی کی زلفِ پریشاں کا سایہ رقصاں ہے
فضا میں بال فشاں، ابرِ نو بہار نہیں!

ستارہ وار وہ پہلو میں آگئے شب کو
سحر سے کہہ دو کہ محفل میں آج بار نہیں

گلِ فسردہ بھی اک طرفہ حسن رکھتا ہے
خزاں یہ ہے تو مجھے حسرتِ بہار نہیں

ہر ایک جام پہ یہ نغمہ حزیں ساقی!
"کہ اس جوانیٔ فانی کا اعتبار نہیں!"

خدا نے بخش دیئے میرے دل کو غم اتنے
کہ اب میں اپنے گناہوں پہ شرمسار نہیں
چمن کی چاندنی راتیں ہیں کس قدر ویراں
کہ اس بہار میں وہ ماہِ نو بہار نہیں
شریکِ سوز ہیں پروانے، شمع کے اخترؔ
ہمارے دل کا مگر کوئی غمگسار نہیں

یارو! کوئے یار کی باتیں کرو!

یارو کوئے یار کی باتیں کریں
پھر گل و گلزار کی باتیں کریں
چاندنی میں، اے دل! اک اک پھول سے
اپنے گل رخسار کی باتیں کریں
آنکھوں آنکھوں میں لٹائے میکدے
دیدۂ سرشار کی باتیں کریں
اب تو ملیئے بس لڑائی ہو چکی
اب تو چلیئے پیار کی باتیں کریں
پھر مہک اُٹھے فضائے زندگی
پھر گلِ رخسار کی باتیں کریں
محشرِ انوار کر دیں بزم کو
جلوۂ دیدار کی باتیں کریں
اپنی آنکھوں سے بہائیں سیلِ اشک
ابرِ گوہر بار کی باتیں کریں
اُن کو اُلفت ہی سہی اغیار سے
ہم سے کیوں اغیار کی باتیں کریں؟
اخترؔ اس رنگین ادا سے رات بھر!
طالعِ بیمار کی باتیں کریں

عید آئی ہے آکہ ساقی، عید کا ساماں کریں!

عید آئی، آکہ ساقی، عید کا ساماں کریں
دن ہے قربانی کا، ہم بھی توبہ کو قرباں کریں

میکدے کے بام پہ چڑھ کر اذانِ شوق دیں
مست ہیں، یوں پیرویٔ شیوۂ ایماں کریں

انجم و گل سے کریں آراستہ بزمِ طرب
ساغرِ ناپید کو اس بزم میں رقصاں کریں

ناز ہے زاہد کو جس زہدِ ریائی پر، اُسے
ہوشانِ میکدہ کے سامنے عریاں کریں

صحنِ مے خانہ نہیں، یہ عید گاہِ شوق ہے
دھوم ہے رندو، نمازِ شوق کا ساماں کریں

جس کو سُن کر وجد میں آجائے دیوارِ حرم!
میکدے میں آج ہم اُس راز کو عریاں کریں

پھر لبِ مینا سے چھلکائیں رسیلی بجلیاں!
پھر متاعِ غم کو نذرِ شعلۂ عُریاں کریں

ایک جانب غنچہ افشاں ہو چراغاں کی بہار
ایک جانب آتشیں گل کو شرر افشاں کریں

اک طرف تازہ کریں ہنگامہ ہائے ناؤ نوش
اک طرف برپا سرود و نغمہ کے طوفاں کریں

لالہ و گل سے چھپا دیں ساغر و پیمانہ کو!
یوں عروسِ بادہ کی تزئین کا ساماں کریں

ہے گراں، غم خانۂ ہستی میں ذوقِ بے خودی
خُم کے خُم چھلکا کے ہم اس ذوق کو ارزاں کریں

نازنینانِ حرم کی یاد میں اک شوخ کو
فرشِ گلہائے بہار آلود پر رقصاں کریں

منزلِ جاناں تک اختر ہم پہنچ ہی جائیں گے
پہلے اپنی جاں کو تو خاکِ رہِ جاناں کریں

محبّت کی دُنیا میں مشہور کر دوں

محبت کی دنیا میں مشہور کر دوں
مرے سادہ دل تجھ کو مغرور کر دوں!

ترے دل کو ملنے کی خود آرزو ہو
تجھے اس قدر غم سے رنجور کر دوں!

مجھے زندگی دُور رکھتی ہے تجھ سے
جو تو پاس ہو تو اُسے دور کر دوں!

محبت کے اقرار سے شرم کب تک
کبھی سامنا ہو تو مجبُور کر دوں!

مرے دل میں ہے شعلۂ حُسن رقصاں
میں چاہوں تو ہر ذرّے کو طور کر دوں!

یہ بے رنگیاں کب تک اے حُسن رنگیں
اِدھر آ تجھے عشق میں چُور کر دوں!

تو گر سامنے ہو تو میں بے خودی میں
ستاروں کو سجدے پہ مجبور کر دوں!
سیہ خانۂ غم ہے ساقی، زمانہ
بس اک جام اور نور ہی نور کر دوں!
نہیں زندگی کو وفا ورنہ اخترؔ!
محبت سے دنیا کو معمور کر دوں

تمناؤں کو زندہ آرزوؤں کو جواں کر لوں!!!

تمناؤں کو زندہ، آرزوؤں کو جواں کر لوں
یہ شرمیلی نظر کہہ دے تو کچھ گستاخیاں کر لوں
بہار آئی ہے بلبل دردِ دل کہتی ہے پھولوں سے
کہو تو میں بھی اپنا دردِ دل تم سے بیاں کر لوں
ہزاروں شوخ ارماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں
حیا اُن کی اجازت دے تو کچھ بے باکیاں کر لوں
کوئی صورت تو ہو دُنیائے فانی میں بہلنے کی!
ٹھہر جا اے جوانی! ماتمِ عمرِ رواں کر لوں
چمن میں ہیں بہم، پروانہ و شمع و گل و بلبل!
اجازت ہو تو میں بھی حالِ دل اپنا بیاں کر لوں
کسے معلوم کب، کس وقت، کس پر گر پڑے بجلی!
ابھی سے میں چمن میں چل کر آباد آشیاں کر لوں!
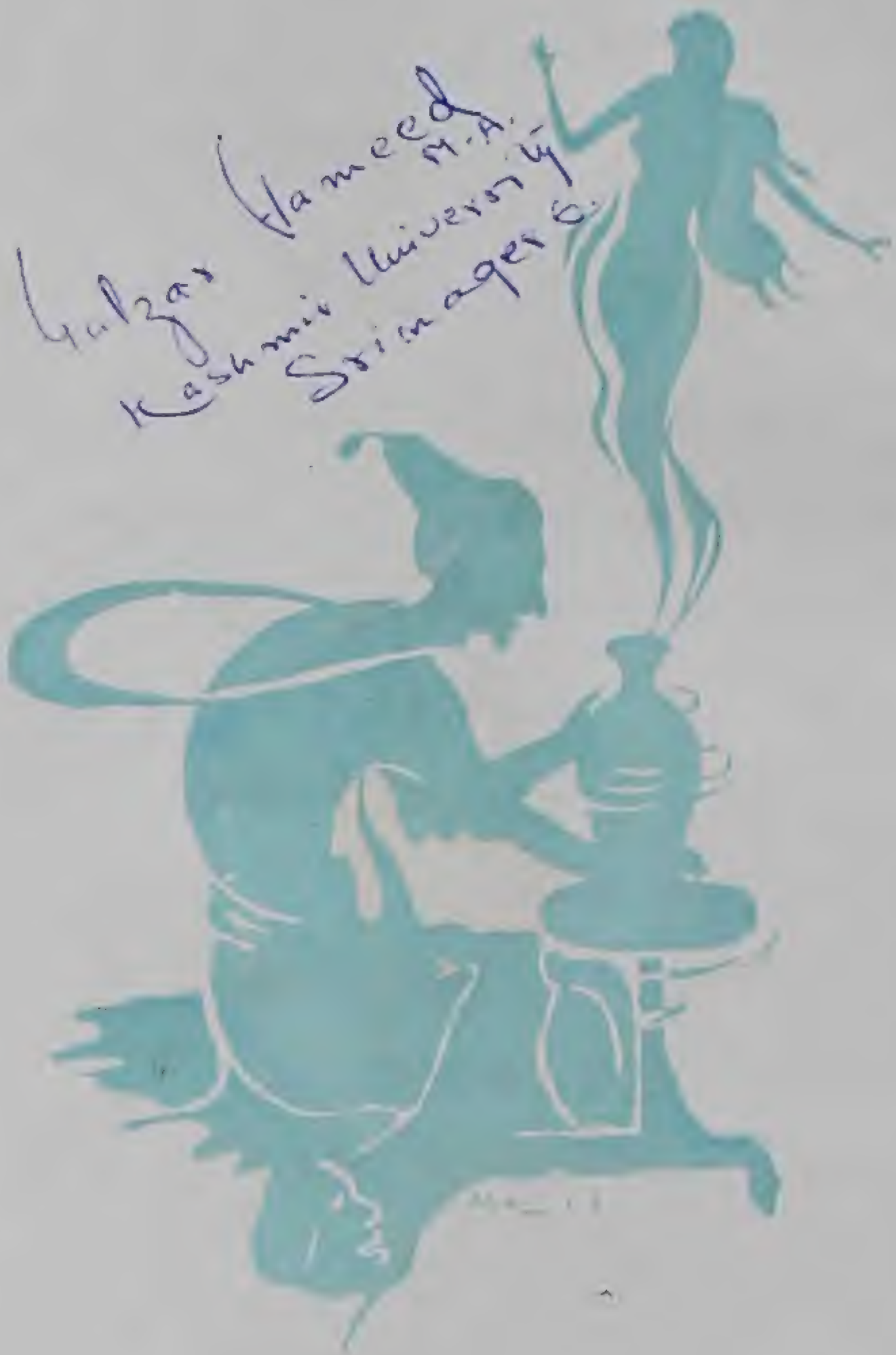
برآئیں حسرتیں کیا کیا، اگر موت اتنی فرصت دے
کہ اک بار اور زندہ شیوۂ عشقِ جواں کر لوں
مجھے دونوں جہاں میں ایک وہ مل جائیں گر اختر
تو اپنی حسرتوں کو بے نیازِ دو جہاں کر لوں

ہمارے ہاتھ میں کب ساغرِ شراب نہیں

ہمارے ہاتھ میں کب ساغرِ شراب نہیں؟
ہمارے قدموں پہ کس روز ماہتاب نہیں
جہاں میں اب کوئی صورت پئے ثواب نہیں!
وہ مے کدے نہیں، ساقی نہیں، شراب نہیں
شبِ بہار میں زلفوں سے کھیلنے والے
ترے بغیر، مجھے آرزوئے خواب نہیں
چمن میں بلبلیں اور انجمن میں پروانے
جہاں میں کون غمِ عشق سے خراب نہیں
سکوتِ حسن کے لب پہ ہیں مستیاں گویا
بہار جاگ رہی ہے، وہ محوِ خواب نہیں
وہی ہیں وہ، وہی ہم ہیں، وہی تمنا ہے
الٰہی کیوں تری دنیا میں انقلاب نہیں

ہے شام و صبح سے بیگانہ غم کدہ دل کا!
چراغِ ماہ نہیں، شمعِ آفتاب نہیں

شباب مٹ چکا، یادِ شباب باقی ہے
ہے بو شراب کی، ساغر میں اب شراب نہیں

سنا یہ نغمۂ ستاروں کی چھاؤں میں مطرب
کہ رات بھر کی ہے اِک روشنی، شراب نہیں

دریچۂ مہ و انجم سے جھانکنے والے
ہوئی ہے عمر کہ میں آشنائے خواب نہیں

غمِ آہ عشق کے غم کا کوئی نہیں موسم
بہار ہو کہ خزاں کب یہ اضطراب نہیں!

حریمِ عرش کے سینے سے آ رہی ہے صدا
کہ اہلِ دل کی جگہ، عالمِ خراب نہیں

امیدِ پرسشِ احوال ہو تو کیوں کر ہو
سلام کا بھی تری بزم میں جواب نہیں

بجھا سا رہتا ہے دل جب سے ہیں وطن سے جدا
وہ صحنِ باغ نہیں، سیرِ ماہتاب نہیں!

بسے ہوئے ہیں نگاہوں میں وہ حسین کُوچے
ہر ایک ذرّہ جہاں کم ز آفتاب نہیں
وہ باغ و راغ کے دلچسپ و دلنشیں منظر
کہ جن کے ہوتے ہوئے خلد مثلِ خواب نہیں
وہ جوئبارِ رواں کا طرب فزا پانی!
شراب سے نہیں کچھ کم اگر شراب نہیں
برنگِ زلف، پریشاں، وہ موجہائے رواں
کہ جن کی یاد میں راتوں کو فکرِ خواب نہیں
سما رہے ہیں نظر میں وہ مہوشانِ حرم
حرم میں جن کے ستارے بھی باریاب نہیں
وطن کا چھیڑ دیا کس نے تذکرہ اخترؔ
کہ چشمِ شوق کو پھر آرزوئے خواب نہیں

وُہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بُھلا دیں

وہ کہتے ہیں، رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں خوش رہیں مسکرا دیں
غرور اور ہمارا غرورِ محبت
مہ و مہر کو ان کے در پر جُھکا دیں
جوانی ہو گر جاودانی تو یارب
تری سادہ دُنیا کو جنت بنادیں
شبِ وصل کی بیخودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

بہاریں سمٹ آئیں، کِھل جائیں کلیاں — جو ہم تم چمن میں کبھی مُسکرا دیں
عبادت ہے اک بیخودی سے عبارت — حرم کو مئے مشک بُو سے بسا دیں
وہ آئیں گے آج اے بہارِ محبت — ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں
بنانا ہے مُنہ تلخیٔ مے سے زاہد — تجھے باغِ رضواں سے کوثر منگا دیں
جنہیں عمر بھر یاد آنا سکھایا! — وہ دل سے تری یاد کیونکر بھلا دیں
تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو! — اِدھر آؤ! ہم تم کو لیلےٰ بنا دیں
یہ بے دردیاں کب تک اے دردِ غربت؟ — بتوں کو پھر ارضِ حرم میں بسا دیں
وہ سرمستیاں بخش اے رشکِ شیریں — کہ خسرو کو خوابِ عدم سے جگا دیں
ترے وصل کی بے خودی کہہ رہی ہے — خدائی تو کیا ہم خدا کو بھلا دیں

انہیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا!
مرے عشقِ رُسوا کو اختر دعا دیں

کِس کی آنکھوں کا لئے دل پہ اثر جاتے ہیں

کِس کی آنکھوں کا لئے دل پہ اثر جاتے ہیں
مے کدے ہاتھ بڑھاتے ہیں جدھر جاتے ہیں

دل میں ارمانِ وصال، آنکھ میں طوفانِ جمال
ہوش باقی نہیں جانے کا، مگر جاتے ہیں

بھولتی ہی نہیں دل کو تری مستانہ نگاہ!
ساتھ جاتا ہے یہ مے خانہ جدھر جاتے ہیں

پاسبانانِ حیا کیا ہوئے اے دولتِ حسن؟
ہم چُرا کر تری دزدیدہ نظر جاتے ہیں

پُرسشِ دل تو کُجا یہ بھی نہ پوچھا اُس نے
ہم مسافر کدھر آئے تھے کدھر جاتے ہیں

چشمِ حیراں میں سمائے ہیں یہ کِس کے جلوے
طور ہر گام پہ رقصاں ہیں جدھر جاتے ہیں

جس طرح بُھولے مسافر کوئی ساماں اپنا
ہم یہاں بُھول کے دل اور نظر جاتے ہیں

کتنے بے درد ہیں اس شہر کے رہنے والے
راہ میں چھین کے دل کہتے ہیں گھر جاتے ہیں

اگلے وقتوں میں لُٹا کرتے تھے رہرو اکثر
ہم تو اس عہد میں بھی لُٹ کے مگر جاتے ہیں

فیض آباد سے پہنچا ہمیں یہ فیضِ اختر
کہ جگر پر لئے ہم داغِ جگر جاتے ہیں

عمر بھر کی تلخ بیداری کا ساماں ہو گئیں

عمر بھر کی تلخ بیداری کا ساماں ہو گئیں!
ہائے وہ راتیں کہ جو خوابِ پریشاں ہو گئیں

میں فدا اس چاند سے چہرے پہ جس کے نور سے
میرے خوابوں کی فضائیں، یوسفستاں ہو گئیں

عمر بھر کم بخت کو پھر نیند آسکتی نہیں
جس کی آنکھوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

دل کے پردوں میں تھیں جو جو حسرتیں پردہ نشیں
آج وہ آنکھوں میں آنسو بن کے عریاں ہو گئیں

کچھ تجھے بھی ہے خبر او سونے والے ناز سے
میری راتیں لٹ گئیں، نیندیں پریشاں ہو گئیں

ہائے وہ مایوسیوں میں میری امیدوں کا رنگ
جو ستاروں کی طرح اٹھ اٹھ کے پنہاں ہو گئیں

بس کرو، او میری رونے والی آنکھو بس کرو!
اب تو اپنے ظلم پر وہ بھی پشیماں ہو گئیں

آہ، وہ دن، جو نہ آئے پھر گزر جانے کے بعد
ہائے وہ راتیں کہ جو خوابِ پریشاں ہو گئیں

گلشنِ دل میں کہاں اختر وہ رنگِ نو بہار !
آرزوئیں چند کلیاں تھیں پریشاں ہوگئیں

جو بہاروں میں نہاں رنگِ خزاں دیکھتے ہیں

جو بہاروں میں نہاں رنگِ خزاں دیکھتے ہیں
دیدۂ دل سے وہی سیرِ جہاں دیکھتے ہیں

ایک پردہ ہے غموں کا جسے کہتے ہیں خوشی
ہم تبسم میں نہاں اشک رواں دیکھتے ہیں

دیکھتے دیکھتے کیا رنگ جہاں نے بدلے
دیدۂ اشک سے نیرنگِ جہاں دیکھتے ہیں

رات ہی رات کی مہماں تھی بہارِ رنگیں!
پھر وہی صبح، وہی جورِ خزاں دیکھتے ہیں

ہر مسرت ہے غم تازہ کی تمہید اے دل
نغمۂ شوق میں آثارِ فغاں دیکھتے ہیں

دل میں جینے کی تمنا نہیں باقی اختر
کوئی دن اور تماشائے جہاں دیکھتے ہیں

ناحق نہ دردِ عشق کی ہمدم دوا کریں!

ناحق نہ دردِ عشق کی ہمدم دوا کریں
تا حشر یہ خلش نہ مٹے، یہ دعا کریں

شکوے سے کی ہے نامۂ اُلفت کی ابتدا
جی چاہتا ہے آج پھر ان کو خفا کریں

الزامِ پارسائی نہ آئے، شباب میں
جو پارسا ہوں، وہ مرے حق میں دعا کریں

پچھلا پہر ہے، چاندنی چھٹکی ہے باغ میں
ایسے میں آپ آ نہیں سکتے ہیں کیا کریں؟

وہ کیا ملا کہ دونوں جہاں مل گئے ہمیں
اب اس کی بارگاہ میں ہم کیا دعا کریں؟

بے تاب ہو کے سامنے آئیں گے خود کبھی
چھپنے کو ہم سے لاکھ ابھی وہ چھپا کریں

اختر نہیں ہے دردِ محبت کا کچھ علاج!
ہو کوئی اور درد تو نشتر دوا کریں!

لے آئے انقلابِ سپہر بریں کہاں؟

لے آئے انقلابِ سپہر بریں کہاں؟
اللہ ہم کہاں، وہ ثریا جبیں کہاں؟

در ہے نہ آستاں، نہ حرم ہے نہ بتکدہ
یا رب مچل پڑی ہے ہماری جبیں کہاں؟

سورج کی سب سے پہلی کرن خوشنما سہی
لیکن تری نظر کی طرح دل نشیں کہاں؟

دامن کشِ نظر ہے کسی کا حریمِ ناز
دنیا میں آگئی یہ بہشتِ بریں کہاں ؟
آنکھوں نے ذرّے ذرّے پہ سجدے لٹائے ہیں
کیا جانے جا چھپا مرا پردہ نشیں کہاں ؟
کوثر پلا کے ہم سے نہ حوریں کریں مذاق
ہم رندِ تلخ نوش کہاں، انگبیں کہاں ؟
زاہد تری بہشت میں حوریں بھی ہیں مگر
ہم جس کو چاہتے ہیں وہ زہرہ جبیں کہاں ؟
ساقی کی چشمِ مست کا صدقہ ہے ورنہ شیخ !
اختؔر کہاں، یہ شعلۂ مینا نشیں کہاں ؟

میخانۂ حیات میں کیا آرمیدہ ہوں

میخانۂ حیات میں کیا آرمیدہ ہوں !
بزمِ ازل کا ساغرِ راحت چشیدہ ہوں
آغازِ عشق ہی مجھے انجامِ عشق ہے !
میں دامنِ نسیم پہ اشکِ چکیدہ ہوں
تصویرِ خاک میں مجھے ظاہر کیا ہے کیوں ؟
میں نو بہارِ قدس کا رنگِ پریدہ ہوں

ہوں گلستانِ غم کا گلِ داغدار میں
یا نونہالِ درد کی شاخِ بریدہ ہوں
اس دامگاہِ دہر میں کیوں ہو گیا اسیر
میں شاخسارِ خُلد کا مرغِ پریدہ ہوں
میرے سکوت پر نہیں کچھ ضبطِ دل گراں
میں کاروانِ عشق کی صوتِ شنیدہ ہوں
اختر یہ فیصلہ ہے نبردِ حیات کا
ہو جاؤں گا فنا کہ فنا آفریدہ ہوں

مری شامِ غم کو وہ بہلا رہے ہیں!

مری شامِ غم کو وہ بہلا رہے ہیں
لکھا ہے یہ خط میں کہ ہم آ رہے ہیں

وہ بے اختیار آج یاد آ رہے ہیں
ہمارے تصور کو مہکا رہے ہیں

محبت کے جلوے نظر آ رہے ہیں
نگاہوں سے پردے اُٹھے جا رہے ہیں

نہیں شکوۂ تشنگی مے کشوں سے
وہ آنکھوں سے میخانے برسا رہے ہیں

غمِ عاقبت ہے، نہ فکرِ قیامت!
پئے جا رہے ہیں، جئے جا رہے ہیں

نہیں کون کہتا ہے ابرِ خراماں
یہ جو مے کدے سے اُڈے آ رہے ہیں

ٹھہر جا ذرا او رہے دردِ فرقت
ہمارے تصور میں وہ آ رہے ہیں

وہ جانِ بہار آج آئے گی اختر
کنول حسرتوں کے کھلے جا رہے ہیں

کبھی کاش رحم کا بھی اثر ملے چشمِ فتنہ نگاہ میں

کبھی کاش رحم کا بھی اثر ملے چشمِ فتنۂ نگاہ میں
کہ کوئی گدا ہے پڑا ہوا ترے درِ عشق کی راہ میں

نہیں عذر زاہدو، لاکھ مرتبہ جائیں طوفِ حرم کو ہم
مگر ایک شرط ہے میکدہ نہ ملا کرے ہمیں راہ میں

نہیں یادِ عیش و ملالِ عمرِ گذشتہ کی کوئی داستاں
مگر آہ چند وہ ساعتیں جو بسر ہوئی ہیں گناہ میں

جو مزاجِ دل نہ بدل سکا تو مذاقِ دہر کا کیا گلہ
وہی تلخیاں ہیں ثواب میں، وہی لذتیں ہیں گناہ میں

گِلۂ ستم کی مجال تو ہے، پہ آہ اس کا میں کیا کروں
یہ جو ایک بجلی سی بے قرار ہے اُن کی نیچی نگاہ میں

مجھے انقلابِ زمانہ کا، جو یقین آئے تو کس طرح
وہی درد ہے مری آہ میں، وہ ناز تیری نگاہ میں

بخدا کہ دونوں جہان میں کوئی اس سے بڑھ کے خوشی نہ تھی
اگر ایک تلخئ انفعال کی حس نہ ہوتی گناہ میں
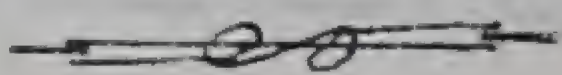
لا پلا ساقی شرابِ ارغوانی پھر کہاں ؟

لا پلا ساقی، شرابِ ارغوانی پھر کہاں ؟
زندگانی پھر کہاں، ناداں جوانی پھر کہاں ؟
دو گھڑی مل بیٹھنے کو بھی غنیمت جانئے
عمر فانی ہی سہی، یہ عمرِ فانی پھر کہاں ؟
آ ! کہ ہم بھی اک ترانہ جھوم کر گاتے چلیں
اس چمن کے طائروں کی ہمزبانی پھر کہاں ؟
ہے زمانہ عشق سیلے میں گنوا دے زندگی!
یہ زمانہ پھر کہاں، یہ زندگانی پھر کہاں ؟
ایک ہی بستی میں ہیں، آساں ہے ملنا آ ملو
کیا خبر لے جائے، دورِ آسمانی پھر کہاں ؟
فصلِ گل جانے کو ہے، دورِ خزاں آنے کو ہے
یہ چمن، یہ بلبلیں، یہ نغمہ خوانی پھر کہاں ؟
پھول چن چن جی کھول کر عیش و طرب کے پھول چن
موسمِ گل پھر کہاں، فصلِ جوانی پھر کہاں ؟
آخری رات آگئی، جی بھر کے مل لیں آج تو
تم سے ملنے دے گا دورِ آسمانی پھر کہاں ؟

آج آئے ہو تو سنتے جاؤ یہ تازہ غزل
ورنہ اختر پھر کہاں، یہ شعر خوانی پھر کہاں؟

دلِ دیوانہ و اندازِ بیباکانہ رکھتے ہیں

دلِ دیوانہ و اندازِ بیباکانہ رکھتے ہیں!
گدائے میکدہ ہیں وضع آزادانہ رکھتے ہیں

مجھے میخانہ، تھرّاتا ہوا محسوس ہوتا ہے
وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

نزی عالی جنابی سے ہو کس کو عشق کی جرأت
خدا کا شکر ہے ہم شمع بے پروانہ رکھتے ہیں

گھٹائیں بھی تو بہکی جا رہی ہیں ان اداؤں پر
چمن میں جو قدم رکھتے ہیں وہ مستانہ رکھتے ہیں

بظاہر ہم ہیں بلبل کی طرح مشہورِ ہرجائی
مگر دل میں گدازِ فطرتِ پروانہ رکھتے ہیں

جوانی بھی تو اک موجِ شرابِ تند و رنگیں ہے
بُرا کیا ہے اگر ہم مشربِ رندانہ رکھتے ہیں

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا
فقیری میں بھی اختر غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں

کیا جانے جا چھپی وہ مری یاسمن کہاں؟

کیا جانے جا چھپی وہ مری یاسمن کہاں؟
شامِ چمن، بنا کہ ہے ماہِ چمن کہاں؟

دیدارِ برقِ جلوہ نہ تھا اس قدر محال!
حاصل ہوا ہے رنگِ گل و یاسمن کہاں؟

کہتا ہے یہ سکوتِ لبِ لالہ ہائے طور!
سوزِ جگر کہاں، سرو برگِ سخن کہاں؟

خلوت نشینوں سے نہیں ہے فیض خلق کو
چشمہ کہاں روانی گنگنائے چمن کہاں؟

اے دردِ دل یہ تو نے دکھایا ہے کیا اثر!
وہ گلبدن کہاں، مرادارالمحن کہاں؟

ہم تلخ کامیوں کا گلہ کس طرح کریں
مانا کہ آپ سا کوئی شیریں دہن کہاں؟

یہ سچ کہ ہے بہارِ چمن، جانفزا مگر!
جس کی تلاش ہے وہ بہارِ چمن کہاں؟

رنگِ بہارِ یاسمن و گل حسیں سہی!
لیکن وہ یاسمن رُخ و گل پیرہن کہاں؟

نورِ کمال چھپ نہیں سکتا، حجاب میں!
خوشبو بتاتی ہے کہ کھلی ہے سمن کہاں؟

ہو جاتی ہے خیال سے گُم انجمن تمام!
وہ آ گئے خیال میں تو انجمن کہاں؟

کیسا ہی دیں فریب گل و لالہ و سمن
ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ جانِ چمن کہاں؟

مجبور ہو کے اُن کو بھی کہنا پڑا ندیم!
اختر سا اور ہند میں شیریں سخن کہاں؟

میں آرزوئے جاں لکھوں، یا جانِ آرزو!

میں آرزوئے جاں لکھوں، یا جانِ آرزو
تو ہی بتا دے ناز سے ایمانِ آرزو

آنسو نکل رہے ہیں تصور میں بن کے پھول
شاداب ہو رہا ہے گلستانِ آرزو

ایمان و جاں نثار تری اک نگاہ پر
تو جانِ آرزو ہے، ایمانِ آرزو

مصرِ فراق کب تلک اے یوسفِ اُمید
روتا ہے تیرے ہجر میں کنعانِ آرزو

ہونے کو ہے طلوع، صباحِ شبِ وصال
بجھنے کو ہے چراغِ شبستانِ آرزو

اک وہ کہ آرزوؤں پہ جیتے ہیں عمر بھر
اک ہم کہ ہیں ابھی سے پشیمانِ آرزو

آنکھوں سے جوئے خوں ہے رواں دل ہے باغ باغ
دیکھے کوئی بہارِ گلستانِ آرزو

دل میں نشاطِ رفتہ کی دُھندلی سی یاد ہے
یا شمعِ وصل ہے تہِ دامانِ آرزو

اختر کو زندگی کا بھروسہ نہیں رہا
جب سے لٹا چکے سروسامانِ آرزو

یاد آؤ، مجھے لِلّٰہ نہ تم یاد کرو!

یاد آؤ، مجھے لِلّٰہ نہ تم یاد کرو!
اپنی اور میری جوانی کو نہ برباد کرو!
بستیاں اپنی، اٹک پار بسانے والو!
کبھی راوی کے کناروں کو بھی دلشاد کرو
خیبر اور اُس کے نواحی میں ٹہلنے والو
کبھی لاہور کے لارنس کو بھی یاد کرو!
سرحد اور اُس کے مناظر ہیں طربناک مگر
کبھی پنجاب کے سینے کو بھی آباد کرو
میرے پردیسیو سیکھی ہے یہ کس دیس کی ریت
جو تمہیں یاد کرے، تم نہ اُسے یاد کرو
شرم رونے بھی نہ دے، بیکلی سونے بھی نہ دے
اس طرح تو مری راتوں کو نہ برباد کرو
حد ہے پینے کی کہ خود پیرِ مغاں کہتا ہے
اس بُری طرح جوانی کو نہ برباد کرو

یاد آتے ہو بہت، دل سے بھلانے والو
تم ہمیں یاد کرو، تم ہمیں کیوں یاد کرو!
آسماں رتبہ محل اپنے بنانے والو!
دل کا اُجڑا ہوا گھر بھی کوئی آباد کرو
"ہم کبھی آئیں، ترے گھر مگر آئیں گے ضرور"
تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ نہیں، یاد کرو
چاندنی رات میں گلگشت کو جب جاتے تھے
آہ عذرا کبھی اُس وقت کو بھی یاد کرو
میں بھی شائستۂ الطافِ ستم ہوں شاید
میرے ہوتے ہوئے کیوں غیر پہ بیداد کرو
صدقے اُس شوخ کے اخترؔ میں لکھا جس نے
عشق میں اپنی جوانی کو نہ برباد کرو

کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ

کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ
زلفِ برہم زدہ چشمِ حجاب آلودہ
آہ یہ زلف ہے یا ابرِ مے خانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جامِ شراب آلودہ

کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ
کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ
کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ
پھر ہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو
پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ
حسرتِ بوسہ پہ رخصت یہ خیال آتا ہے
کیوں مرے لب سے ہوں وہ برگِ گلاب آلودہ

میری آنکھوں پہ چھا گیا کوئی!

میری آنکھوں پہ چھا گیا کوئی! — میرے دل میں سما گیا کوئی
دردِ دل کس طرح چھپاتے ہم — آنکھوں آنکھوں میں پا گیا کوئی
ہم غریبوں کی کچھ نہیں سنتا — دل کو یہ کیا سکھا گیا کوئی
پھر تصور نے چھو لنا چاہا — پھر تصور میں آ گیا کوئی
آنکھ بس خواب، دل فقط جذبہ — پردے پردے میں آ گیا کوئی
بخش کر دل کو، ایک اپنی یاد — دل سے سب کچھ بھلا گیا کوئی

دیدۂ شوق کا خدا حافظ! خواب بن کر سما گیا کوئی
دل جسے بھولنا نہ چاہتا تھا دل سے سب کچھ بُھلا گیا کوئی
سنگدل ہونے پر یہ حالت تھی میرے دل کو لبھا گیا کوئی
دلِ ناداں کا قصّہ کیا اختر!
دلِ ناداں کو بھا گیا کوئی

بھلا کیوں کر نہ ہوں راتوں کی نیندیں بیقرار اُس کی

بھلا کیوں کر نہ ہوں راتوں کی نیندیں بیقرار اُس کی
کبھی لہرا چکی ہو جس پہ زلفِ مشکبار اُس کی
اُمیدِ وصل پر، دل کو فریبِ صبر کیا دیجئے
ادا وحشی صفت اس کی، نظر بیگانہ وار اُس کی
محبّت تھی، مگر یہ بے قراری تو نہ تھی پہلے!
الٰہی آج کیوں یاد آتی ہے بے اختیار اُس کی
تجھے تو عشق پیچاں، ایسے بل کھانے نہ آتے تھے
بتا کیا تجھ پہ لہرائی ہے زلفِ عطر بار اُس کی
مئے اُلفت کے سرشاروں کو مے خانے سے کیا مطلب
ادا رُوحِ نشاط اس کی، نظر جانِ بہار اُس کی

بُرا ہو اس تغافل کا، کہ تنگ آ کر یہ کہتا ہوں
مجھے کیوں ہو گئی الفت مرے پروردگار اس کی

یہاں کیا دیکھتے ہو ناصحو! گھر میں دھرا کیا ہے
مرے دل کے کسی پردے میں ڈھونڈو یادگار اُس کی

جفائے ناز کی میں نے شکایت، ہائے کیوں کی تھی
مجھے جینے نہیں دیتی نگاہِ شرمسار اُس کی

ہمیں عرض تمنا کی جسارت ہو تو کیوں کر ہو
نگاہیں فتنہ ریز اس کی، ادائیں حشر بار اُس کی

کوئی کیوں کر بھلا دے، ہائے ایسے کی محبت کو
وفائیں دل نواز اس کی، جفائیں خوشگوار اُس کی

انہی کوچوں میں کل اختر کو رُسوا ہوتے دیکھا تھا
وہ آنکھیں اشکبار اس کی، وہ باتیں دل فگار اس کی

جھوم کر آئی ہے مستانہ گھٹا برسات کی

جھوم کر آئی ہے مستانہ گھٹا برسات کی
جی لبھاتی ہے نسیم جاں فزا برسات کی

باغ کا ایک اک شجر ہے اک عروس سبز پوش
جس کو آ کر گدگداتی ہے ہوا برسات کی

رحمتِ حق، ابر بن کر چار جانب چھا گئی
کب سے کرتے تھے دعائیں مرلقا برسات کی
کوئلیں کوکیں، پپیہے پی کہاں کہنے لگے
نغموں سے لبریز ہے رنگیں فضا برسات کی
جھولتی ہیں تتلیوں کی طرح کم سن مہوشیں
یا شگوفوں کو اڑاتی ہے ہوا برسات کی
اک طرف پھولوں کی آنکھوں میں امنڈ آئی بہار
اک طرف رنگت دکھاتی ہے حنا برسات کی
سر سے ڈھلکے ہیں دوپٹے بال بکھرے سر کھلے
چھیڑتی ہے نازنینوں کو ہوا برسات کی
شاخساروں سے ملہاروں کی صدا آنے لگی
کیا سہانے گیت گاتی ہے گھٹا برسات کی
دل مچلتا ہے مرا اختر گھٹا کو دیکھ کر
آہ! یہ کالی، یہ متوالی گھٹا برسات کی

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی   ساری دنیا پر جوانی آ گئی
آہ! وہ اس کی نگاہ مے فروش   جب بھی اٹھی مستیاں برسا گئی

گیسوئے مشکیں میں وہ روئے حسیں
ابر میں بجلی سی اک لہرا گئی!
عالمِ مستی کی توبہ ، الاماں!
پارسائی نشّہ بن کر چھا گئی
آہ اُس کی بے نیازی کی نظر
آرزو کیا پھول سی کُھلا گئی
سازِ دل کو گدگدایا عشق نے
موت کو لے کر جوانی آگئی
پارسائی کی جوانمرگی نہ پوچھ
توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی
اختر اس جانِ تمنا کی ادا!
جب کبھی یاد آگئی تڑپا گئی

نہ وہ خزاں رہی باقی نہ وہ بہار رہی!

نہ وہ خزاں رہی باقی نہ وہ بہار رہی
رہی تو میری کہانی ہی یادگار رہی
وہی نظر ہے نظر جو بایں ہمہ پستی
ستارہ گیر رہی ، کہکشاں شکار رہی
شبِ بہار میں تاروں سے کھیلنے والے
کسی کی آنکھ بھی شب بھر ستارہ بار رہی
تمام عمر رہا گرچہ میں تہی پہلو
بسی ہوئی مرے پہلو میں بوئے یار رہی
کوئی عزیز نہ ٹھہرا ہمارے دفن کے بعد
رہی جو پاس تو شمعِ سرِ مزار رہی
وہ پھول ہوں جو کھلا ہو خزاں کے موسم میں
تمام عمر مجھے حسرتِ بہار رہی
کبھی نہ بھولیں گی اُس شب کی لذتیں اختر
کہ میرے سینے پہ وہ زلفِ مشکبار رہی

بہشتوں پہ ہنستی ہے دنیائے فانی

بہشتوں پہ ہنستی ہے دنیائے فانی — جوانی کی راتیں ہیں کتنی سہانی
ستم ہے کہ اے دل نہیں جاودانی — حسینوں کا حسن اور ہماری جوانی
یہ سبزہ، یہ بادل، یہ رُت یہ جوانی! — کدھر ہے مرا ساغرِ خسروانی
بھلا پھر کہاں ہم، کہاں نوجوانی — پلا ساقیا بادۂ ارغوانی
ترا حسن، پروردۂ رنگ و بو ہے — بہاروں میں کھیلی ہے تیری جوانی
صنم خانۂ شعر خاموش کیوں ہے — نہ وہ دلستاں ہیں نہ وہ دلستانی
مری بے خودی کو بُرا کہنے والے — چھلکتی ہے ساغر میں کس کی جوانی
یہ حسرت رہی وہ کبھی آکے سُنتے — ہماری کہانی، ہماری زبانی
سرِ بام او محوِ خوابِ بہاریں — ستاروں پہ چھائی ہے تیری جوانی

مرا عشق بدنام ہے کیوں جہاں میں؟
ہے مشہور اختر جوانی دیوانی

اس مہ جبیں سے آج ملاقات ہوگئی

اس مہ جبیں سے آج ملاقات ہوگئی — بے دردِ آسمان! یہ کیا بات ہوگئی؟
آوارگانِ عشق کا مسکن نہ پوچھئے — پڑ رہتے ہیں وہیں پہ جہاں رات ہوگئی
ذکرِ شبِ وصال ہو کیا، قصہ مختصر — جس بات سے وہ ڈرتے تھے وہ بات ہوگئی

مسجد کو ہم چلے گئے مستی میں بھول کر
ہم سے خطا یہ پیرِ خرابات ہو گئی

پچھلے غموں کا ذکر ہی کیا جب وہ مل گئے
اے آسماں تلافیٔ مافات ہو گئی

زاہد کو زندگی ہی میں کوثر چکھا دیا
رندوں سے آج یہ بھی کرامات ہو گئی

بے چین رکھنے والے پریشاں ہوں خوب کیوں
آخر کو تیری زلف مری رات ہو گئی

جھولا جھلائیں چل کے حسینوں کو باغ میں
گجرات میں سنا ہے کہ برسات ہو گئی

کیا فائدہ اب اختر اگر پارسا بنے!
جب ساری عمر نذرِ خرابات ہو گئی

وہ کہتے ہیں کہ ہم سے پیار کی باتیں نہیں اچھی!

وہ کہتے ہیں کہ ہم سے پیار کی باتیں نہیں اچھی
کوئی سمجھائے یہ تکرار کی باتیں نہیں اچھی

تمہاری ہی طرح اغیار بھی اچھے سہی لیکن!
ہمارے سامنے اغیار کی باتیں نہیں اچھی

شبِ وصل آپ کا عذرِ نزاکت کون مانے گا
کہے دیتے ہیں ہم تکرار کی باتیں نہیں اچھی

عدو کے ساتھ پھر فاتحہ اور میرے مدفن پہ
بہت اچھا مگر سرکار کی باتیں نہیں اچھی

ہماری زندگی کی کامیابی کی دعا اور تم
نہ چھیڑ، طالبِ بیمار کی باتیں نہیں اچھی
لکھوں تو اپنا حالِ دل انہیں کیوں کر لکھوں آخر
وہ لکھتی ہیں کہ خط میں پیار کی باتیں نہیں اچھی

نہ سازو مطرب، نہ جام وساقی، نہ وہ بہارِ چمن ہی باقی

نہ ساز و مطرب، نہ جام و ساقی، نہ وہ بہارِ چمن ہے باقی
نگاہِ شمعِ سحر کے پردے پہ نقشۂ انجمن ہے باقی
زمانہ گزرا وہ یاسمن بُو، جدا ہوئی ہمکنار ہو کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی
بھلا چکی دل سے شامِ غربت، ہر ایک نقشہ، ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغِ صبحِ وطن ہی باقی
زمانہ بدلا، مٹی جوانی، نہ وہ محبت، نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگِ داغِ کہن ہے باقی
مٹا دیئے بے ستونِ چرخِ کہن نے شیریں لقا ہزاروں
مگر محبت کے لب پر اب بھی ترانۂ کوہ کن ہے باقی
حباب آسا، محیطِ ہستی میں جو ہے مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیرِ چرخِ کہن ہے باقی

غمِ زمانہ کی سختیوں سے ہوئی ہے پامال طبعِ اختؔر
نہ وہ نشاطِ کہن ہے باقی، نہ وہ مذاقِ سخن ہے باقی

دلِ حزیں سے خلش کاریٔ ستم نہ گئی!

دلِ حزیں سے خلش کاریٔ ستم نہ گئی!
ابھی تک ان کی نگاہوں سے خوئے رم نہ گئی

ملی نہ سعیٔ برہمن سے زاہدوں کی مُراد
چراغِ دہر سے تاریکیٔ حرم نہ گئی!

ہنوز عشق سے اندازِ بیکسی نہ چھٹا
ہنوز حسن سے رنگینیٔ ستم نہ گئی

بتوں کو نکلے ہوئے مدتیں ہوئیں لیکن
ہنوز فطرتِ بت سازیٔ حرم نہ گئی

حرم میں حضرت زاہد نے لاکھ سر مارا
جبیں سے تیرگیٔ سجدۂ صنم نہ گئی

وہ میری شوخ نگاری پہ لکھتے ہیں اختؔر
ابھی تک آپ کی گستاخیٔ قلم نہ گئی
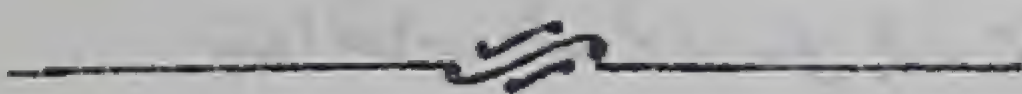
نہ بھولیں گی کبھی اے ہم نشیں، راتیں جوانی کی!

نہ بھولیں گی کبھی اے ہم نشیں راتیں جوانی کی
وہ راتیں، وہ ملاقاتیں، وہ برساتیں جوانی کی

لبوں پر آہ، دل میں دھڑکنیں، آنکھوں میں اشکِ خوں
جوانی لے کر آئی ہے، یہ سوغاتیں جوانی کی!

یہ مُرجھائی ہوئی کلیاں نہیں، بے نور آنکھیں ہیں
بسی تھیں جن کے خوابوں میں کبھی راتیں جوانی کی

غمِ دنیا ستم، افسردگیٔ دل قیامت ہے!
سُنا اے آرزوئے رفتہ پھر باتیں جوانی کی

ہوئی مدت پر اب بھی یاد آتی ہیں ہمیں اختؔر
وہ راتیں عاشقی کی، وہ مناجاتیں جوانی کی

اشکباری نہ مٹی، سینہ فگاری نہ گئی

اشکباری نہ مٹی، سینہ فگاری نہ گئی!
لالہ کاری کسی صورت بھی ہماری نہ گئی

کوچۂ حُسن چھٹا، تو ہوئے رسوائے شراب
اپنی قسمت میں جو لکھی تھی وہ خواری نہ گئی

ان کی مستانہ نگاہوں کا نہیں کوئی قصور
ناصحو! زندگی، ہم سے ہی سنواری نہ گئی
چشمِ مخزوں پہ نہ لہرائی، وہ زلفِ شاداب
یہ پری ہم سے بھی شیشے میں اتاری نہ گئی
مدتیں ہوگئیں، بچھڑے ہوئے تم سے لیکن
آج تک دل سے مرے یاد تمہاری نہ گئی
شاد و خنداں رہے ہم یوں تو جہاں میں لیکن
اپنی فطرت سے مگر درد شعاری نہ گئی!
سینکڑوں بار مرے سامنے کی توبہ، مگر
توبہ اختر کہ تری بادہ گساری نہ گئی

عشق کہ جس کے دین میں صبر و سکوں حرام ہے

عشق کہ جس کے دین میں صبر و سکون حرام ہے
ایک نظر کا کام ہے، ایک اثر کا نام ہے
گلکدۂ مجاز میں جس کا بہشت نام ہے!
اس کی بہارِ حسن کی نکہت ناتمام ہے
فکر و نظر کی عفتیں، رنگِ ہوس میں غرق ہے
اب تو جہانِ عشق میں ذوقِ گناہ عام ہے

پلائے طلب کے واسطے کوئی نئی زمیں بنا!
دادئی مہر و ماہ تو لغزشِ نیم گام ہے
شان میں مے کی زاہد اب اس کے سوا میں کیا کہوں
میرے لئے حلال ہے، تیرے لئے حرام ہے
عشق میں سوگوار سا، بے خود و بے قرار سا
تم کو خبر ہو یا نہ ہو، اختر اسی کا نام ہے

سما کر دل میں نظروں سے نہاں ہے

سما کر دل میں نظروں سے نہاں ہے
مجھے یاد آنے والے تو کہاں ہے؟
فراز کہکشاں کہتی ہے جس کو
وہ غنزدہ کا خرام رائیگاں ہے
اندھیرے بادلوں سے پوچھ زاہد
مری کھوئی ہوئی توبہ کہاں ہے؟
یہ کس نے پیار کی نظروں سے دیکھا
کہ میرے دل کی دنیا پھر جواں ہے
جوانی رائیگاں جائے تو اچھا!
جوانی ایک خواب رائیگاں ہے

نہ بھول کر بھی تمنائے رنگ و بو کرتے

نہ بھول کر بھی تمنائے رنگ و بو کرتے
چمن کے پھول اگر تیری آرزو کرتے
جنابِ شیخ پہنچ جاتے، حوضِ کوثر تک
اگر شراب سے میخانے میں وضو کرتے
مسرت آہ تو بستی ہے کن ستاروں میں!
زمیں پہ، عمر ہوئی تیری جستجو کرتے
ایاغِ بادہ میں آ کر وہ خود چھلک پڑتا
گر اس کے مست نہ ہاؤ و ہو کرتے
انہیں مفر نہ تھا اقرارِ عشق سے لیکن!
حیا کو ضد تھی کہ وہ پاسِ آبرو کرتے
پکارا اٹھتا وہ آ کر دلوں کی دھڑکن میں
ہم اپنے سینے میں گر اس کی جستجو کرتے
غمِ زمانہ نے مجبور کر دیا، ورنہ!
یہ آرزو تھی کہ بس تیری آرزو کرتے
گراں تھا ساقی، دوراں پہ ایک ساغر بھی
تو کس امید پہ ہم خواہشِ سبو کرتے

جنونِ عشق کی تاثیر تو یہ تھی اختر!
کہ ہم نہیں وہ خود اظہارِ آرزو کرتے

کیا کہہ گئی کسی کی نظر کچھ نہ پوچھئے

کیا کہہ گئی کسی کی نظر کچھ نہ پوچھئے
کیا کچھ ہوا ہے دل پہ اثر کچھ نہ پوچھئے

جھکتی ہوئی نظر سے وہ اٹھتا ہوا سا عشق
اُف وہ نظر، وہ عشق مگر کچھ نہ پوچھئے

وہ دیکھنا کسی کا کنکھیوں سے بار بار
وہ بار بار اُس کا اثر کچھ نہ پوچھئے

رو رو کے کس طرح سے کٹی رات کیا کہیں
مر مر کے کیسے کی ہے سحر، کچھ نہ پوچھئے

اختر دیارِ حسن میں پہنچے ہیں مر کے ہم
کیوں کر ہوا ہے طے یہ سفر کچھ نہ پوچھئے

ہم دُعائیں کرتے ہیں جن کے لئے

ہم دُعائیں کرتے ہیں جن کے لئے ... کاش وہ مل جائیں اک دن کے لئے
میرے ارمانوں سے کہتی ہے اجل ... اس قدر سامان، دو دن کے لئے

وہ غیور اور پاسِ رسوائی ہمیں
کیا بتائیں مر مٹے کن کے لئے

موت لینے آگئی، جانا پڑا
زندگی لائی تھی اس دن کے لئے

اُن کی صحبت کا تصور اور ہم
زندگی دھوکا تھی کچھ دن کے لئے

اُن کو ارماں ہے ہماری موت کا
مر مٹے اے زندگی جن کے لئے

اُن کو رحم آ ہی گیا، آ ہی گئے
حسرتیں مضطر تھیں اس دن کے لئے

اس زمیں میں لکھی اختر نے غزل
سندھ کی اک شوخ کم سن کے لئے

اُن رس بھری آنکھوں میں حیا کھیل رہی ہے

اُن رس بھری آنکھوں میں حیا کھیل رہی ہے
دو زہر کے پیالوں پہ قضا کھیل رہی ہے

ہیں نرگس و گل کس لئے مسحورِ تماشا
گلشن میں کوئی شوخ ادا کھیل رہی ہے

اس بزم میں جائیں تو یہ کہتی ہیں ادائیں
کیوں آئے ہو، کیا سر پہ قضا کھیل رہی ہے

خاموش، وہ خاموش، ذرا شورِ قیامت
کانوں میں وہ مستانہ صدا کھیل رہی ہے

اُس چشمِ سیہ مست پہ گیسو ہیں پریشاں
میخانے پہ گھنگھور گھٹا کھیل رہی ہے

بدمستی میں تم نے انہیں کیا کہہ دیا اختر!
کیوں شوخ نگاہوں میں حیا کھیل رہی ہے؟

دیوانہ کر دیا ہے غمِ انتظار نے

دیوانہ کر دیا ہے غمِ انتظار نے
اب تک خبر نہ لی مری غفلت شعار نے

بیمارِ شامِ ہجر کے آنسو نکل پڑے
کیا کہہ دیا ستارۂ شب زندہ دار نے

مخمورِ خواب بسترِ گل سے اٹھے ہیں وہ
انگڑائی لی ہے باغ میں صبحِ بہار نے

پھولوں سے ہیں لدی ہوئی سرسبز ڈالیاں
کیا چھاؤنی سی چھائی ہے فصلِ بہار نے

دُنیا کے فکر، دین کی باتیں، خدا کی یاد
سب کچھ بھلا دیا ترے دو دن کے پیار نے

تو تو بھلائے دیتی تھی پیرِ مغاں کا گھر
اُٹھ کر بتا دیا ہمیں ابرِ بہار نے

اوروں کی کیا خود اپنی بھی سدھ بدھ نہیں رہی
دُنیا سے کھو دیا ہمیں ظالم کے پیار نے

مسحور کر لئے ہیں بتانِ حرم کے دل
اختؔر ہمارے خامۂ رنگیں نگار نے

اُٹھ اور شکوے نہ کر جورِ آسمانی کے!

اُٹھ اور شکوے نہ کر جورِ آسمانی کے
ستارہ وار، کھلا پھول شادمانی کے

خزاں کی طرح نہ کر رنجِ خانہ ویرانی
بہار بن کے سکھا رنگ گلفشانی کے

فغانِ قیس غلط، شورِ کوہکن بے کار
ہیں آج اور ہی انداز خونفشانی کے

چمن میں دیکھتا ہوں جب کبھی لالہ و گُل کو!
نظر میں پھرتے ہیں نقشے تری جوانی کے

جنابِ خضرؑ جنہیں آج تک سمجھ نہ سکے
وہ راز ہیں ہمیں معلوم زندگانی کے

وہ رات آہ ترے گیسوؤں کی چھاؤں کی رات
ستارے آج بھی شاہد ہیں اُس کہانی کے

گُلِ فسردہ و شمعِ مزار و نجمِ سحر
یہ نقش ہیں مری اُجڑی ہوئی جوانی کے

کبھی عُروج ہوا ہے کبھی زوال نصیب!
عجیب رنگ ہیں اختر جہانِ فانی کے

شرح غمہائے زمانہ سن لے

شرحِ غمہائے زمانہ سُن لے
اپنی زلفوں کا فسانہ سُن لے
کتنی غمگین ہے شرحِ خاموش
قصّہ بزمِ شبانہ سُن لے
چاندنی اور یہ سہانی راتیں
آ کے فرقت کا فسانہ سن لے
سوزِ غم، اک ابدی لذّت ہے
سازِ ہستی کا ترانہ سُن لے
اُس کا وصل اور ہماری قسمت!
کہیں اختر نہ زمانہ سُن لے

آشنا ہو کر تغافل آشنا کیوں ہو گئے

آشنا ہو کر تغافل آشنا کیوں ہو گئے؟
باوفا تھے تم، تو آخر بے وفا کیوں ہو گئے؟
اور بھی رہتے ابھی کچھ دن نظر کے سامنے
دیکھتے ہی دیکھتے، ہم سے خفا کیوں ہو گئے؟
اُن وفاداری کے وعدوں کو الٰہی کیا ہوا؟
وہ وفائیں کرنے والے، بے وفا کیوں ہو گئے؟

کس طرح دل سے بُھلا بیٹھے ہماری یاد کو
اس طرح پردیس جا کر بے وفا کیوں ہو گئے؟
تم تو کہتے تھے کہ ہم تجھ کو نہ بُھولیں گے کبھی
بُھول کر ہم کو تغافل آشنا کیوں ہو گئے؟
ہم تمہارا دردِ دل سُن سُن کے ہنستے تھے کبھی
آج روتے ہیں کہ یوں درد آشنا کیوں ہو گئے؟
چاند کے ٹکڑے بھی نظروں میں سما سکتے نہیں
کیا بتائیں ہم ترے در کے گدا کیوں ہو گئے؟
یہ جوانی، یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں، یہ بہار
حضرتِ اختر ابھی سے پارسا کیوں ہو گئے؟

عمرِ فانی کی ذرا قدر نہ جانی ہم نے

عمرِ فانی کی ذرا قدر نہ جانی ہم نے!
خواب کی طرح سے کھوئی ہے جوانی ہم نے
جو کبھی خواب میں بھی آئیں تو شرما جائیں!
ایسی بدیوں میں گزاری ہے جوانی ہم نے
بھول کر بھی کبھی آیا نہ گناہوں کا خیال
ابر کی طرح لُٹائی ہے جوانی ہم نے

رو دیئے دیکھ کر اس پردہ نشیں کو اختر
اپنی آنکھوں سے کہی دل کی کہانی ہم نے

کس کو دیکھا ہے، یہ ہوا کیا ہے؟

کس کو دیکھا ہے، یہ ہوا کیا ہے؟
دل دھڑکتا ہے ماجرا کیا ہے؟
اک محبت تھی، مٹ چکی یا رب!
تیری دنیا میں اب دھرا کیا ہے؟
دل میں لیتا ہے چٹکیاں کوئی
ہائے اس درد کی دوا کیا ہے؟
حوریں نیکوں میں بٹ چکی ہوں گی
باغِ رضواں میں اب رکھا کیا ہے؟
اُس کے عہدِ شباب میں جینا
جینے والو! تمہیں ہوا کیا ہے؟
اب دوا کیسی، ہے دعا کا وقت
تیرے بیمار میں رہا کیا ہے؟
یاد آتا ہے لکھنؤ اختر!!!
خلد ہو آئیں تو بُرا کیا ہے؟

اے صبا کون سے گلزار سے تو آتی ہے؟

اے صبا کون سے گلزار سے تو آتی ہے؟
تجھ سے اُس غنچہ دہن کی مجھے بُو آتی ہے
پاسِ فطرت کو ہے کتنا مری مے نوشی کا
جو کلی آتی ہے وہ لے کے سبو آتی ہے

رنگ و بو کا پھر اُٹھا صحنِ چمن سے طوفاں
پھر کوئی گلبدن و غالیہ مو آتی ہے!
چاندنی رات کی تاثیر ہے یا نشّۂ مے
مجھ کو ہر پھول سے اُس شوخ کی بو آتی ہے
کچھ تو کہہ ہم سے کہاں آنکھ لڑی ہے اختؔر
تیرے شعروں سے ہمیں عشق کی بو آتی ہے

ادائے پردہ کتنی دلنشیں معلوم ہوتی ہے

ادائے پردہ کتنی دلنشیں معلوم ہوتی ہے
پسِ پردہ کوئی ناز آفریں معلوم ہوتی ہے
نگاہِ ناز کتنی شرمگیں معلوم ہوتی ہے
کوئی محبوبۂ پردہ نشیں معلوم ہوتی ہے
لبِ خاموش میں پنہاں "نہیں" معلوم ہوتی ہے
نگاہِ اوّلیں ہی واپسیں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے
تم اپنا آستاں اچھی طرح پہچان سکتے ہو
ہمیں تو یہ ہماری ہی جبیں معلوم ہوتی ہے

محبّت اِس طرح معلوم ہو جاتی ہے دُنیا کو
کہ یہ معلوم ہوتا ہے، نہیں معلوم ہوتی ہے

سوادِ یاس میں اک پرتوِ اُمید کیا کہیئے!
اندھیرے گھر میں کوئی مہ جبیں معلوم ہوتی ہے

کسی کا عشق آ پہنچا ہے رُسوائی کی منزل تک
نگاہِ شوخ، اب کچھ شرمگیں معلوم ہوتی ہے

ہزاروں میں سے اک دل کو بھی خوش پاتے نہیں اختر
خدائی کس قدر اندوہ گیں معلوم ہوتی ہے

نسیمِ کوئے یار آئے نہ آئے

نسیمِ کوئے یار آئے نہ آئے
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے

خزاں ہی سے نہ کیوں ہم دل لگا لیں
خدا جانے بہار آئے نہ آئے

کیا ہے آنے کا وعدہ تو اُس نے
مرے پروردگار آئے نہ آئے

اُٹھا ساغر، پلا دے پھول ساقی!
کہ پھر ابرِ بہار آئے نہ آئے

مجھے ہے اعتبارِ وعدہ لیکن
تمہیں خود اعتبار آئے نہ آئے

جب مری قبر پہ وہ پھول چڑھانے آئے!

جب مری قبر پہ وہ پھول چڑھانے آئے
موت کی نیند کے ماتوں کو جگانے آئے

کوئی اُس وعدہ فراموش سے اتنا کہہ دے
آپ اب کس لئے روٹھوں کو منانے آئے

آبسے شہرِ خموشاں میں، ملے خاک میں ہم
آپ کیوں خاک کو پھولوں سے بسانے آئے

شمع کی طرح جلاتے تھے ہمیں فرقت میں
اب مری قبر پہ کیوں شمع جلانے آئے

ایک دن تھا کہ مجھے در سے اُٹھا دیتے تھے
اب دعا کے لئے کیوں ہاتھ اُٹھانے آئے

جب میں روتا تھا مرے رونے پہ ہنس دیتے تھے
اب مری یاد میں کیوں اشک بہانے آئے

تم تو اک دن مرے شکوے بھی نہ سن سکتے تھے
اب مجھے کیوں غمِ دل اپنا سنانے آئے

دل میں اَب تک ہوسِ گلبدناں باقی ہے

دل میں اب تک ہوس گلبدناں باقی ہے
مٹ گئی عمرِ جواں، عشقِ جواں باقی ہے

جب تلک عشق کے ہونٹوں پہ فغاں باقی ہے
میرے نغموں کا زمانے میں نشاں باقی ہے

خیر زندہ ہے، نہیں خیر کے بانی زندہ
چل بسا پیرِ مغاں، دیرِ مغاں باقی ہے

ہے نہاں مرگِ شہادت میں حیاتِ ابدی
مٹنے والے تو مٹے، نام و نشاں باقی ہے

یاد کرتے نہیں خود اور ہمیں یاد آتے ہیں
مٹ گیا لطفِ عیاں، جورِ نہاں باقی ہے

کتنے ہی سال گذر جائیں میں یاد آؤں گا!
تیرے در پہ مرے سجدوں کا نشاں باقی ہے

سر سے الفت کا جنوں جا نہیں سکتا اختؔر
جب تلک سینے میں دل، جسم میں جاں باقی ہے

خیالستانِ ہستی میں اگر غم ہے خوشی بھی ہے!

خیالستانِ ہستی میں اگر غم ہے خوشی بھی ہے
کبھی آنکھوں میں آنسو ہیں کبھی لب پر ہنسی بھی ہے

اِنہی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا!
اندھیری رات کے پردے میں دن کی روشنی بھی ہے

یونہی تکمیل ہو گی حشر تک تصویرِ ہستی کی!
ہر اک تکمیل آخر میں پیامِ نیستی بھی ہے

یہ وہ ساغر ہے صہبائے خودی سے پُر نہیں ہوتا
ہمارے جامِ ہستی میں سرشکِ بےخودی بھی ہے

بہار آئی ہے مستانہ گھٹا کچھ اور کہتی ہے

بہار آئی ہے، مستانہ گھٹا کچھ اور کہتی ہے
نگاہِ شوخ نظروں کی حیا کچھ اور کہتی ہے

رہائی کی خبر کس نے اُڑائی صحنِ گلشن میں
اسیرانِ قفس سے تو صبا کچھ اور کہتی ہے

بہت خوش ہے دلِ ناداں، ہوائے کوئے جاناں میں
نگہ ہم سے زمانے کی ہوا کچھ اور کہتی ہے

تو میرے دل کی سُن، آغوش بن کر کہہ رہا ہے کچھ
تری نیچی نظر تو جانے کیا کچھ اور کہتی ہے

مری جانب سے کہہ دینا صبا لاہور والوں سے
کہ اس موسم میں دہلی کی ہوا کچھ اور کہتی ہے

بہت رنگینیاں ہیں یوں تو پہناری باغ میں لیکن
فریدآباد کی "رنگیں حنا" کچھ اور کہتی ہے

ہوئی مدت کہ مے نوشی سے توبہ کر چکے اختر
مگر دہلی کی مستانہ فضا کچھ اور کہتی ہے

وہ کبھی مل جائیں تو کیا کیجئے؟

وہ کبھی مل جائیں تو کیا کیجئے؟
رات دن صورت کو دیکھا کیجئے

چاندنی راتوں میں اک پھول کو
بے خودی کہتی ہے سجدہ کیجئے

جو تمنا بر نہ آئے عمر بھر
عمر بھر اُس کی تمنا کیجئے

عشق کی رنگینیوں میں ڈوب کر
چاندنی راتوں میں رویا کیجئے

پوچھ بیٹھے ہیں ہمارا حال وہ
بے خودی تو ہی بتا کیا کیجئے

ہم ہی اس کے عشق کے قابل نہ تھے
کیوں کسی ظالم کا شکوہ کیجئے

آپ ہی نے دردِ دل بخشا ہمیں
آپ ہی اس کا مداوا کیجئے

کہتے ہیں اختر وہ سن کر میرے شعر
اس طرح ہم کو نہ رسوا کیجئے

اگر وہ اپنے حسین چہرے کو بھول کر بے نقاب کر دے

اگر وہ اپنے حسین چہرے کو بھول کر بے نقاب کر دے
تو ذرّے کو ماہتاب اور ماہتاب کو آفتاب کر دے

تری محبت کی وادیوں میں مری جوانی سے دور کیا ہے
جو سادہ پانی کو اک نشیلی نظر میں رنگیں شراب کر دے

حریمِ عشرت میں سونے والے شمیمِ گیسو کی مستیوں سے
مری جوانی کی سادہ راتوں کو اب تو سرشارِ خواب کر دے

مزے وہ پائے ہیں آرزو میں کہ دل کی یہ آرزو ہے یارب
تمام دُنیا کی آرزوئیں مرے لئے انتخاب کر دے

نظر نہ آنے پہ ہے یہ حالت کہ جنگ ہے شیخ و برہمن میں
خبر نہیں کیا سے کیا ہو دنیا جو خود کو وہ بے نقاب کر دے

میرے گناہوں کی شورشیں اس لئے زیادہ رہی ہیں یارب
کہ ان کی گستاخیوں سے تو اپنے عفو کو بے حساب کر دے

خدا نہ لائے وہ دن کہ تیری سنہری نیندوں میں فرق آئے
مجھے تو یوں اپنے ہجر میں عمر بھر کو بیزارِ خواب کر دے

میں جان و دل سے تصورِ حسنِ دوست کی سرمستیوں کے قرباں
جو اک نظر میں کسی کے بے کیف آنسوؤں کو شراب کر دے

عروسِ فطرت کا ایک کھویا ہوا تبسّم ہے جس کو اخترؔ
کہیں وہ چاہے شراب کر دے، کہیں وہ چاہے شباب کر دے

اُٹھا طوفاں ستاروں کی زمیں سے

اُٹھا طوفاں ستاروں کی زمیں سے
لڑی ہے آنکھ کس زہرہ جبیں سے
نہ دیکھو اس نگاہِ شرمگیں سے
قیامت اُٹھنے والی ہے یہیں سے
مبارک ہو تجھے اے غیرتِ رشک
نہ اُٹھا بارِ غم اس نازنیں سے
گھٹا کے ساتھ آنکھیں اُٹھ رہی ہیں
ہماری توبہ ٹوٹے گی یہیں سے
ہمیں رسوا کیا پردے میں رہ کر
کوئی کہہ دے یہ اس پردہ نشیں سے
نہ دولت ہے، نہ شوکت ہے، نہ حرمت
ہم اخترؔ ہیں گدائے رہ نشیں سے

نہ چھیڑ زاہدِ ناداں شراب پینے دے

نہ چھیڑ زاہدِ ناداں شراب پینے دے
شراب پینے دے خانہ خراب پینے دے
ابھی سے اپنی نصیحت کا زہر دے نہ مجھے
ابھی تو پینے دے اور بے حساب پینے دے
میں جانتا ہوں چھلکتا ہوا گناہ ہے یہ
تو اس گناہ کو بے احتساب پینے دے

پھر ایسا وقت کہاں، ہم کہاں، شراب کہاں
طلسمِ دہر ہے نقشِ برآب پینے دے
مرے دماغ کی دُنیا کا آفتاب ہے یہ
مِلا کے برف میں یہ آفتاب پینے دے
کسی حسینہ کے بوسوں کے قابل اب نہ رہے
تو اُن لبوں سے ہمیشہ شراب پینے دے
سمجھ کے اُس کو غفور الرحیم پیتا ہوں!
نہ چھیڑ ذکرِ عذاب و ثواب پینے دے
جو روح ہو چکی اک بار داغدار مری
تو اور ہونے دے لیکن شراب پینے دے
شراب خانے میں یہ شور کیوں مچایا ہے
خموش اخترِ خانہ خراب پینے دے

عِشق کی مایوسیوں میں کھو چکے

عِشق کی مایوسیوں میں کھو چکے
اے جوانی جا تجھے، ہم رو چکے
مقصدِ فصلِ جوانی تھا یہی
عشق میں ساری جوانی کھو چکے
میرا ویرانہ ترستا ہی رہا!
پھول کھِل کر، بے نشاں بھی ہو چکے
داغِ حسرت ہے ابھی تک گرچہ ہم
آنسوؤں سے دل کا دامن دھو چکے

جاگ اے دل، آگیا شہرِ فنا منزلِ ہستی ہیں کافی سو چکے
آج کی شب پھر کوئی یاد آگیا!
آج کی شب بھی ہم اخترؔ سو چکے

مجھے اپنی پستی کی شرم ہے تری رفعتوں کا خیال ہے

مجھے اپنی پستی کی شرم ہے تری رفعتوں کا خیال ہے
مگر اپنے دل کو میں کیا کروں اسے پھر بھی شوقِ وصال ہے

اس ادا سے کون یہ جلوہ گر سرِ بزمِ حسنِ خیال ہے
جو نفس ہے مستِ بہار ہے، جو نظر ہے غرقِ جمال ہے

انہیں ضد ہے عرضِ وصال سے مجھے شوقِ عرضِ وصال ہے
وہی اب بھی اُن کا جواب ہے وہی اب بھی میرا سوال ہے

تری یاد میں ہوا جب سے گُم، ترے گُم شدہ کا یہ حال ہے
کہ نہ دُور ہے نہ قریب ہے، نہ فراق ہے نہ وصال ہے

تری بزم، خلوتِ لامکاں، ترا آستاں مہ و کہکشاں
مگر اے ستارۂ آرزو مجھے آرزوئے وصال ہے

میں وطن میں رہ کے بھی بے وطن کہ نہیں ہے ایک بھی ہم سخن
ہے کوئی شریکِ غم و محن تو وہ اک نسیمِ شمال ہے

میں بتاؤں واعظِ خوش نوا، ہے جہان و خلد میں فرق کیا
یہ اگر فریبِ خیال ہے، وہ فریبِ حُسنِ خیال ہے
یہی دادِ قصۂ غم ملی کہ نظر اُٹھی، نہ زباں ہِلی!
فقط اک تبسّم ہنس پڑیں، مری بےکسی کا مآل ہے
وہ خوشی نہیں ہے وہ دل نہیں، مگر ان کا سایہ سا ہم نشیں
فقط ایک غمزدہ یاد ہے، فقط اک فسردہ خیال ہے
کہیں کس سے اخترِ بےنوا ہمیں بزمِ دہر سے کیا ملا
وہی ایک ساغرِ زہرِ غم جو حریفِ نوشِ کمال ہے

زمانِ ہجر مٹے، دورِ وصلِ یار آئے!

زمانِ ہجر مٹے، دورِ وصلِ یار آئے
الٰہی اب تو خزاں جائے اور بہار آئے
ستم ظریفیٔ فطرت، یہ کیا معمّا ہے
کہ جس کلی کو بھی سونگھوں میں، بوئے یار آئے
چمن کی ہر کلی، آمادۂ تبسّم ہے!
بہار بن کے مری جانِ نو بہار آئے
ہیں تشنہ کام ہم ان بادلوں سے پوچھے کوئی
کہاں بہار کی پریوں کے تخت اتار آئے

کسی کا شکوہ عبث یہ دعائیں مانگ اے دل
کہ اب ملیں تو ہمیں اس قدر نہ پیار آئے

ترے خیال کی بے تابیاں معاذ اللہ
کہ ایک بار بھلائیں تو لاکھ بار آئے

گھٹا وہ اٹھی ہے پھر بمبئی کے ساحل سے
کہ مجھ تلک اگر آئے تو مشکبار آئے

وہ آئیں یوں مرے آغوشِ عشق میں اختر
کہ جیسے آنکھوں میں اک خوابِ بے قرار آئے

سوئے کلکتہ جو ہم بادلِ دیوانہ چلے!

سوئے کلکتہ جو ہم بادلِ دیوانہ چلے
گنگناتے ہوئے اک شوخ کا افسانہ چلے

شہرِ سلمیٰ ہے سرِ راہ، گھٹائیں ہمراہ
ساقیہ آج تو دورِ مئے و پیمانہ چلے

اس طرح ریل کے ہمراہ رواں ہے بادل
ساتھ جیسے کوئی اڑتا ہوا میخانہ چلے

شہرِ جاناں میں اترنے کی تھی ہم پہ قدغن
یوں چلے جیسے کوئی شہر سے بیگانہ چلے

گرچہ تنہا تھے مگر اُن کے تصور کے نثار
اپنے ہمراہ لئے ایک پری خانہ چلے
کھیل اُمید کے دیکھو کہ نہ کی اُن کو خبر
پھر بھی ہم منتظر جلوۂ جانانہ چلے
ان کا پیغام نہ لائے ہوں یہ رنگیں بادل
ورنہ کیوں ساتھ مرے بیخود و مستانہ چلے
گھر سے باعشرتِ شاہانہ ہم آئے تھے مگر
اُن کے کوچے سے چلے جب تو فقیرانہ چلے
بادلو! خدمتِ سلمیٰ میں یہ کہہ دو جا کر
کہ ترے شہر میں ہم آ کے غریبانہ چلے
حسرت و شوق کے عالم میں چلے یوں اختر
مسکراتا ہوا جیسے کوئی دیوانہ چلے

مری آنکھوں سے ظاہر خوں فشانی اب بھی ہوتی ہے

مری آنکھوں سے ظاہر خوں فشانی اب بھی ہوتی ہے
نگاہوں سے بیاں دل کی کہانی اب بھی ہوتی ہے
بہشتوں سے خدا دنیائے فانی اب بھی ہوتی ہے
جنوں کو حرص عمر جاودانی، اب بھی ہوتی ہے

سرور آرا شرابِ ارغوانی اب بھی ہوتی ہے
مرے قدموں میں دُنیا کی جوانی اب بھی ہوتی ہے

کوئی جھونکا تو لاتی، اے نسیم، اطرافِ کنعاں تک
سوادِ مصر میں عنبر فشانی اب بھی ہوتی ہے

وہ شب کو مشکبو پردوں میں چھپ کر آہی جاتے ہیں
مرے خوابوں پر اُن کی مہربانی اب بھی ہوتی ہے

کہیں سے ہاتھ آ جائے تو ہم کو بھی کوئی لا دے
سنا ہے اس جہاں میں شادمانی، اب بھی ہوتی ہے

ہلال و بدر کے نقشے سبق دیتے ہیں انساں کو
کہ ناکامی بنائے کامرانی، اب بھی ہوتی ہے

کہیں اغیار کے خوابوں میں چھپ چھپ کر نہ جاتے ہوں
وہ پہلو میں ہیں لیکن بدگمانی، اب بھی ہوتی ہے

سمجھتا ہے شکستِ توبہ، اشکِ توبہ کو زاہد!
مری آنکھوں کی رنگت ارغوانی، اب بھی ہوتی ہے

وہ برساتیں، وہ باتیں، وہ ملاقاتیں کہاں ہمدم
وطن کی رات ہونے کو سہانی، اب بھی ہوتی ہے

خفا ہیں، پھر بھی آکر چھیڑ جاتے ہیں تصور میں!
ہمارے حال پر کچھ مہربانی اب بھی ہوتی ہے

زباں ہی بیں نہ ہو تاثیر تو میں کیا کہوں ناصح !!!
تیری باتوں سے پیدا اسرگرانی اب بھی ہوتی ہے
تمہارے گیسوؤں کی چھاؤں میں اک رات گذری تھی !
ستاروں کی زباں پر یہ کہانی، اب بھی ہوتی ہے
پسس تو یہ بھی پی لیتے ہیں، جامِ غنچہ و گل سے
بہاروں میں جنوں کی میہمانی اب بھی ہوتی ہے
کوئی خوش ہو، مری مایوسیاں فریاد کرتی ہیں!
الٰہی! کیا جہاں میں شادمانی اب بھی ہوتی ہے
بتوں کو کر دیا تھا جس نے مجبورِ سخن اختر
لبوں پر وہ نوائے آسمانی اب بھی ہوتی ہے

جھنڈے گڑے ہیں باغ میں ابرِ بہار کے

جھنڈے گڑے ہیں باغ میں ابرِ بہار کے
قربان جاؤں رحمت پروردگار کے
گلشن میں چند راتیں خوشی کی گزار کے!
ابرِ رواں کے ساتھ گئے دن بہار کے
وہ رنگ اب کہاں چمنِ روزگار کے !!!
بلبل کے نغمے ہیں نہ ترانے ہزار کے

رسوائی کے دن آئے کسی میگسار کے
آنے لگے سلام چمن سے بہار کے

بے تاب ولولے ہیں ترے انتظار کے
آ اے مری بہار دن آئے بہار کے

ابرِ سیہ میں برقِ حسیں لہلہا اُٹھی
یا آگئے وہ سامنے گیسو سنوار کے

اے ابر لے سنبھال کہ ہم ہاتھ سے چلے
اے توبہ الوداع دِن آئے بہار کے

باغوں پہ جُھوم جُھوم کے بادل نہیں اُٹھے
گیسو بکھر رہے ہیں عروسِ بہار کے

آؤ کہ ایسا وقت نہ پاؤ گے پھر کبھی
آتے ہیں روز روز کہاں دن بہار کے

اختر کسی کے گھر سے اس انداز سے چلے
جیسے گزار آئے ہوں دن سب بہار کے

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی
شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی

شباب کے لئے تو یہ عذاب ہے یارب
شراب لا مجھے پاس شباب ہے ساقی

اُٹھا پیالہ کہ گلشن پہ پھر برسنے لگی
وہ مے کہ جس کا قدح ماہتاب ہے ساقی

نکال پردۂ مینا سے دخترِ رز کو
گھٹا میں کس لئے یہ ماہتاب ہے ساقی

تُو واعظوں کی نہ سُن میکشوں کی خدمت کر
گنہ ثواب کی خاطر ثواب ہے ساقی

زمانہ بھر کے غموں کو ہے دعوتِ عشرا
کہ ایک جام میں سب کا جواب ہے ساقی

کلام جس کا ہے معراجِ حافظؔ و خیّام!
یہی وہ اخترِ خانہ خراب ہے ساقی
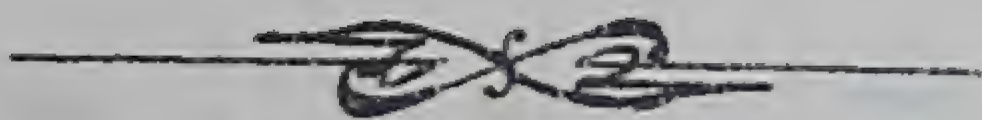
رُباعیات

(۱)

عید آئی ہے عیش و نوش کا ساماں کر
اک ساقیِ گلعذار کو مہماں کر
قربانی ہے واجب آج اختر تو بھی
توبہ کو خدا کے نام پر قرباں کر

(۲)

میخانہ بدوش ہیں گھٹائیں ساقی
پیمانہ فروش ہیں فضائیں ساقی
اک جام پلا کے مست کر دے مجھ کو
غارت گرِ ہوش ہیں ہوائیں ساقی

(۳)

رندوں کو بہشت کی خبر دے ساقی
اک جام پلا کے مست کر دے ساقی
پیمانۂ عمر ہے چھلکنے کے قریب
بھر دے ساقی، شراب بھر دے ساقی

(۴)

موسم بھی ہے، عمر بھی، شباب بھی ہے
پہلو میں وہ رشکِ ماہتاب بھی ہے
دنیا میں اب اور چاہیئے کیا مجھ کو
ساقی بھی ہے، ساز بھی، شراب بھی ہے

(۵)

جنّت کا سماں دکھا دیا ہے مجھ کو
کونین کا غم بھلا دیا ہے مجھ کو
کچھ ہوش نہیں کہ ہوں میں کس عالم میں
ساقی نے یہ کیا پلا دیا ہے مجھ کو

گیت

(۱)

روگ کا راگ!

اُنہیں جی سے میں کیسے بُھلاؤں سکھی میرے جی کو جو آکے لُبھا ہی گئے
میرے من میں وہ پریم بسا ہی گئے، مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے
کئے میں نے ہزار ہزار جتن، کہ بچا رہے پریت کی آگ سے من
مرے من میں اُبھار کے اپنی لگن، وہ لگاؤ کی آگ لگا ہی گئے
بڑے سُکھ سے یہ بیتے تھے چودہ برس، کبھی میں نے پیا نہ تھا پریم کا رس
مری آنکھوں کو شیام دکھا کے درس، مرے ہردے میں چاہ بسا ہی گئے
کبھی سپنوں کی چھاؤں میں سوئی نہ تھی، کبھی بھول کے دُکھ سے میں روئی نہ تھی
مجھے پریم کے سپنے دکھا ہی گئے، مجھے پریت کے دُکھ سے رُلا ہی گئے
رہے رات کی رات سدھار گئے، مجھے سپنا سمجھ کے بسار گئے
میں تھی ہار، گلے سے اُتار گئے، میں دیا تھی جسے وہ بجھا ہی گئے

سکھی، کوئلیں ساؤنی گائیں گی پھر، نئی کلیاں بھی چھاؤنی چھائیں گی پھر
مرے چین کی راتیں نہ آئیں گی پھر، جنہیں نین کے نیر مٹا ہی گئے
مرے جی میں تھی بات چھپائے رکھوں، سکھی چاہ کو من میں دبائے رکھوں
اُنہیں دیکھ کے آنسو جو آہی گئے، مری چاہ کا بھید وہ پا ہی گئے

(۲)

پردیسی کی پریت

پردیسی کی پریت ہے جھوٹی   جھوٹی پردیسی کی پریت
ہائے ہوئے کی ہیت ہی جھوٹی   دنیا کی یہ ریت ہے جھوٹی
پردیسی کی پریت ہی جھوٹی!
پردیسی کی پریت ہے جھوٹی   جھوٹی پردیسی کی پریت

پردیسی سے دل کا لگانا   بہتے پانی میں ہے نہانا
کوئی نہیں ندّی کا ٹھکانا!
رمتے جوگی کس کے میت
پردیسی کی پریت ہے جھوٹی   جھوٹی پردیسی کی پریت

اُڑتی چڑیا گاتی جائے!
میٹھا گیت مٹھاس بہائے
یوں پردیسی من کو لبھائے
اُڑ گئی چڑیا، اُڑ گیا گیت!
پردیسی کی پریت ہے جھوٹی
جھوٹی پردیسی کی پریت

(۳)

بادل کا سندیسہ

آئے ہیں بادل چھائے ہیں بادل!
کس کا سندیسہ لائے ہیں بادل؟
باغ میں کوئل کوک اُٹھی پھر
دل میں ہمارے ہُوک اُٹھی پھر
کون نگر سے آئے ہیں بادل؟
کس کا سندیسہ لائے ہیں بادل؟
برہا میں کیوں برباد کیا ہے؟
ہم کو یہ کس نے یاد کیا ہے؟
یادوں بن کر چھائے ہیں بادل!
کس کا سندیسہ لائے ہیں بادل؟
پی بن ہے برسات اندھیری
چھا گئی من پر رات اندھیری
ایسے میں کیوں آئے ہیں بادل؟
کس کا سندیسہ لائے ہیں بادل؟

(۴)

برہن کی جوانی

برہ میں بیتی جائے جوانی　　　پریتم! برہ میں بیتی جائے جوانی

روگ لگا ہے کیسا جی کو!

لکھ دے کوئی پردیسی پی کو

پھولوں سی کملائے جوانی　　　سجنی! پھولوں سی کملاتے!

مایوسی نے من کو ہے گھیرا

آنسوؤں کا آنکھوں میں بسیرا

آنسو بنے بہہ جائے جوانی　　　سجنی! برہن کو تڑپائے

رین اندھیری سیج ہے سونی

بپتا پڑی ہے آ کر دونی

برہن کو تڑپائے جوانی　　　سجنی! برہن کو تڑپائے!!!

---

(۵)

پردیسی

بھول نہ جانا او پردیسی　　　او پردیسی! بھول نہ جانا!

پھر بھی آنا او پردیسی　　　او پردیسی! پھر بھی آنا!

چلتے رستے پریت لگائی
بھولے من پر آفت ڈھائی
ہوتی ہے کیا پیڑ پرائی
یہ بھی نہ جانا او پردیسی! او پردیسی! یہ بھی نہ جانا
بھول نہ جانا او پردیسی! او پردیسی! بھول نہ جانا

میں تو تھی الھڑ بھولی بھالی
گانو کی سادہ رہنے والی
من تھا مورکھ پریم سے خالی
من تھا مورکھ تو تھا سیانا تو تھا سیانا او پردیسی!
بھول نہ جانا او پردیسی! او پردیسی! بھول نہ جانا

شہر میں جاکر دل نہ لگانا!
لوٹ کے پھر اس گانو میں آنا!
گانو ہی کا ہے پریم سہانا!
پریم سہانا او پردیسی! او پردیسی! پریم سہانا!
بھول نہ جانا او پردیسی! او پردیسی! بھول نہ جانا
پھر بھی آنا او پردیسی! او پردیسی! پھر بھی آنا

(۶)

انتظار

اب بھی نہ آئے من کے چین
بیت چلی ہے آدھی رین!
نا کوئی ساتھن نا کوئی سجنی نا کوئی میرے پاس سہیلی!
برہ کی لمبی رات گزاروں ڈر کی ماری کیسے اکیلی
نیر بہائیں کب تک نین
اب بھی نہ آئے من کے چین
نظریں جمی ہیں چوکھٹ پر اور کان لگے ہیں ہر آہٹ پر
آنکھوں سے ننھے ننھے سے آنسو بہتے ہیں اک اک کروٹ پر
کرتی ہوں چپکے چپکے بین!!
اب بھی نہ آئے من کے چین
بیت چلی ہے آدھی رین!

(۷)

جدائی میں!

اب تو آؤ پاس ہمارے
دل کے سہارے آنکھ کے تارے

بیت چلیں مہتاب کی راتیں پیار کے میٹھے خواب کی راتیں
ہجر کے دن بھی کتنے گزارے
اب تو آؤ پاس ہمارے
کاہے کو سوں، چھاؤنی چھائی دل سے ہماری یاد بھلائی!
بیٹھے ہو کب سے ہم کو بسارے
اب تو آؤ پاس ہمارے
خوش ہے بُلبل پھول کے غم سے اور پتنگا شمع کے دم سے
ہائے جئیں ہم کس کے سہارے
اب تو آؤ پاس ہمارے

(۸)

بُلاوا!!!

آؤ سجن گھر آؤ رے اب تو ہم کو سونی رات ڈرائے
کاری کاری بدلی رلائے، بجلی من میں آگ لگائے
سونی رات ڈرائے ساجن — ہم کو سونی رات ڈرائے
کوئل کوکے مدھ ماتی اور کسکن کر دھڑکے میری چھاتی!
ایسے میں، ہے کون جو میرے بچھڑے پی کو منا کر لائے
سونی رات ڈرائے ساجن — ہم کو سونی رات ڈرائے

پی ہیں میرے، میں ہوں پی کی، بات چھپاؤں کیونکر جی کی
پی پی کرکے پی کی کہانی، پاپی پپیہا پھر کیوں گائے
سُونی رات ڈرائے ساجن		ہم کو سُونی رات ڈرائے

(۹۱)

ساون کی گھٹائیں

ساون کی گھٹائیں چھا گئی ہیں!
برسات کی پریاں آگئی ہیں
دل دینے کی رُت آئی ہے		سینوں میں اُمنگ سمائی ہے
ارمانوں نے عید منائی ہے
اُمیدیں جوانی پا گئی ہیں
کہیں سنبل و گل کی بہاریں ہیں		کہیں سرو وسمن کی قطاریں ہیں
کہیں سبزے نے رنگ نکالا ہے
کہیں کلیاں جوانی پا گئی ہیں
کہیں کوئل شور مچاتی ہے		کہیں بلبل نغمے گاتی ہے
کہیں مور ملہار سناتے ہیں
گھنی بدلیاں دھوم مچا گئی ہیں

ماھیا

پنجابی کا ایک مقبول صنفِ سخن تصرف کے ساتھ

کیا روگ لگا بیٹھے

کیا روگ لگا بیٹھے
دل ہم کو لٹا بیٹھا ، ہم دل کو لٹا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

مٹ جائے یہ سینے سے
اس عشق میں جینے سے ، ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

دم عشق کا بھرتے ہیں !
ہم یاد انہیں کرتے ہیں ، وہ ہم کو بھلا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

لکھا تھا یہ قسمت میں
آخر کو محبت میں ، ہم جان گنوا بیٹھے !
کیا روگ لگا بیٹھے

شہناز

اخترؔ شیرانی کا پانچواں مجموعۂ کلام

چہرہ نما

بجاں آتش زند ہر کہ زبرقع پردہ بردارد
بہ شہنازش رسد ہر گاہ گیرد اوج شہنازش

پہلا خط

اس شوخ نے لکھا ہے ہمیں پہلی بار خط!
جس پر فدا ہزار نہیں، سو ہزار خط!
ہونٹوں سے کھولتا ہوں لفافہ کہ بند رہے
کچھ دور رہی ہے ... کی اک یادگار خط
ظالم نہیں، یہ ان کی طرح سنگدل نہیں
سینے سے آلگا مرے، بے اختیار خط
یہ پھول ہے کہ پھول سے عارض کا عکس ہے
یکسر، بنا ہوا ہے طلسمِ بہار خط
حیران ہوں کہ اُن میں سے کس پر کروں یقیں!
یہ بے حجاب طرز، یہ بیگانہ وار خط
کس نازنیں کے ہاتھ کا پرتو ہے کیا کہوں؟
یہ خط، یہ دل فریب خط، اور عطر بار خط
ہر لفظ میں چھپی ہیں ہزاروں لطافتیں
کس نازنیں کے عشق کا ہے رازدار خط
میری نگاہِ شوق سے شرمائے کیوں نہ یہ؟
ایک پردہ دارِ حسن کا ہے پردہ دار خط

ایک ایک حرف دل میں سما جائے ناز سے
پڑھتا ہوں اس لئے میں ترا بار بار خط
بیداریوں پہ بھی ہے گماں مجھ کو خواب کا
یہ آنکھیں اور یہ مرے پروردگار خط
یہ سوز و ساز آہ، یہ جذب و گداز ہائے
یہ بے قرار لفظ، یہ سینہ فگار خط!
اختر کے آنسوؤں کی دعائیں قبول کر
اے اُس کے دردِ عشق کے آئینہ دار خط

ترانۂ بہار

بہشت زارِ بیخودی سے اُڑ کے آ رہا ہوں میں
شرابِ خوشگوار کے ترانے گا رہا ہوں میں
زمین و آسماں پہ نشہ بن کے چھا رہا ہوں میں

نہ یہ خبر کہ کون ہوں؟ نہ یہ خبر کہاں ہوں میں؟
زمیں پہ ہوں؟ فضا میں ہوں؟ کہ زیبِ آسماں ہوں میں؟
جو ہوش ہے تو اس قدر کہ بیخود جہاں ہوں میں

زمیں پہ آج ہو رہی ہیں بارشیں شراب کی!
افق پہ محوِ رقص ہیں ترادشیں شراب کی!

عنایتیں شباب کی، نوازشیں شراب کی

عروسِ نوبہار ہے، ترانہ بار باغ ہیں!
مچلتی ہے نوائے بلبلِ دہزار باغ ہیں!
ہے آج تہنیت میں محو جوئبار باغ ہیں

بہار آئی ہے، تمام لالہ زار مست ہے
فضائے سبزہ زار و دشت وکوہسار مست ہے
چمن ہو یا دمن، بہار در بہار مست ہے

نمودِ فصلِ گل ہے آج، کائنات شاد ہے
ہر ودزار دہر و محفلِ حیات شاد ہے
نواگریٔ بربطِ تخیلات شاد ہے

مبارک آج کا حسین منظر این و آں کو ہو
بہارِ تازہ یہ نصیب سارے گلستاں کو ہو
جو انبساط دل کو ہو تو اہتزاز جاں کو ہو

کدھر ہے ساقیٔ حسیں، شراب لا شراب لا
مرے لئے ایاغِ گل میں نورِ ماہتاب لا
خوشی کا جذبہ دل میں ہے خوشی کا آفتاب لا

وہ جام لا کہ جس کو پی کے غم کو میں سزائیں دوں
خوشی کو لاؤں وجد میں، سرور کو صدائیں دوں

اور اس ہجومِ کیف میں بہار کو دُعائیں دوں

کئی دن سے!

آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے!
دیکھا نہیں وہ چہرۂ خنداں کئی دن سے
افسردہ ہے رُوحِ چمنستاں کئی دن سے
ناشاد ہیں سرو و گل و ریحاں کئی دن سے
غم خانہ ہے منظر دل میں گلستاں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے!

میں ڈھونڈھتا ہوں جس کو وہ مہ پارہ کہاں ہے؟
وہ جنّتِ انوار کا نظّارہ کہاں ہے؟
شادابیٔ نکہت کا وہ گہوارہ کہاں ہے؟
میری شبِ افکار کا ستّارہ کہاں ہے؟
محرومِ ضیا کیوں ہے؟ شبستاں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے!

حیراں ہوں مرے سروِ خراماں کو ہوا کیا؟
اس شمعِ شبستانِ دل و جاں کو ہوا کیا؟
تشنہ ہے فضا جلوۂ جاناں کو ہوا کیا؟

بے تاب ہیں گُل، اُس گُلِ خنداں کو ہوا کیا؟
ناراض ہے کیوں وہ گُلِ خنداں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے!

ہے دُور نگاہوں سے وہ جانِ چمنستاں
مغموم ہے ایک ایک جوانِ چمنستاں
بے تاب ہے چشمِ نگرانِ چمنستاں
پژمردہ ہیں شادابِ رُخانِ چمنستاں
محرومِ طرب ہے، چمنستاں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے!

دیدار کی اُمّید میں بے تاب ہیں آنکھیں
بے نُور ہیں، بے رنگ ہیں، بے آب ہیں آنکھیں
تاروں کی طرح، رات کو بے خواب ہیں آنکھیں
پھر تشنۂ دیدِ گُلِ مہتاب ہیں آنکھیں!
مچلے نہیں آنکھوں میں خیاباں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے

کیا بات ہوئی، کیوں وہ فلکِ ناز نہ آئی؟
وہ شوخ ادا، حورِ فسوں ساز نہ آئی؟
وہ پیکرِ مہ ہیکلِ اعجاز نہ آئی؟

ویراں ہے شبستاں کوئی آواز نہ آئی ؟
کیوں دُور ہے وہ ماہ خراماں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے!

ہے پیشِ نظر، ہیکلِ گلفام کسی کا !
کہتا ہے فسانہ دلِ ناکام کسی کا!
وارفتگیٔ شوق ہے اور نام کسی کا!
دُہراتی ہے قصّہ شفقِ شام کسی کا!
دیکھا نہیں رنگِ رُخِ شفق افشاں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے!

وہ جانِ چمن، رُوحِ چمن زار، کدھر ہے ؟
وہ لعلِ حسین و رُخِ گلنار، کدھر ہے ؟
بے تاب ہے دل صورتِ دلدار، کدھر ہے ؟
مُضطر ہے نظر جلوۂ گل کار، کدھر ہے ؟
لہرائے نہیں کاکلِ رقصاں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے!

تسکیں کا اثر بزمِ گلستاں میں نہیں ہے !
خوشبوئے سکوں لالہ و ریحاں میں نہیں ہے !
راحت کوئی انبوہِ بہاراں میں نہیں ہے !

اب صبر کی طاقت، دلِ ناداں میں نہیں ہے
بے تاب ہے اختر دلِ ناداں کئی دن سے
آئی نہیں وہ جانِ بہاراں کئی دن سے!

انتظارِ دعوت

شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟
روٹھی ہوئی اُمید کو کب تک مناؤ گی؟
کس دن بہارِ چہرۂ گلگوں دکھاؤ گی؟
کس رات ابرِ زلف سے بجلی گراؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

کب سے تمہاری یاد میں دل بے قرار ہے؟
کب سے تمہارے ہجر میں سینہ فگار ہے؟
کب سے تمہارے خط کا ہمیں انتظار ہے؟
تکلیفِ انتظار سے کب تک چھڑاؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

کب تک پھریں گے غم زدہ شہر و دیار میں
بھٹکیں گے کب تلک چمن و سبزہ زار میں
روئیں گے پھول دیکھ کے کب تک بہار میں

تم اپنے عارضوں کی جھلک کب دکھاؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

میں شہر میں کبھی، کبھی ویرانے میں قیام
صحرا میں ہیں کبھی، کبھی کاشانے میں قیام
مسجد میں ہیں کبھی، کبھی بُت خانے میں قیام
تم اپنا آستاں ہمیں کس دن بتاؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

کب بُوئے پیرہن ہمیں بے خود بنائے گی؟
کب چشمِ مست، ساغر و مینا گرائے گی؟
زلفِ سیاہ، سینے پہ کب لہلہائے گی؟
کس دن نشاط و نشّہ و نکہت لٹاؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

ویراں ہے کائنات تمہارے فراق میں
غمگیں ہیں شش جہات تمہارے فراق میں
ظلمت کدہ ہے رات تمہارے فراق میں
برقِ جمال سے اسے کب جگمگاؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

راتوں کو دیکھتے ہیں تمہارے ہی خواب ہم

پاتے ہیں اپنے سامنے سوماہتاب ہم
اُٹھتے ہیں روز صبح کو دیدۂ پُرآب ہم
راتوں کو اس طرح، کہو کب تک ستاؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

دل میں جو تھے اُمید کے سامان مٹ چلے
شاداب آرزوؤں کے طوفان مٹ چلے
دل کیا مٹا! کہ دل کے سب سامان مٹ چلے
کُملا رہے ہیں پھول، انہیں کب کھلاؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

سوچو! کہ پھر زمانہ کہاں اور ہم کہاں؟
یہ عشق کا فسانہ کہاں اور ہم کہاں؟
یہ وقت یہ ترانہ کہاں اور ہم کہاں؟
پھر اس سمے کا نام و نشاں تک نہ پاؤ گی!
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

پھر وادیوں میں ایسی ہوائیں نہ آئیں گی!
چشموں کی دھیمی دھیمی صدائیں نہ آئیں گی!
کہسار پر یہ مست گھٹائیں نہ آئیں گی!
ان قیمتی نظاروں کو کب تک لٹاؤ گی؟

شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

مستقبل اس جہاں میں فقط نقشِ خام ہے
امید کا حباب کی صورت قیام ہے
اور عمر، بادلوں کی طرح تیز گام ہے
کب تک یہ غم — عمرِ جوانی گنواؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

دن رات ہے پیامِ محبت کا انتظار
آنکھیں ہیں اور نامۂ شیریں کا انتظار
اُف انتظار اور یہ قیامت کا انتظار
کب تک یہ انتظار کی کلفت مٹاؤ گی؟
شملے کی وادیوں میں ہمیں کب بلاؤ گی؟

بھولی ہوئی خوشبو
ایک خط کی رسید

پھر وہی نکہتِ مستانہ کدھر سے آئی؟
سحر دم گیسوئے جاناں کدھر سے آئی؟
سالہا سال کی محرومی و تنہائی کے بعد
یہ انیسِ دلِ دیوانہ کدھر سے آئی؟

آہ وہ نکہتِ مدہوش جو کھو دیتی تھی ہوش
پھر جلو میں لئے میخانہ، کدھر سے آئی؟

ایک دن جس سے مہکتا تھا حریمِ سلمیٰ
وہی "خوشبوئے" دلِ دیوانہ کدھر سے آئی؟

ایک بھولا ہوا خواب، ایک بھلائی ہوئی یاد
لے کے یہ مونسِ جانانہ کدھر سے آئی؟

اُس کے پیراہنِ رنگیں میں جو بستی تھی مہک
پھر بناتی ہوئی دیوانہ، کدھر سے آئی؟

چپکے چپکے جسے سُنتی تھی شبِ وصل، صبا
گنگناتی وہی افسانہ، کدھر سے آئی؟

جس کی مستی میں ہیں گُم، ارض و سماں تک وہ شمیم
پھر لُٹاتی ہوئی میخانہ، کدھر سے آئی؟

جس کی ہر لہر میں ہے حُسنِ غزل خواں وہ نسیم
آج یوں جانبِ کاشانہ، کدھر سے آئی؟

جس کی ہر موج میں فردوس ہے رقصاں وہ ہوا
پھر لنڈھاتی ہوئی خُم خانہ، کدھر سے آئی؟

جس کے قدموں پہ پری خانۂ انجم ہو نثار
وہ پری، جانِ پری خانہ، کدھر سے آئی؟

جس کو احساس کے ہونٹوں سے پیا کرتے تھے
حور اٹھلائے وہی پیمانہ، کدھر سے آئی؟

رہ گزاروں پہ ہوا کرتی تھی جس کی حسرت
گھر پہ وہ نکہتِ تنہا ہانہ، کدھر سے آئی؟

لے کے گیسوئے سلمیٰ کا پیامِ رنگیں!
آج یہ قاصدِ جانانہ، کدھر سے آئی؟

عزمِ رنگیں

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا
چپکے سے خواب گاہ کے پردے اٹھاؤں گا
دستِ صبا کی طرح تجھے گدگداؤں گا
اور تیرے پائے ناز پہ سجدے لٹاؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

ہر چند راہ روکیں گے دیوار و در ترے
آنے نہ دیں گے باغ میں نخل و شجر ترے
چوموں گا دستِ ناز نیں آ کر مگر ترے!

دزدِ حنا کی طرح تجھے گدگداؤں گا!
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

تو میرے پاس آنے سے معذور ہی سہی
میرا فراق بھی تجھے منظور ہی سہی!
یہ بھی سہی کہ مجھ سے بہت دُور ہی سہی!
اِن دُوریوں کو وصل کا عالم دکھاؤں گا!
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

تو محوِ خواب ہو گی شبستانِ ناز میں!
آسودہ، اپنی خلوتِ رنگیں طراز میں!
مُنہ کو چھپائے سایۂ زلفِ دراز میں!
سایہ سا بن کے میں بھی نظر میں سماؤں گا!
میں خواب بن کے تیرے شبستان میں آؤں گا

تسلیم ہے بہت سے خلل ہوں گے راہ میں
بے شک تباہیوں کے محل ہوں گے راہ میں
دریا و کوہ و دشت و جبل ہوں گے راہ میں
دریا و کوہ و دشت کو نیچا دکھاؤں گا!
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

بے خواب ہو گی گر تو شبِ مشکبار میں!

کھوئی ہوئی ترانۂ ابرِ بہار میں!
میں آ بسوں گا دیدۂ افسانہ کار میں!
اور اک فسانہ تجھ کو سنا کر سلاؤں گا!
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

قرباں کروں گا تجھ پہ گُلِ نو بہار، میں!
لعل و گہر منگاؤں گا، بہرِ نثار، میں!
پہناؤں گا گلے میں ستاروں کے ہار میں
بستر پہ تیرے خُلد کی کلیاں بچھاؤں گا
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا

دیکھے گی خواب میں تو نظارے بہار کے
نظروں میں جگمگائیں گے تارے بہار کے
رقصاں لبوں پہ ہوں گے شرارے بہار کے
اور میں ترے لبوں سے شرارے چُراؤں گا!
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا
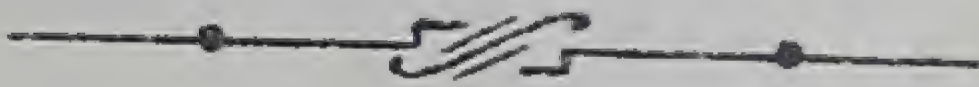
جرأت آموزی

(مستزاد)

کیا ہوا میں نے اگر عشق کا اظہار کیا
آپ سے پیار کیا؟
آپ نے کیوں مرے ارمانوں کو بیدار کیا
دل کو سرشار کیا؟
غم کا اقرار کہ وہ مجھ میں یہ ہمت ہی نہ تھی
دل کو جرأت ہی نہ تھی
دل کو کیوں گیسوئے مشکیں میں گرفتار کیا
وقفِ آزار کیا؟
"دل پذیری" تو ہی اک کھیل حسینوں کیلئے
مہ جبینوں کے لئے
"دل دہی" پہ مری کیوں غصہ کا اظہار کیا
ناحق انکار کیا؟
کیا خبر تم کو ابھی عشق میں لذت کیا ہے
یہ حلاوت کیا ہے؟
تم نے کیا سوچ کے اس درد سے انکار کیا
فتنہ بیدار کیا؟
پہلے ہی نامے میں "کھل جاؤ" ضرورت کیا تھی
یہ شرارت کیا تھی؟
حوصلہ کیوں مری امیدوں کا بیدار کیا!
مجھ کو ناچار کیا؟
وہ خفا ہوں کہ ہنسیں ان کو بتا دو اختر
یہ جتا دو اختر!
اب تو جو کچھ ہو سو ہو عشق کا اظہار کیا
آپ سے پیار کیا
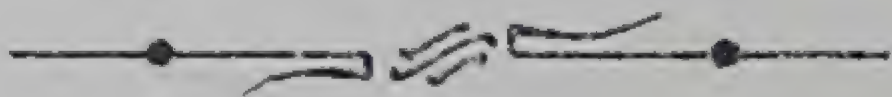
رخصت کے بعد

جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!
میں نے اک لمحہ خوشی کا نہ گزارا ہمدم!
چھن گیا میری امیدوں کا سہارا ہمدم!
چھپ گیا میرے شبستاں کا ستارا ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

جب سے رخصت ہوئی وہ رہتا ہوں دن رات اُداس
دل میں ہیں شعلہ فشاں رنج و الم حسرت و یاس
کوئی تسکیں نہ تسلی، کوئی امید نہ آس
کر گئے ہجر میں سب مجھ سے کنارا ہمدم
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

میری آنکھوں میں مچلتی ہیں ادائیں کس کی؟
چٹکیاں لیتی ہیں سینے میں حیائیں کس کی؟
ہر گھڑی کان میں آتی ہیں صدائیں کس کی؟
ہر گھڑی کہتا ہوں یہ کس نے پکارا ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

میری وحشت کو بڑھاتی ہے چمن کی صورت

دل کو تڑپاتی ہے شمشاد و سمن کی صورت!
یاد آجاتی ہے اُس غنچہ دہن کی صورت!
بھولتی ہی نہیں نظریں یہ نظارے ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

اُس کے جانے سے فضاؤں میں طراوت نہ رہی
باغ کا رنگ اُڑا، پھولوں میں نکہت نہ رہی
جلوہ زارِ مہ و انجم میں وہ طلعت نہ رہی
بُجھ گیا سب کے مقدّر کا ستارہ ہمدم
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

کبھی وحشت لئے پھرتی ہے خیابانوں میں!
کبھی تکمیلِ جنوں ہوتی ہے ویرانوں میں!
اور کبھی روتا ہوں جا کر شجرستانوں میں!
کہ چمن میں نہیں کوئی چمن آرا ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

نظامِ رنگیں

اُٹھا جام ساقی، جہاں کو بدل دیں!
نظامِ زمین و زماں کو بدل دیں!

پلا دے کچھ ایسی کہ ٹھوکر لگا کر!
زمیں ہی نہیں آسماں کو بدل دیں

عمارت ہے بوسیدہ، ساغر ہیں کہنہ
ضرورت ہے، دیرِ مغاں کو بدل دیں

طبیعت ہے بیزار اس ہنگی سے
تماشہ گہہِ پاسباں کو بدل دیں

حکومت ہے اب ناومن کی جہاں میں
اُٹھ اِس ناومن کے جہاں کو بدل دیں

خزاں چھا رہی ہے گل و گلستاں پر
طرازِ گل و گلستاں کو بدل دیں!

کریں مستِ صہبا ہم آئیں گروں کو
اور آئینِ ہندوستاں کو بدل دیں

ضرورت ہے اک ساقیٔ نوجواں کی!
ہے موقع کہ پیرِ مغاں کو بدل دیں

وہی ایک منظر ہے صدیوں سے طاری
طلسمِ مہ و کہکشاں کو بدل دیں!

ہے امن و اماں، موت انسانیت کی!
فنا زارِ امن و اماں کو بدل دیں!

حکومت کی بنیاد ہے خودگری پر
ہم اس خودگری کے جہاں کو بدل دیں!
ہے گمراہ رہبر، شبِ تار سر پر
چلیں ہم رہِ کارواں کو بدل دیں
کچھ اس طرح گردش میں لا جامِ مے کو
کہ ہم گردشِ آسماں کو بدل دیں
حیات و عدم پر کریں اپنا قبضہ
طلسماتِ ہر دو جہاں کو بدل دیں
کہاں تک یہ جانِ حزیں، جسمِ لاغر!
اُٹھو ہیئتِ جسم و جاں کو بدل دیں
ہے طاقت ہی سے زندگانی عبارت
تو فولاد سے پرنیاں کو بدل دیں
صنم گاہِ یوناں کو بھی رشک آئے
کچھ اس طرح ہر نوجواں کو بدل دیں
کلیسا کو ہے فکر، تعمیرِ نو کی!
حرم والے اپنے جہاں کو بدل دیں
ہمارے دہن میں زباں غیر کی ہے!
بنیں غیر اور اس زباں کو بدل دیں

محبت، خوشی کا ترانہ ہے کہہ دو
کہ عشاق طرزِ فغاں کو بدل دیں
خدائی کی ہر شے کو بدلیں ہم اخترؔ
یہاں تک کہ اس "دلستاں" کو بدل دیں

طلوعِ بہار!

پھر بہار آئی چمن میں پھول برساتی ہوئی
ہر قدم پر رنگ و بو کے زمزمے گاتی ہوئی
جلوہ ہائے تازگی و رنگ آنکھوں میں لئے
نشہ ہائے نغمہ و آہنگ برساتی ہوئی
کان میں پھولوں کے آویزے کہ پریاں رقص میں
دوش پر بادل کہ زلفِ حور لہراتی ہوئی
عارضِ گُل رنگ سے گلزار برساتے ہوئے
دیدۂ میگوں سے میخانے سے چھلکاتی ہوئی
فصلِ گُل ہے یا کوئی دوشیزۂ رنگیں بدن
فرشِ گُل سے صبحدم اُٹھی ہے شرماتی ہوئی
بن کے نور و نکہت و مستی کا اک گلگوں سحاب
جھومتی، اُٹھتی، مچلتی، پھیلتی، چھاتی ہوئی

ہر نظر سے بادۂ و مستی کی کیفیت عیاں
ہر ادا حُسن و شباب و کیف برساتی ہوئی
اپنی زلفِ عطر آلودہ کی ہر جنبش کے ساتھ
حُوریانِ یاسمین و گل کو مہکاتی ہوئی
لالہ زار و سنبلستاں کی نمو کے رنگ میں
سبزہ زاروں میں پرِ طاؤس پھیلاتی ہوئی
سرو و ریحاں مست ہیں، نسرین و نرگس مست ہیں
چار سو اک نشۂ بے نام برساتی ہوئی
سبزے پر شبنم کے سیمیں قطرے کر کے منتشر
ہر زمرد زار پر موتی سے برساتی ہوئی
اُودے اُودے بادلوں میں بجلیاں مضطر ہیں یا
نور کی کچھ ناگنیں غاروں میں بل کھاتی ہوئی
شاخِ رقصاں پر نہیں ہیں طائرانِ نغمہ سنج
ننھی پریاں سبزہ گوں گشتی پہ ہیں گاتی ہوئی
مژدہ باد اے میکدو، پھر دھوم سے آئی بہار
رخصت اے توبہ، کہ پھر آفاق پر چھائی ہوئی

ساقی نامہ

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی!
شراب لا، مری حالت خراب ہے ساقی!

شباب کے لئے توبہ عذاب ہے ساقی!
پلا شراب، کہ پاسِ شباب ہے ساقی!

پلا دے آج تو جتنی شراب ہے ساقی!
کہ موسمِ گل و فصلِ شباب ہے ساقی!

کھلا رہی ہے نئے پھول، یاسمینِ فلک
پلا وہ پھول کہ رشکِ گلاب ہے ساقی!

چھلک رہا ہے یہ ساغر میں کس کا حسن و شباب
یہ کون پردہ نشیں، بے حجاب ہے ساقی!

اُٹھا پیالہ کہ گلشن پہ پھر برسنے لگی
وہ مے کہ جس کا قدح ماہتاب ہے ساقی!

ڈبو دے آج تو مجھ کو، حبابِ ساغر میں
کہ زندگی کا محل بھی حباب ہے ساقی!

ہیں سحر مے سے بہم، میکدے میں شام و سحر!
کہ ماہتاب قدح، آفتاب ہے ساقی!

جھلک رہی ہے یہ ساغر میں تیری برقِ جمال
کہ میرا گم شدہ رنگین شباب ہے ساقی!
نکال پردۂ مینا سے دخترِ رز کو!
گھٹا میں کس لئے یہ ماہتاب ہے ساقی!
سیاہ خانۂ غم بن رہی ہے کل دُنیا
کہ بادلوں میں ترا آفتاب ہے ساقی!
یہ سوزِ دائمی کب تک، برنگِ لالۂ طور؟
یہ زندگی تو سراسر عذاب ہے ساقی!
کتاب پڑھنے دے زاہد کو جا کے مسجد میں
مرے لئے ترا ساغر کتاب ہے ساقی!
زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوتِ آزار
کہ ایک جام میں سب کا جواب ہے ساقی!
گرا دیں ایک ہی ٹھوکر میں قصرِ ہستی کو
پلا کے آج سرِ انقلاب ہے ساقی!
پڑی ہے عمر بہت، زہرِ درد پینے کو
شراب دے ابھی فصلِ شباب ہے ساقی!
چل اک بہشت بسائیں سرور و مستی کی
بہشتِ دہر تو غم سے خراب ہے ساقی!

چھلکا دے آج کہ کل کی خبر کسے معلوم
نشاطِ عمر، نمودِ حباب ہے ساقی!
شبِ شباب کٹے کس طرح وہ تیغ اٹھا
کہ جس کا بادۂ گلگوں خطاب ہے ساقی!
یہ کس کی یاد میں روتی ہے آج رہ رہ کر
گھٹا ہے یا مری چشم پر آب ہے ساقی!
ہے میکدے پہ کوئی اور میکدہ رقصاں
کہ اس بہار کا پہلا سحاب ہے ساقی!
تو واعظوں کی نہ سُن، میکشوں کی خدمت کر
گناہ ثواب کی خاطر، ثواب ہے ساقی!
مجھے پسند ہے دنیا میں اپنی ناکامی
کہ ہر ذلیل یہاں کامیاب ہے ساقی!
نکال، دفترِ مینائی سے وہ مصرعِ تر
کہ جس کا مصرعِ ثانی گلاب ہے ساقی!
اگر شراب ہوئی ختم، تشنہ لب ہی سہی!
جہاں میں رندوں کی خدمت ثواب ہے ساقی!
پلا دے تو بھی نئے بے حساب اختر کو
غمِ زمانہ اگر بے حساب ہے ساقی!

کلام جس کا ہے معراجِ حافظ و خیام!
یہی وہ اخترِ خانہ خراب ہے ساقی!

گاگر بھرتے ہوئے

جوئے رواں وہی ہے، وہی آبشار ہے
ہر سو رواں دواں وہی موجِ بہار ہے
شادابیاں برستی ہیں جنّت کی، ہر طرف!
جنگل پہ تازگی ہے، فضا پہ نکھار ہے
رنگینیاں اُبلتی ہیں آغوشِ خاک سے
رنگینیوں سے مست ہر اک سبزہ زار ہے
وہ جانِ نو بہار مگر جا چھپا کہاں؟
میری نگاہ جس کے لئے بے قرار ہے
ویران آج کس لئے یہ رہگزار ہے؟

ماتمِ بہار!

نہ پھولوں کا موسم، نہ رنگیں بہاریں!
نہ بادل کہ زلفِ چمن کو سنواریں!
یہ حسرت زدہ فصل، کیونکر گذاریں!

کہاں جا بسیں، اے خزاں، وہ بہاریں؟

یہ روئے چمن پر وہ رنگینیاں ہیں
نہ گُل ہیں نہ گلچیں نہ گُل چینیاں ہیں
نہ سرسبز شاخوں کی نازک قطاریں!

کہاں جا بسیں، اے خزاں، وہ بہاریں؟

نہ بادِ گُل افشاں، فضا میں خراماں
نہ کوثر کے طوفاں ہوا میں خراماں
کہ بادل کی پریاں چمن میں اُتاریں

کہاں جا بسیں، اے خزاں، وہ بہاریں؟

نہ ساحل پہ رونق، نہ دریا میں پانی!
نہ وہ مست صبحیں، سُہانی سُہانی!
نہ ہر سو گل و غنچہ کی وہ قطاریں!

کہاں جا بسیں، اے خزاں، وہ بہاریں؟

بہارِ لطافت، گئی گلشنوں سے!
گلوں کی طراوت گئی گلشنوں سے!
صبا ہے نہ خوشبو نہ وہ جوئبار یں!

کہاں جا بسیں، اے خزاں، وہ بہاریں؟

دلوں پر ہے داغ اور جذبات ویراں

ہیں شام وسحر مُردہ، دن رات ویراں
یہ ویران دن رات کیسے گزاریں!
کہاں جا بسیں اے خزاں، وہ بہاریں؟

تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے

مجھے پیار کرنے والی، تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟
مری یاد میں تو ہردم، یونہی بے قرار کیوں ہے؟
ترا رنگ زرد کیوں ہے ترا حالِ زار کیوں ہے؟

تجھے اضطرار کیوں ہے؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟

ہیں ستارے سربسجدہ ترے کوئے نازنیں پر!
مہ و آفتاب قرباں ہیں جمالِ دلنشیں پر!
ہے بہارِ خلد صدقے ترے روئے یاسمیں پر

ترا دل، فگار کیوں ہے؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟

چمنِ جہاں میں مثلِ گُلِ داغدار ہوں میں!
کہ بہارِ عمرِ رفتہ کا الم گسار ہوں میں!
تو ہے رشکِ غنچہ و گل، تو مثالِ خلد ہوں میں!

تو رہینِ خار کیوں ہے ؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟

ترے غم کو نذر کیا دوں کہ گنوا چکا جوانی !
کسی اور آستاں پر میں مٹا چکا جوانی !
میں بھلا چکا محبت ، میں لٹا چکا جوانی !
تو گلے کا ہار کیوں ہے؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے ؟

میں نثار کر چکا ہوں، ہوسِ بتاں پہ عمریں!
اسی دھن میں صرف کر دی ہیں درِ مغاں پہ عمریں
کروں نذر اب کہاں سے ترے آستاں پہ عمریں
تو یوں سوگوار کیوں ہے ؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے ؟

مجھے کیا خبر تھی اک دن تجھے مجھ سے پیار ہوگا ؟
مری آرزو میں جینا تجھے ناگوار ہوگا ؟
مری "غم نگاریوں" پر ترا دل نثار ہوگا ؟
ترا دل نثار کیوں ہے ؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟

غمِ عاشقی میں برسوں، میں خراب ہو چکا ہوں!

کئی بار دل دیا ہے، کئی بار رو چکا ہوں!
ترے غم کو کیا کروں اب، کہ غموں میں کھو چکا ہوں!
ترا غم شعار کیوں ہے؟
تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے؟

عالمِ عشق کا افسانہ

یادِ ایام کا افسانہ سناتی کیوں ہو؟
چھیڑتی کیوں ہو مجھے، آہ ستاتی کیوں ہو؟
مجھ سے نفرت ہے تو تم کو اسی نفرت کی قسم
میری خوابیدہ محبت کو جگاتی کیوں ہو؟

آہ! وہ جذبہ جسے بھول گیا مدت سے
یاد آ کے مجھے، یاد دلاتی کیوں ہو؟
تم تو واقف بھی نہ تھیں عشق کے معنی سے کبھی
اب مجھے عشق کا مفہوم جتاتی کیوں ہو؟

جس کو مدت سے بھلا دینے کی کوشش کی تھی
یادِ ایام کا وہ نغمہ سناتی کیوں ہو؟
شمعِ دل بجھ گئی، ہاں بجھ چکی ایک مدت سے
اب پھر امید کی کرنوں سے جلاتی کیوں ہو؟

پوچھتی بھی نہ تھیں جب نیند نہ آتی تھی مجھے
اب مری خواب کی دُنیا کو بساتی کیوں ہو؟

تم تو پروا بھی نہ کرتی تھیں مرے رونے کی
اب مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو؟

سو چکی رُوح مری یاس کی تاریکی میں
اب اسے عشق کے نغموں سے جگاتی کیوں ہو؟

سازِ دل ٹوٹ چکا، تارِ محبت ہے خموش
اب اسے زخمۂ الفت سے جگاتی کیوں ہو؟

مختصر یہ ہے کہ اب جب کہ وہ دل ہی نہ رہا
"عالمِ عشق" کا افسانہ سناتی کیوں ہو؟

جزیرۂ خواب

رنگین ــــــ کچھ روحیں، کچھ کم سن روحیں دیکھ رہی ہیں خواب
معصومانہ خواب!

زرّیں ــــــ روئے عالم خواب ہے، رقصاں کشتئ مہتاب
اک طفلانہ خواب

معصوم ــــــ ایک فضائے سیمیں، نور و نکہت سے معمور
سرشار و مدہوش

موہوم ——— ایک سواد، رنگین، حسن و حیرت سے معمور را!
جنت کا ہمدوش!

آزاد ——— نیند کی موجوں پر ہے رواں یہ کشتیٔ خاموش
بزمِ جہاں سے دور۔

دلشاد ——— یہ روحیں ہیں آسودہ اس کشتی میں مدہوش
کون و مکاں سے دور

ملاح ——— اس کی، پری ہے نیند کی، جانا سوئے وادیٔ خواب
نقشِ بہار خواب

خاموش ——— امن و سکوں کا ایک جزیرہ روئے وادیٔ خواب
ایک دیارِ خواب

بہار کی تاروں بھری رات

سرِ وادیٔ ماہ، شامِ بہار
پروتی ہے تاروں کے زرّین ہار
فضاؤں میں شمعیں فروزاں ہوئیں!
کہ زرپوش پریاں نمایاں ہوئیں
یہ معصوم تارے ہیں نکھرے ہوئے
کہ گلہائے زرّیں ہیں بکھرے ہوئے

یہ تارے ہیں یا حسرتوں کے چراغ
امیدوں کے پھول، آرزو کے ایاغ

سرِ نیل اُبھرے طلائی حباب
کہ زہرہ جبینوں کے رنگین خواب

یہ آنسو ہیں حورانِ معصوم کے!
کہ ارماں ہیں دلہائے مغموم کے

ہیں سیمیں سفینے پرستان کے
کہ شفاف موتی ہیں عمان کے

بہشتوں کی شبنم کے آنسو ہیں یہ
کہ فردوسِ رنگیں کے جگنو ہیں یہ

افق نور سے جگمگانے لگا!!!
فلک روشنی میں نہانے لگا

فضا میں نمایاں گلستاں ہوا
سرِ چرخ کیسا چراغاں ہوا

نسیمِ چمن گنگنانے لگی
فضا وجد میں تھرتھرانے لگی

ہواؤں میں رقصاں ہوئے میکدے
چمن میں غزل خواں ہوئے میکدے

درختوں کے پہلو میں حورِ بہار!
بجاتی ہے شاخوں کے رنگیں ستار

مُفارقت

حیراں ہے آنکھ، جلوۂ جاناں کو کیا ہوا
ویراں ہیں خواب، گیسوئے رقصاں کو کیا ہوا

مرجھا رہی ہے کس لئے وادیٔ رنگ و بُو
حسنِ گل و جمالِ گلستاں کو کیا ہوا؟

پردیس جا کے سُدھ ہی! نہ لی اس نے اے فراق
اُس کی جفائے زود پشیماں کو کیا ہوا؟

لائی صبا نہ مصر سے خوشبوئے پیرہن!
کس کو خبر کہ یوسفِ کنعاں کو کیا ہوا؟

وہ غنچۂ بہشتِ حرم، جا چھپا کہاں؟
اُس ماہتابِ بزمِ شبستاں کو کیا ہوا؟

قصرِ حسیں خموش ہے، ایواں ہے پُرسکوں
آوازِ پائے سروِ خراماں کو کیا ہوا؟

پردوں سے روشنی کی کرن پھوٹتی نہیں!
اس شمعِ رنگ و بوئے شبستاں کو کیا ہوا؟

چھائی ہے بے کسیٔ خزاں، خانہ باغ پر
نسرین و لالہ و گل و ریحاں کو کیا ہوا؟
ہر غنچہ سوگوار ہے، ہر پھول دل فگار
حسن پری و شان گلستاں کو کیا ہوا؟
نغموں میں رنگِ نالۂ غمناک آ چلا!
کیفِ نوائے مرغِ خوش الحاں کو کیا ہوا؟
دنیا سیاہ خانۂ غم بن رہی ہے کیوں؟
اللہ میرے ماہِ خراماں کو کیا ہوا؟
آنکھیں بدل رہی ہے، مری شام آرزو
کس سے کہوں کہ گردشِ دوراں کو کیا ہوا؟
زہرالم نے بخشی ہیں کیوں تلخ کامیاں؟
شیرینیٔ لبِ شکر افشاں کو کیا ہوا؟
طوفاں اٹھا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں
اُس دستِ نرم و ساعد لرزاں کو کیا ہوا؟
نادان آنسوؤں کو ہے مدت سے جستجو
آرام گاہ گوشۂ داماں کو کیا ہوا؟
سیراب کاریٔ لبِ گلگوں کدھر گئی؟
ہیں تشنہ کام، ساغرِ جاناں کو کیا ہوا؟

بے باکیٔ نگاہِ ستم کیش کیا ہوئی؟
سفّاکیٔ تبسّمِ پنہاں کو کیا ہوا؟
آنکھوں سے کس لئے بہے آتے ہیں اشکِ سرخ
رنگیں طرازیٔ لبِ خنداں کو کیا ہوا؟
کشتِ مراد ہو چلی، نذرِ سمومِ غم
یارب نمودِ ابرِ بہاراں کو کیا ہوا؟
چشمِ فلک سے فتنے برسنے لگے ہیں پھر
دورِ نگاہِ فتنۂ دوراں کو کیا ہوا؟
پھر گردشِ زمانہ، اُٹھانے لگی ہے سر
نازِ کمندِ کاکلِ پیچاں کو کیا ہوا؟
نامہ ہے نامہ بر ہے نہ کوئی ہمیں خبر
اُس نازنیں کے لطفِ فراواں کو کیا ہوا؟
پھیلی ہے شامِ یاس کی تلخی سی چار سو
صبحِ بہارِ چشمۂ حیواں کو کیا ہوا؟
کٹتی نہیں ہیں شامِ جدائی کی منزلیں!
تیغِ شعاعِ مہرِ درخشاں کو کیا ہوا؟
شبہائے نو بہار ہیں کس درجہ سوگوار
شادابیٔ رُخِ مہِ تاباں کو کیا ہوا؟

صبحِ وطن کی یاد دلاتے نہیں اُنہیں!
نظارہ ہائے شامِ غریباں کو کیا ہوا؟
روتا ہے بات بات پہ یوں زار زار کیوں؟
اختر خبر نہیں دلِ ناداں کو کیا ہوا؟

شبہائے رفتہ

آہ! وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

آہ او سلمیٰ! وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے
وہ ملاقاتیں، وہ باتیں یاد آتی ہیں مجھے
حسن و الفت کی وہ گھاتیں یاد آتی ہیں مجھے
آہ! وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

جب تمہاری یاد میں دیوانہ سا رہتا تھا میں
جب سکون و صبر سے بیگانہ سا رہتا تھا میں
بے پیے مدہوش سا مستانہ سا رہتا تھا میں
آہ وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

جب تمہاری جستجو، بیتاب رکھتی تھی مجھے
جب تمہاری آرزو، بے خواب رکھتی تھی مجھے

مثلِ موجِ شعلہ و سیماب رکھتی تھی مجھے
آہ! وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

منتظر میری، جب اپنے باغ میں رہتی تھیں تم
ہر کلی سے اپنے دل کی داستاں کہتی تھیں تم
نازنیں ہو کر بھی نازِ عاشقی سہتی تھیں تم
آہ! وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

سردیوں کی چاندنی، شبنم سے کملاتی تھی جب
شبنم آ کر چار سو موتی سے برساتی تھی جب
باغ پر اک دھندلی مستی چھا جاتی تھی جب
آہ! وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

جب تم آ جاتی تھیں، با زلفِ پریشاں تا کمر!
عطر پیما تا بہ زانو، سنبلستاں تا کمر!
"مشک آگیں تا بہ داماں، عنبر افشاں تا کمر"
آہ! وہ راتیں، وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

خمارِ شبانہ

فصلِ گُل دیکھ چکے، دورِ خزاں دیکھ چکے
ہم تماشائے گلستانِ جہاں دیکھ چکے

سایۂ زلفِ حسیناں میں گزاریں راتیں
سنبلستان میں خوابوں کا سماں دیکھ چکے
چاندنی رات میں خوشبو سے نہائے اکثر
گرمِ پیرہنِ گلبدناں دیکھ چکے
کی ہے مے نوشیٔ لعلِ لبِ گلفام بہت
التفاتِ لبِ شیریں دہناں دیکھ چکے
مشکبو زلفوں سے کھیلے ہیں بہت راتوں کو
جرأت آموزیٔ نسرین بدناں دیکھ چکے
پا کے شیریں و زلیخا کو ہم آغوش اکثر
یوسف و خسرو کی چشم نگراں دیکھ چکے
ہم نے راتوں کو بہت، محلوں پہ پھینکے پتھر
اثرِ برہمیٔ زلفِ بتاں دیکھ چکے
دن کو تارے سے چمکتے نظر آئے سرِ بام
اکثر آنکھیں سرِ بام اشک فشاں دیکھ چکے
دل میں جینے کی تمنا نہیں باقی اختر
خوب جی بھر کے تماشائے جہاں دیکھ چکے

لاہور سے گزرنے والوں کے نام ایک پیغام

سامانِ رشکِ انجم و مہتاب کر کے جا!
لاہور کی فضاؤں کو شاداب کر کے جا!

مانا کنارِ سندھ ہے مضطر ترے لئے
کچھ تو علاجِ پہلوئے پنجاب کر کے جا!

ہر شب ترے فراق کی بے خواب ہے مگر
تو آ کر اور طرح سے بے خواب کر کے جا!

اک دردمندِ عشق ہے مدّت سے منتظر
درمانِ دردِ خاطرِ بے تاب کر کے جا!

تیری سنہری خواب مبارک تجھے، مگر!
میری شبِ سیہ کو نہ بے خواب کر کے جا!

رخسار و زلف سے مرے دستِ مراد کو
پھر آشنائے قاقم و سنجاب کر کے جا!

شبہائے نو بہار کو اے خوابِ نو بہار!
روشن برنگ زہرہ و مہتاب کر کے جا!

ہے تشنہ کامِ عشق کو مدت سے انتظار!
اے ابرِ حسن، آج تو سیراب کرکے جا
چلنے لگی نسیم، مچلنے لگی شمیم!
غرقِ نشاطِ جامِ مئے ناب کرکے جا!
جائے تو مل کے جائے، خوشی چشمِ تر کی ہے
میرے ہر اشک کو "گوہرِ نایاب" کرکے جا!
آواز دے رہا ہے برائے سفر کوئی!
اختر کی چشمِ شوق کو پرآب کرکے جا!

انقلاب اور مجبوری

زمیں کو کیسے بدلیں، آسماں کو کس طرح بدلیں؟
بتا ساقی کہ ہم بزمِ جہاں کو کس طرح بدلیں؟
ہے دل کو آرزو، اک ساقئ گلرو ئے کم سن کی!
طریقِ کہنۂ پیرِ مغاں کو کس طرح بدلیں؟
مناسب ہے بدل دیں بجلیاں ہی راستہ اپنا
ہم اہلِ آشیاں اب آشیاں کو کس طرح بدلیں؟
طوافِ کعبہ میں بھی ہے ادائے بُت گری پنہاں
حرم والے رہ و رسمِ بُتاں کو کس طرح بدلیں؟

ہے میر کارواں گمراہ، اہلِ کارواں غافل
بتا اے دل کہ راہِ کارواں کو کس طرح بدلیں؟

یہ میخانہ تو کیا اک جام میں دُنیا بدل جائے
مزاجِ ساقیٔ نامہرباں کو کس طرح بدلیں؟

یہ حالت ہے کہ خود اپنی روش بدلی نہیں جاتی
تو پھر اے ہمنشیں سارے جہاں کو کس طرح بدلیں؟

جوانی لوٹ آئے پھر اسی شاداب منزل میں!
مگر ہمدم رہِ عمرِ رواں کو کس طرح بدلیں؟

بہار آنے میں ہے دیر اور دل اپنا بہت نازک
چمن والوں کے اندازِ فغاں کو کس طرح بدلیں؟

مزاجِ دوست تو ہمدم، بدلنے کو بدل جائے
یہ رونا ہے مزاجِ آسماں کو کس طرح بدلیں؟

دلِ آتش بجاں بدلے تو بدلے رنگ ہستی بھی!
یہ آفت ہے دلِ آتش بجاں کو کس طرح بدلیں؟

سمجھتا ہی نہیں کوئی کہ مقصودِ فغاں کیا ہے؟
دلِ غمگیں، مقاماتِ فغاں کو کس طرح بدلیں؟

خزاں آنے نہ پائے اور بہار دل کا ہے سایہ
بتائیں لالہ و گل گلستاں کو کس طرح بدلیں؟

ترے بندوں کی حشر آرائیاں دیکھی نہیں جاتیں
خداوندا، بتا تیرے جہاں کو کس طرح بدلیں؟
بدل دیں قسمتِ ہندوستاں کوشش سہی ہم خستہ
مصیبت تو یہ ہے ہندوستاں کو کس طرح بدلیں؟

ایک تنہا مرغابی

اُفق کو نغمۂ غمگیں سے کیوں تڑپا رہی ہے تو؟
سکوتِ شب میں فریادیں ہی کیوں برسا رہی ہے تو؟
بتا تو اس طرح تنہا، کہاں سے آرہی ہے تو؟

کہاں بچھڑا ہے تجھ سے آہ تنہا کارواں تیرا؟
ہے کیوں ایک ایک نغمہ اس طرح ماتم چکاں تیرا؟
ہوا میں ایک آنسو بن کے کیوں لہرا رہی ہے تو؟

تری ہمجولیاں رخصت ہوئیں آخر کہاں تجھ سے؟
خفا کیوں ہو گیا اس طرح ظالم آسماں تجھ سے؟
فضا میں کس لئے آہ و فغاں برسا رہی ہے تو؟

ترے ناشاد نغمے سن کے غمگیں ہیں ستارے بھی
ہوا ساکت، فضا سامت، فسردہ ہیں نظارے بھی
اُداسی ہی اُداسی، ہر طرف پھیلا رہی ہے تو؟

کہاں پائے گی اب تو اُن مچلتی جوئباروں کو؟
خزاں میں آئی ہے روتی ہوئی پچھلی بہاروں کو؟
تلاش و جستجو بے سود ہے کیوں جا رہی ہے تو؟

گئے وہ دن کہ برکھا کی ہوا تھی تیرا گہوارہ
نشیمن تھا ترا دریا، گھٹا تھی تیرا گہوارہ!
اب اُن کی یاد میں کیوں نغمۂ غم گا رہی ہے تو؟

ترے ہم جنسوں کی اکثر صدائیں سُن چکا ہوں میں
شبِ مہتاب میں رنگیں نوائیں سُن چکا ہوں میں
مگر یہ اور ہی کچھ لے ہے جس میں گا رہی ہے تو!

تو فریادِ غریباں ہے کہ نالہ دردمندوں کا؟
فغانِ عاشقانہ ہے کہ شیون غم پسند دل کا؟
فضا کے دل کو بھی احساس سے تڑپا رہی ہے تو!

ترا سینہ گدازِ عشق کا گہوارہ ہے، کیا ہے؟
تو سازِ درد کا ایک نغمۂ آوارہ ہے، کیا ہے؟
افق پر نالۂ غم کی طرح کیوں چھا رہی ہے تو؟

کسی غمگین دل کی ہے دعائے راہ گم کردہ؟
کہ ایک فرقت زدہ کی التجائے راہ گم کردہ؟
کہاں سے آئی، کس جانب بھٹکتی جا رہی ہے تو؟

نزے ہمراہیوں کی بے وفائی کا بے مجھے غم ہے!
میں سمجھا تھا یہ شیوہ قسمتِ اولادِ آدم ہے!
جبھی اس چاندنی میں مجھ کو غمگیں پا رہی ہو تو!

شریکِ رنج و غم کوئی نہیں دنیا کی محفل میں!
بہت ڈھونڈھی نہ پائی میں نے دل سوزی کسی دل میں
احبا کے تصور سے مجھے تڑپا رہی ہے تو!

جسے دیکھا جہاں میں خود غرض اور بے وفا دیکھا
ذلیل و پست فطرت اور مطلب آشنا دیکھا
دلا کر یاد اُن کی، آگ سی بھڑکا رہی ہے تو!

علی گڈھ کے طلبا سے
مشاعرہ کی دعوت کے جواب میں

کفر ہے برسرِ پرخاش پھر ایمانوں سے
اے صبا کہنا علی گڈھ کے غزل خوانوں سے
کہہ دو دُنیائے سیاست کے صنم خانوں سے
چھیڑ اچھی نہیں اللہ کے دیوانوں سے

چھین لو شمع ستاروں کے شبستانوں سے
اور گذر جاؤ مہ و مہر کے ایوانوں سے

چشمِ سیّد نگراں ہے کہ پھر اُٹھے شاید
کوئی دیوانہ محبت کے بیابانوں سے

شورِ ناقوس سے دب جائے اذاں ناممکن
جا کے کہہ دو یہ بنارس کے صنم خانوں سے

ہند میں کعبہ کے بندے بھی خدا بن کے رہے
پوچھ لو سندھ کے اُجڑے ہوئے بتخانوں سے

دُور ہے منزلِ سلمائے حیاتِ جاوید
اور گزرنا ہے تمہیں موت کے ویرانوں سے

وادی و دشت و جبل ہیچ ہیں ہمّت کیلئے
یہ صدا آتی ہے اسپین کے میدانوں سے

عمل و علم سے قائم ہے نظامِ اسلام
یہ نہ ترکوں سے، نہ عربوں سے نہ افغانوں سے

ایک آزاد نفس، عمرِ قفس سے بہتر
یہ سبق ملتا ہے خیبر کے کہستانوں سے

اب تو اک قطرۂ خوں بھی نہ رہا بازو میں
کھیلتے تھے کبھی ہم خون کے طوفانوں سے

تم کو آتی نہیں گر طرزِ فغاں، ہم نفسو!
سیکھ لو وادیٔ یثرب کے حدی خوانوں سے

اے علی گڑھ، مرے اشعار میں کب تھی تاثیر!
یہ شراب آئی ہے بطحا کے خمستانوں سے

شہیدانِ جواں

دل کی گہرائی سے آوازِ فغاں آتی ہے
پھر مجھے یادِ شہیدانِ جواں آتی ہے

گل بدن خلد کے حیراں ہیں کہ یا رب کیونکر؟
طرزِ آرائشِ گلگوں کفناں آتی ہے

سُرخرو، خونِ شہیداں سے ہے لاہور کی خاک
ذرّے ذرّے سے ہمیں بوئے حنا آتی ہے

جو ترے رحم کی غیرت کو جگا دے یارب
تیرے بندوں کو وہ فریاد کہاں آتی ہے؟

نالۂ مسلمِ غمگیں سے ہم آہنگ کہاں؟
بُلبُلو! یوں تو تمہیں طرزِ فغاں آتی ہے!

جذبۂ شوقِ شہادت کی کہوں کیا اختر
موت آتی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

اُجڑے ہوئے پائیں بَاغ میں

برسوں کی جلاوطنی کے بعد!

پھر کھڑا ہوں بادلِ سرشار، پائیں باغ میں!
پھر بپا ہیں حشر کے آثار، پائیں باغ میں!
پھر لپٹتے ہیں گلے اشجار، پائیں باغ میں!
دیدۂ غمگیں ہے پھر خونبار، پائیں باغ میں!
خوابِ طفلی ہو گیا بیدار پائیں باغ میں

ایک دن میرے لئے وادئی ایمن تھا، یہ باغ
میں تھا ننھا سا کلیم اور طورِ روشن تھا یہ باغ!
عہدِ طفلی ایک بلبل تھا نشیمن تھا یہ باغ
شاعری کی اوّلیں کرنوں کا مسکن تھا یہ باغ
چار سو تھی بارشِ افکار پائیں باغ میں!

ہر شجر تھا اِس کا، ایک دن، گل بداماں تاکمر!
جھولتی تھیں گل رخانِ خلد ساماں تاکمر!
کاکلِ پیچیدہ دربر، زلفِ رقصاں تاکمر!
سب گلستاں تابہ داماں، سنبلستاں تاکمر!

پھول سے روشن کئے رخسار، پائیں باغ میں!

آج وہ حسنِ گُل و رنگِ چمن باقی نہیں!
نقشِ نسرین و نشانِ یاسمن باقی نہیں!
نرگس و سوسن کا اندازِ کہن باقی نہیں!
موتیا کا روپ، چمپا کی پھبن باقی نہیں!
ہے فقط ریحاں جگر افگار، پائیں باغ میں!

ایک دن خوشبو کا طوفاں بن کے آتی تھی صبا!
میکدے سے لاتی گھٹا مستی لٹاتی تھی صبا!
بلبلوں کے نغمے سن کر رنگ لاتی تھی صبا!
شاخِ گل کے بربطوں پر گنگناتی تھی صبا!
طائرانِ خلد کے اشعار، پائیں باغ میں

شاخِ گل کیسی کہ سایہ تک نہیں پاتے ہیں اب
ننھی کلیوں کے عوض سپنے نظر آتے ہیں اب
چار سو صرصر کے جھونکے خاک برساتے ہیں اب
تتلیوں کے بادلے، برگِ زرد لہراتے ہیں اب
اور بجائے گُل، ہجومِ خار، پائیں باغ میں!

ایک دن کس درجہ بیخود ہو کے آتی تھی بہار
عالمِ مستی میں کیا دھومیں مچاتی تھی بہار

رنگ و بو کی محفلوں میں مسکراتی تھی بہار
رات بھر بیٹھی ہوئی گجرے بناتی تھی بہار
اور حسینوں کے گلے کا ہار، پائیں باغ میں

آج ہیں نظروں سے غائب، نازنینانِ چمن
آہ وہ یارانِ گلشن، ہم نشینانِ چمن
خاک کے پردوں میں جا سوئے حسینانِ چمن
ماہ رویانِ چمن، زہرہ جبینانِ چمن
مٹ گئی وہ محفلِ انوار، پائیں باغ میں

ایک دن ہر سمت، امواجِ صبا تھیں رقص میں
شاخہائے نازک و رنگیں قبا تھیں رقص میں
حوریانِ غنچہ ہائے خاک زا تھیں رقص میں
ننھی ننھی تتلیاں بھی جا بجا تھیں رقص میں
رقص میں تھا سایۂ اشجار، پائیں باغ میں!

نونہالانِ گلستاں پر شباب آیا نہ تھا
عشق پیچاں میں ابھی تک پیچ و تاب آیا نہ تھا
یاسمین کے کاکلوں میں اضطراب آیا نہ تھا
میرا جب تک کوئی بھی انقلاب آیا نہ تھا
بے اثر تھی وقت کی رفتار، پائیں باغ میں

وقت کے ہمراہ لیکن وہ سماں جاتا رہا
خوشنما پھولوں کا رنگیں کارواں جاتا رہا
وہ ہجومِ طائرانِ نغمہ خواں جاتا رہا
میرے جاتے ہی فروغِ گلستاں جاتا رہا
خار و خس کے رہ گئے انبار، پائیں باغ میں

عہدِ طفلی اک دوامی لذتوں کا جام ہے
کیوں کہ آغازِ جوانی، اس کا نیک انجام ہے
جس کو کہتے ہیں جوانی، موت کا پیغام ہے
بسکہ اِس کا فاصلہ، پیری تلک اک گام ہے
یہ سبق دیتے ہیں آج آثار، پائیں باغ میں

جنّتِ طفلی کے وہ شیریں نظارے مٹ گئے
دل بہلنے کے جو ساماں تھے ہمارے مٹ گئے
نونہالانِ چمن جتنے تھے سارے مٹ گئے
وہ فضا، وہ ابر، وہ گل، وہ ستارے مٹ گئے
رہ گئے بس چند ماتم دار پائیں باغ میں!

یادگار اُس عہدِ رفتہ کے ہیں چند اشجار ابھی
آہ اس ویرانے میں باقی ہیں کچھ غم خوار ابھی
بوڑھے ساونتوں پہ پیری کے نہیں آثار ابھی

پتّہ پتّہ ہے لئے چلتی ہوئی تلوار ابھی!
اب یہی ہیں پاسباں دو چار، پائیں باغ میں
یہ شجر وہ ہیں جو گودوں میں کھلاتے تھے مجھے
اپنے کندھوں پر محبت سے بٹھاتے تھے مجھے
میرے سر کو چومتے تھے، گدگداتے تھے مجھے
بوڑھے ہو کر جھولتے تھے اور جھلاتے تھے مجھے
میرے بچپن میں ہزاروں بار، پائیں باغ میں!
السلام اے باغ کے بوڑھے جوانو! السلام
السلام اُجڑے چمن کے پاسبانو! السلام
عہدِ طفلی کے پرانے ہمزبانو! السلام
السلام اے عمرِ رفتہ کے فسانو! السلام
اب تمہی تم ہو، مرے غم خوار، پائیں باغ میں!

نالۂ مستانہ

ایک خط کا جواب

محبت کی زباں کا نالۂ مستانہ بن جاؤں
بھلا کر ساری دنیا کو ترا افسانہ بن جاؤں

نہ جا دامن بچا کر میری تربت سے، عجب کیا ہے
کہ تیرے لعل لب کا ایک دن، پیمانہ بن جاؤں!
تمہارا عشق، برسوں، میرے دل کے ساتھ کھیلا ہے
میں ایسے آشنا سے کیوں کر اب بیگانہ بن جاؤں!
محبت کی پذیرائی سے گر انکار ہے تم کو
تو تم "اختر" بنو، میں "آپ کی ریحانہ" بن جاؤں!
"دست با" کی بادۂ شیریں کا ہے کُل ہند میں شہرہ
نہ کیوں اے دل غلامِ ساقیٔ میخانہ بن جاؤں!
"غزل" کیسی کہاں کی "نظم" لیکن مدعا یہ ہے
کہ تیرے لب تک آکر نغمۂ مستانہ بن جاؤں!
تمہارا پیکرِ رنگیں بسا ہے دل کی آنکھوں میں
برہمن کو نہ رشک آئے تو میں بت خانہ بن جاؤں!
بجائے تیشہ آج اک خامہ دستِ کوہکن میں ہے
وہ دن نزدیک ہے جب میں بھی اک افسانہ بن جاؤں!
جوانی کے لئے ہے "پارسائی" ایک بیماری
میں کیوں آخر حریفِ نرگسِ مستانہ بن جاؤں!
ترا مدّاح ہوں مجھ کو "رسالوں" سے غرض کیا ہے
میں غیروں کیلئے کیوں زینتِ کاشانہ بن جاؤں!

ترے "مالی" کی قسمت اچھی ہو سکتی ہے گر یوں ہو
تو شمعِ گلستاں ہو، میں ترا پروانہ بن جاؤں!

مرے شغلِ حسیں پر کچھ اضافہ ہو تو بہتر ہے
تو میرا پھول بن، میں بلبلِ دیوانہ بن جاؤں!

کسی کی "گردن" اور "گیسو" کو جا کر چوم آتا ہے
مرے بس میں ہو گر اختؔر تو میں پروانہ بن جاؤں!

یاد

پھر بہار آئی، وہ فردوسِ لقا یاد آئی
پھر تصور کو وہ تصویرِ حیا یاد آئی
پھر کوئی لالہ رخ ہوش رُبا یاد آئی
دیدۂ مست کی مستانہ ادا یاد آئی
پھر بہار آئی، وہ فردوسِ لقا یاد آئی

نگہِ شوق نے ہر پھول کو پھر پیار کیا
کیفِ نظارہ نے ارمانوں کو بیدار کیا
پھر گھٹاؤں نے دل و روح کو سرشار کیا
زلفِ شب رنگ کی گلریز گھٹا یاد آئی!
پھر بہار آئی، وہ فردوسِ لقا یاد آئی

عالمِ خاک، نظر آتا ہے معمورۂ گُل!
بے حجابی سے ہم آغوش ہے مستورۂ گل
عنبر افشاں ہوئی اس طرح سے ناطورۂ گل
کہ مجھے کوچۂ سلمٰی کی فضا یاد آئی!
پھر بہار آئی، وہ فردوس لقا یاد آئی!

بادۂ شوق سے لبریز ہے پیمانۂ دل
نشۂ عشق کا گہوارہ ہے میخانۂ دل
اثرِ ہجر سے بے تاب ہے ویرانۂ دل
پھر وہ لیلائے وشِ ناہید ادا یاد آئی!
پھر بہار آئی، وہ فردوس لقا یاد آئی!

دلِ بے تاب تقاضائے جنوں سے مجبور
چشمِ بے خواب، تصوّر کے فسوں سے مجبور
جانِ مضطر ہے، غمِ صبر و سکوں سے مجبور
پھر وہی راحتِ جاں، روح فزا یاد آئی!
پھر بہار آئی، وہ فردوس لقا یاد آئی!

عرضِ آغوش ہے وہ عشرتِ آغوش نہیں
ہوش بے ہوش کہ وہ راہزنِ ہوش نہیں
گُل ہیں آزردہ کہ وہ جلوۂ گل پوش نہیں

چمنستان کو پھر اُس کی ہوا یاد آئی
پھر بہار آئی، وہ فردوس لقا یاد آئی!

جس نے پہلے پہل افسانہ بنایا تھا مجھے
نگہِ ناز سے دیوانہ بنایا تھا مجھے
خوگرِ بادہ و پیمانہ بنایا تھا مجھے
پھر وہی مست نظر، مست ادا یاد آئی!
پھر بہار آئی، وہ فردوس لقا یاد آئی!

وادی و دشت و دمن کا ہے حریری دامن
ہر گل و سرو و سمن کا ہے حریری دامن
نازنینانِ چمن کا ہے حریری دامن
دیکھ کر جن کو کوئی سبز قبا یاد آئی!
پھر بہار آئی، وہ فردوس لقا یاد آئی!

گُل و گلزار پہ رقصاں ہے ہجومِ نکہت
نشہ ساجن کے پریشاں ہے ہجومِ نکہت
بیخود و مست و پرافشاں ہے ہجومِ نکہت
کیا کسی شوخ کی خوشبوئے حنا یاد آئی!
پھر بہار آئی، وہ فردوس لقا یاد آئی!
گرچہ کیف و طرب و عیش بداماں ہے چمن

نکہت و رنگ کا طوفانِ پریشاں ہے چمن
کیا ہوا آج کہ غمگیں و غزل خواں ہے چمن
کس کی شیریں و دلآویز صدا یاد آئی!
پھر بہار آئی، وہ فردوس لقا یاد آئی!

دیارِ شیریں

دیکھ، اے دل نظر آیا وہ دیارِ شیریں!
ذرّے ذرّے سے مچلتی ہے بہارِ شیریں

اک دلِ غم زدہ و دیدۂ پرنم کے سوا
پاس کچھ بھی تو نہیں بہرِ نثارِ شیریں

مدد اے دیدۂ گریاں کہ نہیں صبر کی تاب
وہ نظر آنے لگی راہ گزارِ شیریں

نالہ نیم شبی ہو کہ دعائے سحری
مضطرب ہیں پئے دیدارِ دیارِ شیریں

آئے ہیں پہلے پہل بارگہ شیریں میں
جان و دل کو لئے ہم بہرِ نثارِ شیریں

حشر تک کے لئے قدموں میں جگہ مل جائے
خاک کر دے مجھے اے خاکِ دیارِ شیریں

نکہتِ حُسن سے ہے محفلِ ہستی شاداب!
خندہ زن خلد پہ ہے خاکِ جوارِ شیریں
خاکِ لاہور ہے گہوارۂ شان و عظمت
اختر اس خاک میں روشن ہے وقارِ شیریں

مجھے لے چل!

مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو اُن رنگیں بہاروں میں!

جہاں رنگیں بہشتیں کھیلتی ہیں سبزہ زاروں میں!
جہاں حوروں کی زلفیں جھومتی ہیں شاخساروں میں
جہاں پریوں کے نغمے گونجتے ہیں کوہساروں میں
جوانی کی بہاریں تیرتی ہیں آبشاروں میں
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو اُن رنگیں بہاروں میں

وہ مستانہ بہاریں جن پہ قرباں ارضِ جنت ہے
جہاں ہر ذرّہ اک گہوارۂ موجِ لطافت ہے
جہاں رنگت ہی رنگت ہے جہاں نکہت ہی نکہت ہے
محبت حکمراں ہے جن کے پاکیزہ دیاروں میں!
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو اُن رنگیں بہاروں میں!

وہ دوشیزہ فضائیں، جنتوں کا ہے گماں جن پر
چھڑکتا ہے مئے تسنیم و کوثر آسماں جن پر
لٹاتی ہے سحابِ حسن و طلعت، کہکشاں جن پر
سرور و نور و نکہت بستے ہیں جن کے ستاروں میں
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو اُن رنگیں بہاروں میں!

جہاں شام و سحر نیلی گھٹائیں گھر کے آتی ہیں!
افق کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہیں!
فضاؤں میں بہاریں ہی بہاریں لہلہاتی ہیں
جہاں فطرت مچلتی ہے لہکتے ابر پاروں میں!
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں!

جہاں چاروں طرف باغ و گلستاں لہلہاتے ہیں
شگفتہ وادیوں میں جنتوں کے خواب آتے ہیں
جہاں معصوم طائر، عشق کے نغمے سناتے ہیں
اور اُن کا لحن شیریں گونجتا ہے کوہساروں میں!
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو اُن رنگیں بہاروں میں!

حکومت ہے جہاں صدق و صفا و مہر و الفت کی
نشاط و عیش و عشرت کی، سرور و لطف و راحت کی
نسیم و انجم و گل کی، نوا و نور و نکہت کی!

محبت موجزن ہے جن کے دوشیزہ نظاروں میں
مری سلمیٰ! مجھے لے چل، تو ان رنگیں نظاروں میں!

جہاں آباد یہ ناپاک شہرستاں نہیں ہوتے
فسادی، فتنہ پرور اور ذلیل انساں نہیں ہوتے
یہ انساں، ہاں یہ حیواں، بدتر از شیطاں نہیں ہوتے
فساد و شر، جہاں سوتے ہیں خوابوں کے مزاروں میں!
مری سلمیٰ! مجھے لے چل، تو ان رنگیں نظاروں میں

بہشتوں کی لطافت ہے جہاں کی زندگانی میں
مزہ آتا ہے کوثر کا جہاں کے سادہ پانی میں
خدائی حسن عریاں ہے جہاں کی نوجوانی میں!
صداقت کروٹیں لیتی ہے، سازِ دل کے تاروں میں
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو اُن رنگیں نظاروں میں

"حیاتِ دائمی" لکھا ہوا ہے جن کے ایواں پر
ارم زار ابد ہے سایہ زن جن کے خیاباں پر
دوامیت کے جلوے چھا رہے ہیں باغ و بستاں پر
گزر ممکن نہیں ہے موت کا جن کے نظاروں میں
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو اُن رنگیں نظاروں میں

محبت میں جو ہو جاتا ہے پائندہ، نہیں مرتا!

صداقت جس کو کر دیتی ہے تابندہ، نہیں مرتا!
ہے جس میں عشق رقصاں، وہ دل زندہ نہیں مرتا!
نوائے "لا فنا" ہے روح کے خاموش تاروں میں
مری سلمیٰ! مجھے لے چل تو اُن رنگیں نظاروں میں!

سپاہی سے خطاب

عجیب رنگ بدلتا ہے چرخِ فتنہ شعار
کہ ایک دن کو ہے امن اور چار دن پیکار
اسی روش پہ ہے سارے جہاں کا دار و مدار
مرے سپاہی! ابھی ہاتھ سے نہ رکھ تلوار!

بجا کہ تُو نے بہت، اب سے پہلے کام کیا
دلاوری و شجاعت میں خوب نام کیا
مگر یہ کس کو خبر کیا کریں یہ لیل و نہار
مرے سپاہی! ابھی ہاتھ سے نہ رکھ تلوار!

فضائے دہر میں خاموش اضطراب سا ہے
افق کے سینے میں پوشیدہ انقلاب سا ہے
دکھائے دیکھئے کیا رنگ گنبدِ دوّار؟
مرے سپاہی! ابھی ہاتھ سے نہ رکھ تلوار!

زمانہ پھر نئے فتنے اُٹھانے والا ہے
ہوا بتاتی ہے طوفان آنے والا ہے
وہی ہے مرد جو ہر حال میں ہے تیار!
مرے سپاہی! ابھی ہاتھ سے نہ رکھ تلوار!
قیامت آئے کہ فتنے اُٹھیں خیال نہ کر
سپاہی ہے تو کچھ اندیشۂ مآل نہ کر
کہ موت کہتے ہیں جس کو وہ آتی ہے اک بار
مرے سپاہی! ابھی ہاتھ سے نہ رکھ تلوار!

فسادزدہ ہندستان

فساد کاریِ ہندوستاں کو کیا کہئے؟
سقر نہ کہئے تو "جنت نشاں" کو کیا کہئے؟
کوئی بتائے کہ ہو میرِ کارواں گمراہ!
تو جب گمرہیِ کارواں کو کیا کہئے؟
بپا ہے جنگ کا فتنہ تمام دنیا میں!
الٰہی اب ترے امن و اماں کو کیا کہئے؟
لکھا ہے ملک کی قسمت میں گر زیاں ہی زیاں
طلسم کاریِ سود و زیاں کو کیا کہئے؟

گنوا دی عقل اگر بوڑھے رہنماؤں نے
تو اس دیار کے ناداں جواں کو کیا کہیئے ؟
ہر ایک شاخ کو گل چیں نے کر دیا ویراں
سکوتِ بیکسیٔ گلستاں کو کیا کہیئے ؟
کبھی نہ بدلے تبسم سے اشک ، مفلس کے
بہارِ خندۂ بزمِ شہاں کو کیا کہیئے ؟
جوان ایک ہی ساغر میں ہو چلے رُسوا
سبا ہ مستیٔ پیرِ مغاں کو کیا کہیئے ؟
شباب روتا ہے ، پیری میں حال کیا ہوگا
بہار یہ ہے تو فصلِ خزاں کو کیا کہیئے ؟
بنی نہ اپنی زمیں ہی گر اخترِ اپنی زمیں
تو پھر ستم گریٔ آسماں کو کیا کہیئے ؟

نغمۂ امن!

ہم نشیں آ صفِ باطل کو پریشاں کر دیں
امن و ایماں کی بہاروں کو نمایاں کر دیں!
خرمنِ ہستیٔ اعدا کو جلا کر اُس سے
کامرانی کی فضاؤں کو چراغاں کر دیں!

جان جائے کہ رہے ملک کی خاطر ہمدم!
دشمنِ ملک کو تو بے سر و بے جاں کر دیں!

نغمۂ حبِ وطن گائیں اس انداز سے ہم
کہ نوا کاریِ زہرہ کو پریشاں کر دیں!

جنگ کا دلولہ پیدا کریں اس صورت سے
کہ فسوں سازیِ مریخ کو حیراں کر دیں!

دشمنِ ملک کے پرچم کو نگوں سر کر کے
علمِ فتح، سرِ چرخ نمایاں کر دیں!

محفلِ فتح میں صہبا کی ضرورت نہ رہے
خونِ اعدا کو کچھ اس طرح سے ارزاں کر دیں!

امن کے نغمے پھر اک بار سنائیں اختر
محفلِ دہر کو پھر رشکِ گلستاں کر دیں!

فانی و باقی

برہمن میں نہ پیرانِ کراماتی میں ہے باقی!
صداقت ہے تو رندانِ خراباتی میں ہے باقی!

خلوصِ اعتقاد و حسنِ نیت جس کو کہتے ہیں!
بسنتی لال میں باقی، نہ شبراتی میں ہے باقی!

بتاتی ہے یہ کثرت ہوٹلوں کی، آج شہروں میں
کہ مہمانی کا جذبہ صرف دیہاتی میں ہے باقی !
بجائے من و سلویٰ، بم برستے ہیں فضاؤں میں
یہ تاثیر اب تو فیضانِ سماواتی میں ہے باقی !
دلیروں کی جگہ جنگ آزما ہیں آج کل تاجر
بس اتنا جوش اب ذوقِ مہماتی میں ہے باقی !
اب و جد کی حکومت مٹ چکی دنیائے فانی سے
حکومت اب بھی لیکن، جوہرِ ذاتی میں ہے باقی !
عقیدے کی صفائی ہو کہ جذبِ باوفائی ہو
نہ بنگالی میں ہے باقی، نہ گجراتی میں ہے باقی !
حقِ ہمسایہ کا پاس، اگلے دنوں کا جو زیور تھا
نہ اب بدھ سنگھ میں ہو باقی نہ جسراتی میں ہے باقی !
اولوالعزمی و ہمت، ایک دن ہم جس کہتے تھے
نہ میسوری میں ہے باقی، نہ میواتی میں ہے باقی !
جنونِ تکفیر کا جوشِ جہالت، کبر و خود بینی
یہی زاہد کی تعلیم روایاتی میں ہے باقی !
بتوں کی تنگ نظری، لکشمی بن کر چمکتی ہے
یہی دنیا ہے جو لے دے کے اب جاتی میں ہے باقی !

وفاداری کا جذبہ، جس پہ کٹ مرتے تھے غیرتمند
نہ پنجابی میں ہے باقی، نہ قلاتی میں ہے باقی!
لرز اٹھتے ہیں جس سے عرش اب بھی وہ اثر آخر
نوائے صبح گاہی و مناجاتی میں ہے باقی!

حیاتِ آتشیں

سوزِ دل میرے لئے، زخم جگر میرے لئے
زندگی ہے مری اک رقصِ شرر میرے لئے
چرخ نے میری تباہی پہ بہائے آنسو
دیدۂ انجم و ناہید ہے تر میرے لئے
ملتی ہے دولتِ وجدان، باندازۂ ظرف
رنگ و بو تیرے لئے، سوز و شرر میرے لئے
زندگی گرچہ ہے مجبوریِ فطرت کا ثبوت
پھر بھی ہیں دشت و جبل زیر و زبر میرے لئے
کیا ڈروں موت سے اے ہمدمِ آرام پسند
خون اور خاک تو ہے شہد و شکر میرے لئے
پاس منظور ہے فطرت کو مری رفعت کا
ورنہ گردش میں ہیں کیوں شمس و قمر میرے لئے

بوالہوس آگہ باندازۂ ہمت خوش ہوں
برگ و گل تیرے لئے، تیغ و تبر میرے لئے
تا ابد روئے گی اختر جسے چشمِ دوراں
کی ہے مخصوص ازل نے وہ نظر میرے لئے

انقلابِ جاپان

جو کل تک جنگ میں مصروف تھے شانِ خدائی سے
جنہیں دعویٰ تھا ہرگز منہ نہ موڑیں گے لڑائی سے!
سما سکتے نہ تھے جامے میں جوشِ خود نمائی سے!
وہی اب رحم کے طالب ہیں اندازِ گدائی سے

کہاں ہے آج وہ چینی غریبوں پر عتاب اُن کا؟
وہ بیکس عورتوں پر قہر، بچوں پر عذاب اُن کا؟
دیا اک "ذرّہ" ناچیز نے آخر جواب اُن کا!
مزہ دیکھو کہ یہ بت کانپ اٹھا ایک رائی سے

وہ سورج بنسیوں کی اب حرارت کیا ہوئی آخر؟
شہنشاہانہ عظمت اور شوکت کیا ہوئی آخر؟
وہ سپنا یعنی مشرق کی حکومت کیا ہوئی آخر؟
وہ پندار اب کہاں جو ٹکر لیتا تھا خدائی سے

نہ تھا معلوم انہیں، رنج و طرب باہم بھی ہوتے ہیں
"فلک دیتا ہے جن کو عیش اُن کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں"
تعلق ہے ـــــــ ہی، بادشاہی کو گدائی سے

خرابی و تعمیر

نئے بنتے ہیں، جب قصرِ کہن مسمار ہوتے ہیں
حریم امن، بعد از جنگ ہی تیار ہوتے ہیں
خیابانِ جہاں کی کچھ وہی رونق بڑھاتے ہیں
خزاں کی قبر سے جو گل کدے بیدار ہوتے ہیں
مشیت اُن ممالک کو عطا کرتی نہیں راحت
جو اوروں کی اذیت کے لئے تیار ہوتے ہیں
پگھلتے ہیں جو آہن پارے آہنگر کے گلخن میں
وہی موسوم اک دن "خنجر شہوار" ہوتے ہیں
ہر اک زحمت، دلیلِ رحمتِ خلاقِ باری ہے
جو سر بازی کے عادی ہوں وہی سردار ہوتے ہیں
وہ زر پارے جنہیں بے دردی سے زرگر کچلتا ہے
وہی اک دن حسینوں کے گلے کا ہار ہوتے ہیں

جو قومیں اپنی نادانی سے فتنوں کو جگاتی ہیں
وہی فتنے، اُنہی کے درپے آزار ہوتے ہیں
تباہی کے حجابوں میں عمارت جلوہ آرا ہے
نہالانِ چمن بعد از خزاں گلبار ہوتے ہیں
خرابی میں نہاں ہے، ہر نئی تعمیر کی دُنیا
گلِ پامال سے جامِ حسیں تیار ہوتے ہیں

غزلیات

رات بھر اُن کا تصور، دل کو تڑپاتا رہا

رات بھر اُن کا تصوّر دل کو تڑپاتا رہا!
ایک نقشا سا سامنے آتا رہا جاتا رہا

سب نہ ملنے تک کی باتیں تھیں جب آکر مل گئے
رہ گئے شکوے مٹ گئے سارا گلہ جاتا رہا

اِن لبوں کو ہی نہ تھا گستاخیوں کا حوصلہ
ہم نے مانا عمر بھر وہ ہم کو ترساتا رہا

اُس حریمِ ناز کا اب تک نہ پایا کچھ پتا
ہاں یوں، کم بخت دل گلیوں میں بھٹکاتا رہا

ذکرِ راحت کیا کہ تسکیں تک نہ حاصل ہو سکی
گرچہ اک عالم، ہمارے دل کو بہلاتا رہا

اُس طرف اُس نازنیں کے سینے میں موجِ اضطراب
اِس طرف نادان دل سینے میں گھبراتا رہا
محفلِ جاناں میں سب کو اپنی اپنی فکر ہے
کوئی اخترؔ سے تو پوچھے تیرا کیا جاتا رہا

ہوا زمانہ کہ اُس نے ہم کو نہ بھول کر بھی سلام بھیجا

ہوا زمانہ کہ اُس نے ہم کو نہ بھول کر بھی سلام بھیجا
مزاج پوچھا، نہ حال لکھا، نہ خط، نہ کوئی پیام بھیجا
نہیں ہے توبہ کا اعتبار اب، نہیں ہے کچھ دل پہ اعتبار اب
بُلا رہی ہے ہمیں بہار اب، گھٹاؤں نے بھی پیام بھیجا
یہ بے بسی کیسی بے بسی ہے کہ رُک سکے وہ نہ تا بہ آخر
نگاہِ غمگیں نے تا بہ آخر پیام شوق تمام بھیجا
بہارِ امید چھا رہی ہے، بہشتِ دل لہلہا رہی ہے
یہ پھول کیوں اُس نے خط میں رکھ کر ہمیں بایں اہتمام بھیجا
نگاہِ اخترؔ نے کہہ دیا کیا کہ جا، چھپا ساقیِ دلارا
نہ بادۂ مشکبو عطا کی، نہ ساغرِ لالہ فام بھیجا

کبھی دشت و گلشن کبھی آستانہ!

کبھی دشت و گلشن کبھی آستانہ
کہاں ہے ترے غمزدہ کا ٹھکانہ
نسیمِ سحر اُن کو جا کر سُنانا
مری شامِ فرقت کا غمگیں فسانہ
ستانے لگا بے طرح پھر زمانہ
ذرا ساقیہ، ساغرِ مے تو لانا
بدلتی ہے سو رنگ آنکھوں کی گردش
رُلا کر ہنسانا، ہنسا کر رُلانا
ہمارا مقدر نہ بدلا نہ بدلا
بدلتا رہا رنگ لاکھوں زمانہ
نگاہِ فسوں گر کی گردش سے پوچھو
رلاتا ہے کیوں ہم کو دورِ زمانہ
عجب بزم ہے بزمِ ہستی بھی اخترؔ
نہ بیگانہ کوئی نہ کوئی یگانہ

کیا کریں اے دل اگر آئی بہار

کیا کریں اے دل اگر آئی بہار
اُن کی خوشبو تک نہیں لائی بہار
وہ بہارِ زندگی ہے مجھ سے دور
ہائے تو ایسے میں کیوں آئی بہار
وہ نگاہِ شوخ وہ شہر آشوب اُٹھی
یا چمن زاروں پہ لہرائی بہار
اُف وہ اُن کی نیم خوابی کا سماں
لے رہی ہو جیسے انگڑائی بہار
دشتِ غربت میں ہے اب وہ گلبدن
سُن کے یہ آنے پہ پچھتائی بہار
جن گلوں کو لے گئی تھی کل خزاں
اُن کی بھی کوئی خبر لائی بہار
ہم ہیں اور اُن کی جُدائی کا الم
اخترؔ اب کے سال کیوں آئی بہار؟

کس لئے تنہا چلی آئی بہار

کس لئے تنہا چلی آئی بہار! / ساتھ اُن کو کیوں نہیں لائی بہار

جب بہارِ نوجوانی مٹ چکی / میرے کاشانے میں تب آئی "وہ بہار"

لالہ و نرگس کی آنکھیں کھل گئیں / دیکھ کر ان کو جو شرمائی بہار!

کس سے پوچھیں اے نگاہِ منتظر / وہ نہیں آئے تو کیوں آئی بہار؟

ایسی بھی کیا رُودِ جمنا کی کشش / اب بھی راوی کی نہ یاد آئی بہار

جب نہ اُس رنگیں ادا کو لا سکی / اختر اپنے ساتھ کیا لائی بہار؟

مری روحِ رنگیں، مری جانِ شیریں!!!

مری روحِ رنگیں، مری جانِ شیریں / تمنائے زریں وارمانِ شیریں

ترا رُخ ہے برقِ سحابِ بہاریں / ترے لعلِ لب ہیں گلستانِ شیریں

تخیل ترا ایک وادیٔ رنگیں / تصوّر ترا اک خیابانِ شیریں

تری یاد اک جنتِ رنگ و بو ہے / ترا خواب، اک یوسفستانِ شیریں

ترا عشق، جس دن سے ہے جلوہ فرما / مرا دل بنا ہے شبستانِ شیریں

ہیں کاکل ترے ابرِ بارانِ نکہت / ہیں آنکھیں تری نرگستانِ شیریں

تری جعدِ مشکیں ہے خوابِ بہاراں
تری زلف ہے سنبلستانِ شیریں

مثالِ گردِ رواں میرے رہ گزر میں ہیں!

مثالِ گرد، رواں میرے رہ گزر میں ہیں
وہ جلوے جو مہ و ناہید کی نظر میں ہیں

کسی کو کوچ کا فرماں کسی کو حکمِ قیام
ترے جہاں میں ہیں یارب کہ ہم سفر میں ہیں

ترے ہی جام کا ساقی مجھے سرور نہیں
کچھ اور جام بھی رقصاں مری نظر میں ہیں

ہر ایک ذرّے پہ دھوکا ہے انجمستاں کا
یہ کس کے جلوے پریشاں مری نظر میں ہیں

عجیب رنگ ہے دورِ قیامِ عالم کا!
کہ ہم سفر میں نہیں اور پھر سفر میں ہیں

کسے ہے فرصتِ فکرِ حیاتِ بعدِ فنا
مگر یہ ناز کہ اک شوخ کی نظر میں ہیں

مری نگاہ میں روشن ہے منزلِ مقصود
ستارہ و مہ و ناہید ابھی سفر میں ہیں

جو آنسوؤں میں نہ ظاہر ہوں عمر بھر اخترؔ
نہاں کچھ ایسے بھی طوفان چشمِ تر میں ہیں

اُن کو بلائیں اور وہ نہ آئیں تو کیا کریں

ان کو بلائیں اور وہ نہ آئیں تو کیا کریں؟
بے کار جائیں اپنی دعائیں تو کیا کریں؟
اک زہرہ وش ہے آنکھ کے پردوں میں جلوہ گر
نظروں میں آسماں نہ سمائیں تو کیا کریں!
مانا کہ سب کے سامنے ملنے سے ہے حجاب
لیکن وہ خواب میں بھی نہ آئیں تو کیا کریں؟
ہم لاکھ قسمیں کھائیں نہ ملنے کی سب غلط
وہ دُور ہی سے دل کو لبھائیں تو کیا کریں؟
بدقسمتوں کا، یاد نہ کرنے پہ ہے یہ حال
اللہ! گر وہ یاد ہی آئیں تو کیا کریں؟
ناصح! ہماری توبہ میں کچھ شک نہیں مگر
شانہ ہلائیں آکے گھٹائیں تو کیا کریں؟
میخانہ دور، راستہ تاریک ہم مریض!
مُنہ پھیر دیں اُدھر جو ہوائیں تو کیا کریں؟
راتوں کے دل میں یاد بسائیں کسی کی ہم!
اختؔر حرم میں وہ نہ بلائیں تو کیا کریں؟

یہ کون آیا بزمِ گل و یاسمن میں؟

یہ کون آیا بزمِ گل و یاسمن میں؟
کہ شادابیاں جاگ اُٹھیں چمن میں

تری یاد باقی ترا غم سلامت!
بہلتا نہیں دل کسی انجمن میں!

یہ کس نے نگاہِ بہاریں سے دیکھا؟
کہ پھولوں نے انگڑائی سی لی چمن میں

ہر اک ذرّہ اک آنکھ بن کر ہے مضطر
وہ کب آئیں گی میرے دارالمحن میں

یہ مطلب کا بندہ، وہ مطلب کا بندہ
نہیں فرق کچھ شیخ اور برہمن میں

چمن کیا جواب اُس چمن وش کا دے گا
بہت فرق ہے گل میں اور گل بدن میں

یہ سیمیں بدن اور شفق رنگ عارض
کہ گلہائے احمر ہیں شاخِ سمن میں

اُٹھو بادہ نوشو! کریں رقصِ مستی!
وہ آئی بہار، ابر گونجا چمن میں!

وہ جانِ بہار آج آئے گی اخترؔ
چلو چل کے کلیاں بچھا دیں چمن میں

پلائے جا، پیئے جا خوب ساقی!

پلائے جا، پیئے جا خوب ساقی — کہ ہستی ہے سراسر اتفاقی!
جہاں کی لذتوں سے تھک چکا ہوں — نہیں کوئی تمنا دل میں باقی!
کسی صورت بہلتا ہی نہیں دل — "سُلیمیٰ مُنذُ حلّت بالعراقِ"
وہ جانِ آرزو ہے دور جب سے — "اُلاقی فی ہواہا ما اُلاقی"
ٹھہرائے ساربانِ محملِ ناز — "الیٰ رکبانکم طال اشتیاقی"
بتانِ ہند سے تنگ آ چکے ہم — کدھر ہیں نازنینانِ عراقی؟
غموں کا سایہ کب تک زندگی پر — گنوا دے میکدے میں عمرِ باقی
چھلک جائے نہ پیمانۂ دو عالم — ہمارا ہات ہے اور زلفِ ساقی

نہیں ہے عشق اگر اخترؔ تو کیوں ہیں!
یہ راتیں اور غمہائے فراقی؟

بجا کہ ہے پاسِ حشر ہم کو کریں گے پاسِ شباب پہلے

بجا کہ ہے پاسِ حشر ہم کو کریں گے پاسِ شباب پہلے
حساب ہوتا رہے گا یارب، ہمیں منگا دے شراب پہلے

فضائے شب، ہنس کے جگمگائی، وہ نازنیں صبح بن کے آئی
ہوا ہے روشن مرے شبستاں میں چاند سے، آفتاب، پہلے

زباں پہ آیا نہ حرفِ مطلب کہ کہہ گئیں کچھ شریر نظریں
سوال کرنے نہ پائے ہیں ہم کہ مل گیا ہے جواب، پہلے

جناں میں پہلے پہل پئے گا، تو لڑکھڑاتا پھرے گا زاہد!
سرورِ کوثر کی ہے اگر دھن، جہاں میں پی لے شراب، پہلے

ہے خسروِ عشق کا یہ فرماں، کہ دل لگانا نہیں ہے آساں
جسے ہو کوئے بتاں کا ارماں، وہ کو بکو ہو خراب، پہلے

غم والم، رنج و یاس و حسرت اُٹھاؤں گا سب کے رُخ سے پردے
تمہیں قسم ہے دلِ حزیں کی، اٹھاؤ تو تم، نقاب، پہلے

الٰہی، وہ بوئے پیرہن سے بھی پہلے ہو ہمکنار آکر
چمن میں ہوتا ہے جلوہ افروز پھول سے ماہتاب، پہلے

یہ کس کے رنگِ رخِ بہاریں نے بخش دی ہے طراوتِ نو
شگفتہ ہوتا نہ تھا گلستاں میں اس ادا سے گلاب، پہلے

نگاہ ساقی کی مسکرائی، کہا جب اختر نے اپنی دھن میں
پئیں گے، پیتے رہیں گے میکش، مگر یہ خانہ خراب، پہلے

فصلِ گُل آئی، گئی، غم کر چکے!

فصلِ گُل آئی، گئی، غم کر چکے
اے محبت تیرا ماتم کر چکے

اُن سے ملنے کی ہو اب تدبیر کیا
ہم جو کر سکتے تھے ہمدم کر چکے

دل میں باقی ہے ابھی تک اک خلش
گرچہ توبہ عشق سے ہم کر چکے

بعدِ مردن کیوں ہو رنج احباب کو؟
جیتے جی ہم اپنا ماتم کر چکے

اپنے قصّوں ہی سے فرصت ہے کسے
چارۂ دل، میرے ماتم کر چکے

کیوں سلامت ہے نظامِ دو جہاں
اپنی زلفوں کو وہ برہم کر چکے

عمر بھر اختر لٹائے مے کدے
زندہ رسمِ خسرو و جم کر چکے

نو بہاروں کا سماں دکھلا چلے

نو بہاروں کا سماں دکھلا چلے
جب بھی آئے پھول سے برسا چلے

رات دن، کب تک ستائے جائے گا
بس کر اے غم، اب تو ہم گھبرا چلے

کب تک آئیں گے وہ اے صبحِ اُمید
اب تو سارے پھول بھی کمھلا چلے

پہلے ساتھی تھا نہ اب ساتھی کوئی
آئے تھے تنہا یہاں، تنہا چلے

تیرے پائے ناز پر گر جائیں ہم
ساقیا! اک دور تو ایسا چلے

وہ نہ آئے لے کے پیغامِ بہار
آرزوؤں کے چمن مرجھا چلے

آہ! اختر، وہ نگاہِ فتنہ ریز!
دل کے ارماں، دبکے سب کملا چلے

حسرتوں سے دل کا دامن بھر چلے

حسرتوں سے دل کا دامن بھر چلے
ہائے اس دنیا میں ہم کیا کر چلے

کب تلک یہ رنج و غم، درد و الم!
زندگی! او زندگی، ہم مر چلے

مختصر صحبت ہے ساقی جلد جلد
جام اُٹھے، مینا بڑھے، ساغر چلے

راحتیں دیکھیں جہاں میں رنج بھی
خار و گل سے اپنا دامن بھر چلے

آج وہ مہ جبیں یاد آ گئی!
آج پھر ہم سوئے امرتسر چلے

مطرب! نغمہ، کہ دل گھبرا گیا
ساقیا! ساغر، کہ غم سے مر چلے

آج پینے کا مزہ آیا نہیں
ساقیہ! ساغر سنبھال اختر چلے

نہ تمہارا حسن جواں رہا، نہ ہمارا عشق جواں رہا!

نہ تمہارا حُسن جواں رہا، نہ ہمارا عشق جواں رہا
نہ وہ تم رہے نہ وہ ہم رہے، جو رہا تو غم کا سماں رہا

نہ وہ باغ ہیں نہ گھٹائیں ہیں، نہ وہ پھول ہیں نہ فضائیں ہیں
نہ وہ نکہتیں نہ ہوائیں ہیں، نہ وہ بیخودی کا سماں رہا

نہ وہ دل ہے اب نہ جوانیاں، نہ وہ عاشقی کی کہانیاں
نہ وہ غم نہ اشک فشانیاں، نہ وہ دردِ دل کا نشاں رہا

نہ چمن ہے وہ نہ بہار ہے، نہ وہ بلبلیں نہ ہزار ہے
یہی چار سمت پکار ہے، نہ وہ رُت ہی اب نہ سماں رہا

نہ وہ قصے ہیں نہ حکایتیں، نہ وہ شکوے ہیں نہ شکایتیں
نہ وہ دردِ دل کی شکایتیں، نہ غمِ شرارہ فشاں رہا

نہ وہ عشق ہے نہ وفا رہی، نہ وہ حسن ہی نہ جفا رہی
نہ وہ اپنی اپنی ادا رہی، نہ وہ اپنا اپنا جہاں رہا

نہ وہ عمر ہے نہ مسرتیں، نہ وہ عیش ہے نہ وہ عشرتیں!
نہ وہ آرزوئیں نہ حسرتیں، نہ خوشی کا نام ونشاں رہا

نہ نشاں ہے ساقی وجام کا، نہ وہ بادہ ہائے چمن ادا
نہ مغنیہ رہی محوِ ساز، نہ سازِ مسرتِ فغاں رہا!

یہ بہارِ گلشن آب و گِل ہے فنا اثر تو ہوں کیوں خجل
وہ گُلِ فسردہ ہے میرا دل، کہ ہمیشہ نذرِ خزاں رہا

نہیں صبر ساقیا لا ابھی دے قدحِ بہار اٹھا بھی دے
ابھی سن ہے لا کے پلا بھی دے کہ ہمیشہ کون جواں رہا

کہوں کیا کہ رنج رسیدہ ہوں، میں برنگِ ابر رمیدہ ہوں
نفسِ شمیم پریدہ ہوں کہ رہا تو باد بہار رہا

اثرِ بہارِ خزاں اثر، ہے کہ ہے فسردہ مری نظر!
نہ ہوائے عشرتِ بال و پر، نہ جنونِ باغ جناں رہا
میں گُلِ رمیدۂ رنگ و بو، تو بہارِ میکدۂ نمو!
میں ہمیشہ خستۂ آرزو، تو ہمیشہ عیشِ جواں رہا
نہ سکونِ دل نہ قرارِ جاں، نہ قیامِ صبر کوئی زماں
یہ سحرِ شبِ غم کا ہے کارواں کہ یونہی ہمیشہ رواں رہا
تو متاعِ گلکدۂ نظر، گل نو بہارِ بہشت اثر
میں وہ عندلیبِ شکستہ پر، کہ ہمیشہ محوِ فغاں رہا
نہ وہ سوز و سازِ دروں ہے اب، نہ وہ جشنِ گلکدہ گوں ہے اب
نہ وہ سر ہے اب نہ جنوں ہے اب، نہ وہ ذوقِ شعلہ چکاں رہا
ہے فلک کی بدلی ہوئی نظر، کہیں کس سے اختر نالہ گر
کہ ہیں اس کے جورِ الم اثر سے ہمیشہ محوِ فغاں رہا

مجھے ذوقِ باغ و چمن نہیں، مجھے شوقِ سرو سمن نہیں

مجھے ذوقِ باغ و چمن نہیں، مجھے شوقِ سرو سمن نہیں
میں کروں تو کیا کہ دلِ ہم نشیں کہ نصیبِ صبحِ وطن نہیں
کوئی جام بادۂ شوخ کا، ہمیں جلد ساقیہ ہو عطا
کہ ذرا سی دیر ٹھہرنے کی بھی جگہ یہ دیرِ کہن نہیں

ہے خوشی کی وجہ مرا محن کہ ستا رہے مجھ پہ ہیں طعنہ زن
مرے جامِ سادہ میں آج کیوں مری حورِ شعلہ بدن نہیں
یہ فسونِ کارِ رنگ کہاں تلک، یہ خموش جنگ کہاں تلک
کہ تری حیا کے زباں نہیں، مری حسرتوں کے دہن نہیں
مرے ذوقِ سوز و گداز نے، مجھے خاک کر کے ہی رکھ دیا
وہ ہنسی نہیں، وہ خوشی نہیں، وہ الم نہیں، وہ محن نہیں
اُٹھے کیوں نہ سینے سے موجِ خوں، مری آنکھ کیوں نہ ہو لالہ گوں
کہ نظر کے سامنے اے جنوں، وہ نگارِ لالہ بدن نہیں
کروں کیا میں اخترِ غم زدہ کہ ہوں کیوں اسیرِ غم و بلا!
کہ میں جس چمن کا ہوں عندلیب، میسر اب وہ چمن نہیں

کام آسکیں نہ اپنی وفائیں تو کیا کریں؟

کام آسکیں نہ اپنی وفائیں تو کیا کریں؟
اک بے وفا کو بھول نہ جائیں تو کیا کریں؟
تجھ کو یہ اعتراف، دعاؤں میں ہے اثر
جائیں نہ عرش پر جو دعائیں تو کیا کریں؟
اک دن کی بات ہو تو اُسے بھول جائیں ہم
نازل ہوں دل پہ روز بلائیں تو کیا کریں؟

ظلمت بدوش ہے مری دنیائے عاشقی
تاروں کی مشعلیں نہ چرائیں تو کیا کریں؟
شب بھر تو اُن کی یاد میں تارے گنا کئے
تارے سے دن کو بھی نظر آئیں تو کیا کریں؟
عہدِ طرب کی یاد میں رو یا کئے بہت
اب مسکرا کے بھول نہ جائیں تو کیا کریں؟
اب جی میں ہے کہ اُن کو بھلا کر ہی دیکھ لیں
وہ بار بار یاد جو آئیں تو کیا کریں؟
وعدہ کے اعتبار میں تسکینِ دل تو ہے
اب پھر وہی فریب نہ کھائیں تو کیا کریں؟
ترکِ وفا بھی جُرمِ محبت سہی، مگر!
ملنے لگیں وفا کی سزائیں تو کیا کریں؟

دل ہے میرا مقامِ غم، غم کا مقام ہے جہاں

دل ہے میرا مقامِ غم، غم کا مقام ہے جہاں
نالۂ صبح ہے یہاں، گریۂ شام ہے یہاں
ایک تصورِ حسیں، خلوتِ دل میں ہے مکیں
دیدۂ شوق کے لئے دید حرام ہے یہاں

نکہت و نور و نار اُدھر ظلمت و سوز و ساز اِدھر
صبح ہی صبح ہے وہاں، شام ہی شام ہے یہاں
صحنِ چمن میں ہر جگہ نشّہ سا پھیلنے لگا!
آج یہ کون مہ لقا مستِ خرام ہے یہاں؟
میرا الم کدہ نہیں رنگِ طرب سے آشنا
فصلِ خزاں ہو یا بہار، ماتمِ عام ہے یہاں
اُن کے لئے سرور و ناز، میرے لئے غم و گداز
گردشِ چشم ہے وہاں، گردشِ جام ہے یہاں

شاید کہ دیکھے ہیں، لبِ شیریں دہن کے پھول

شاید کہ دیکھے ہیں، لبِ شیریں دہن کے پھول
کیوں آج مسکراتے ہیں سارے چمن کے پھول؟
کیوں عارضوں کا رنگ اُڑا عرضِ شکوہ پر
نسریں کے پھول بن گئے کیوں یاسمن کے پھول؟
شاداب جلوہ ہائے بہاراں ہے بزمِ ناز!
جھڑتے ہیں مُنہ سے اُس گلِ رنگیں دہن کے پھول
بے اختیار جھومتے ہیں شاخسار پر!
بیخود ہیں کس کے شوق کے مارے چمن کے پھول؟

اُس پیکرِ بہار کی کیا بات ہے ندیم!
چھُو لے اگر تو سرو میں آئیں سمن کے پھُول!

دستِ حنائی کس کے اُٹھے فاتحہ کو یہ؟
شاداب ہو رہے ہیں ہمارے کفن کے پھُول

ہم غم زدوں کو سرو و گُل و یاسمن سے کیا؟
قسمت میں ہیں فقط غم و رنج و محن کے پھُول

کیا بات گلشنِ لبِ رودِ نباس کی!
دیکھے ہیں ہم نے وادیِ گنگ و جمن کے پھُول

اُڑ جائیں بن کے موجۂ نکہت، سوئے جناں
تم دستِ نازنیں سے جو چھو لو چمن کے پھُول

اُس بزمِ رنگ و بُو میں اگر بار، مل سکے
قربان اُس پہ ایک نہیں سو چمن کے پھُول

اختر ہمارے شکوؤں کی تقدیر۔ الاماں
کچھ کھل کے رہ گئے لبِ شیریں دہن کے پھُول

ماہیے

ماہیئے
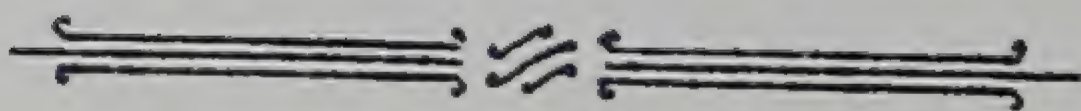
(۱)

چاندنی راتوں میں

اُن چاندنی راتوں میں
کھو جاتے تھے جب دونوں، ہم پیار کی باتوں میں
اُن چاندنی راتوں میں

جب دل نہ سنبھلتا تھا
اور عشق مچلتا تھا، ارمانوں کی گھاتوں میں
اُن چاندنی راتوں میں

لطف آتا تھا آہوں میں
مچلی ہوئی باہوں میں، پھیلے ہوئے ہاتوں میں!
اُن چاندنی راتوں میں

شرماتے تھے نظّارے
بہہ جاتے تھے نظّارے، بہکی ہوئی باتوں میں
اُن چاندنی راتوں میں

(۲)

آمدِ بہار

پھر فصلِ بہار آئی!
ہر پھول کی خوشبو سے خوشبوئے نگار آئی!
پھر فصلِ بہار آئی!

چھائی ہے گھٹا ہر سُو
مستی میں صبا ہر سو، باغوں میں پکار آئی!
پھر فصلِ بہار آئی!

مستانہ ہوا جاگی!
بلبل کی صدا جاگی، آوازِ ہزار آئی!
پھر فصلِ بہار آئی!

مجبور ہیں وحشت سے
ہم پھول کی صورت سے یادِ رُخِ یار آئی!
پھر فصلِ بہار آئی!

(۱۲)
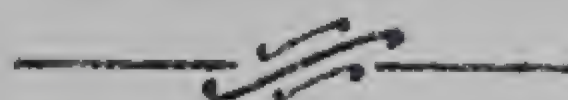
وہ آنکھوں میں بستے ہیں

وہ آنکھوں میں بستے ہیں
رونا یہ ہے ہم پھر بھی صورت کو ترستے ہیں
وہ آنکھوں میں بستے ہیں

دل ہوتا ہے بیکل کیوں؟
آنکھوں سے یہ بادل کیوں، دن رات برستے ہیں؟
وہ آنکھوں میں بستے ہیں

کیا بات ہے ساجن کی
یہ نین تو ساون کی، بدلی سے بھی سستے ہیں!
وہ آنکھوں میں بستے ہیں

فریاد خداؤں سے!
آنکھوں کی گھٹاؤں سے، ساون سے برستے ہیں!
وہ آنکھوں میں بستے ہیں
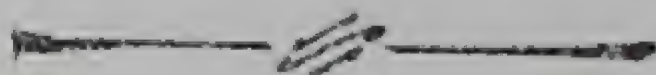
(۴)
گھنگور گھٹاؤں سے

گھنگور گھٹاؤں سے
پھر عشق مرا جاگا، کوئل کی صداؤں سے!
گھنگور گھٹاؤں سے

جی کس کو ترستا ہے
کیوں درد برستا ہے، ساون کی ہواؤں سے!
گھنگور گھٹاؤں سے

کیوں یاد ستاتی ہے
بُو کس کی یہ آتی ہے؟ برکھا کی فضاؤں سے!
گھنگور گھٹاؤں سے

سنسانہ ہوا آئی!
یاد اُن کی اُدا آئی، پھولوں کی اداؤں سے
گھنگور گھٹاؤں سے

یہ عشق نہیں پھلتا!
کچھ کام نہیں چلتا، اختر کی دعاؤں سے
گھنگور گھٹاؤں سے

(۵)

دو دن کی جوانی ہے

دو دن کی جوانی ہے!
دنیا سے کوئی پوچھے کیوں اتنی دوانی ہے؟
دو دن کی جوانی ہے

غم خانہ ہستی میں!
اس خواب کی بستی میں، جو چیز ہے فانی ہے
دو دن کی جوانی ہے

اک خوابِ شبانہ ہے
آہوں کا فسانہ ہے، اشکوں کی روانی ہے!
دو دن کی جوانی ہے

کیوں اس پہ دل آیا ہے
یہ ابر کا سایہ ہے، بجلی کی روانی ہے!
دو دن کی جوانی ہے
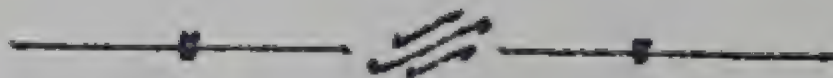
(۶)

تاروں بھری راتیں!

یہ تاروں بھری راتیں!
کیوں یاد دلاتی ہیں ، کچھ بھولی ہوئی باتیں
یہ تاروں بھری راتیں!

ہر آنکھ سے شرمانا!
ہر سایہ سے گھبرانا ، چھپ چھپ کے ملاقاتیں
یہ تاروں بھری راتیں!

وہ منہ سے نہ کچھ کہنا
وہ آنسوؤں کا بہنا ، آنکھوں کی مناجاتیں !
یہ تاروں بھری راتیں!

بے خواب سار کھتی تھیں
بے خواب سار کھتی تھیں ، اختر ہمیں یہ راتیں!
یہ تاروں بھری راتیں!

شہرود
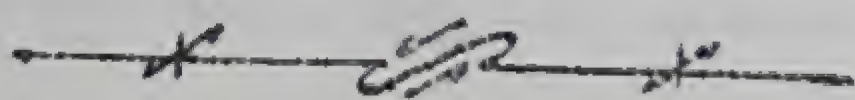
اختر شیرانی مرحوم کے کلام کا آخری مجموعہ

ناشر

کتاب محل۔ کھاری باؤلی۔ دہلی

نذر

سلمےٰ

مرو کہ در غمِ ہجرِ تو از جہاں برویم
بیا کہ پیشِ تو از خویش ہر زماں برویم
سخن بگوے کہ پیشِ لبِ تو جاں بدہیم
رہا مکن کہ دریں حسرت از جہاں برویم
روا مدار کہ جاں بر لب ست و ما ز جہاں
ندیدہ کامِ دل از آں لب و دہاں برویم
گدائے کوئے شما ایم و حاجتے داریم
روا مدار کہ محروم از آستاں برویم
مگو کہ حافظ ازیں در برو برائے خدا
کہ ہر چہ رائے تو باشد جز ایں برآں برویم

نعتیں

(۱)

مسند نشینِ عالمِ امکاں تمہیں تو ہو!
اس انجمن کی شمع فروزاں تمہیں تو ہو!

دنیائے ہست و بود کی زینت تمہیں سے ہے
اس باغ کی بہار کے ساماں تمہیں تو ہو!

روشن ہے جس کی ضو سے شبستانِ زندگی
وہ ماہِ نیم ماہِ شبستاں تمہیں تو ہو!

دنیا کی آرزوئیں فنا آشنا ہیں سب
جو روحِ زندگی ہے وہ ارماں تمہیں تو ہو!

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے جس کا نور
وہ جلوہ زارِ حسنِ درخشاں تمہیں تو ہو!

تم کیا ملے کہ دولتِ ایماں ملی ہمیں
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایماں تمہیں تو ہو!

دارائے چرخ و دورِ زمیں جس کے ہیں غلام
وہ نازِ دہر و نازشِ دوراں تمہیں تو ہو!

شادابیٔ صنوبر و نسریں تمہیں سے ہے
بوئے گل و بہارِ گلستاں تمہیں تو ہو!

دنیا و آخرت کا سہارا تمہاری ذات
دونوں جہاں کے والی و سلطاں تمہیں تو ہو!

اختر کو بے نوائیٔ دنیا کا فکر کیا
ساماں طرازِ بے سر و ساماں تمہیں تو ہو!

سرکارِ مدینہ!

(۲)

سودا ہے یہ سر میں
سرکارِ مدینہ! مختارِ مدینہ!

دیکھوں کبھی جاکر دربارِ مدینہ!
یثرب کے نظارے گلزارِ مدینہ!
سرکارِ مدینہ!

بستی ہیں نظر میں!
وہ چاندنی راتیں شاداب کھجوریں!
یا شرم و حیا سے سمٹی ہوئی حوریں!
زلفوں کو سنوارے سرشارِ مدینہ!
سرکارِ مدینہ!

وحشت ہے نظر میں
اور غم کے اثر سے روئی ہوئی آنکھیں!
حسرت کی فضا میں کھوئی ہوئی آنکھیں!
دل کیوں نہ پکارے دلدارِ مدینہ!
سرکارِ مدینہ!

ہے درد جگر میں
اور دل بھی ہے بسمل بے تاب ہے جاں بھی!
آنکھوں میں ہیں آنسو اور لب پہ فغاں بھی!
غم کے ہیں اشارے! غمخوارِ مدینہ!
سرکارِ مدینہ!

یثرب کے نگر میں

بلواؤ خدارا تنگ آئے ہیں غم سے
روتے ہیں شب و روز فرقت کے ستم سے
ہم درد کے مارے! بیمارِ مدینہ!

سرکارِ مدینہ!

(۳)

لٹائے سجدے نہ کیوں آسماں مدینے میں
رسولِ پاک کا ہے آستاں مدینے میں

قدم بڑھائے چلو رہروانِ منزلِ شوق
ہے ابرِ رحمتِ حق گلفشاں مدینے میں

درِ رسولؐ کے ذرّوں کی گر تلاش نہیں
تو کس کو ڈھونڈتی ہے کہکشاں مدینے میں

بہشت چیز ہی کیا ہے کہ ایک سجدے میں
ہمیں تو مل گئے دونوں جہاں مدینے میں

قدم اٹھائے ادب سے ذرا نسیم سحر
ہیں محوِ خواب شہِ دو جہاں مدینے میں

مدینے جاتے ہیں پیری میں لوگ سب اختر
مزا ہے کاٹ دو عمرِ جواں مدینے میں

(۴)

سحر دم رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا
خدائی جس کے جلووں سے ہمیشہ جگمگائے گی
شبستانِ حرا کا آج، وہ ماہِ تمام آیا
زمین و آسماں بھی جس کے در پر سر جھکائیں گے
ہیں چرچے قدسیوں میں آج وہ عالی مقام آیا

جبینِ بندگی بے تاب ہے سجدے لٹانے کو
الٰہی تیرے بندوں کی زباں پر کس کا نام آیا؟
مرے دل میں ہزاروں طورِ سینا جگمگا اُٹھے
کچھ اس انداز سے دل میں ترا شوق تمام آیا
بشر تھا وہ مگر ایسا، جسے خیر البشر کہئے
غریبوں کی خبر لی اُس نے بیماروں کے کام آیا
زباں چُپ ہو گئی جب دل نے چھیڑا تذکرہ اُن کا
دلوں کو وجد آیا، جب زباں پر اُن کا نام آیا
تھے جتنے داغ کثرت کے، دلوں سے دھل گئے سارے
لئے ہاتھوں میں ساقیٔ عرب وحدت کا جام آیا
مزا جب ہے کہ جائیں خلد میں ہم اس طرح اختر
کہیں حوریں محمدؐ کا وہ مستانہ غلام آیا

(۵)

لائی نسیم بادیہ خوشبوئے گیسوئے نبیؐ
قربانِ گیسوئے نبیؐ، قربانِ خوشبوئے نبیؐ

ہم بے خودانِ عشق کا، دیر و حرم سے واسطہ
محرابِ بیتِ حق نما ہے قوسِ ابروئے نبیؐ

گلہائے رنگینِ جہاں رکھتے ہیں وقفِ آب و آں
ہاں اے ہوائے گلفشاں لے آ ذرا بوئے نبیؐ

دورِ زماں پردہ اٹھائیں شوق سے ہو لوں ذرا
صدقے سراپائے نبیؐ، قربانِ سر روئے نبیؐ

میں بھی ہوں تم سا اک بشر فرما چکے پھر بھی اگر
تو لے تو جا بادِ سحر میری دعا سوئے نبیؐ

دنیائے آب و گل کہاں، اخترؔ سکونِ دل کہاں
ہے تو سکونِ دل سے ہے آباد اک کوئے نبیؐ

(۶۱)

اگر اے نسیم سحر، ترا ہو گذر، دیار حجاز میں
مری چشم تر کا سلام کہنا حضورِ بندہ نواز میں
نہیں حد عقل نہ پا سکی، فقط اتنا حال بتا سکی
کہ تم ایک جلوۂ راز تھے جو عیاں لباسِ مجاز میں
عجب اک سرور سا چھا گیا، میری روح و دل میں سما گیا
ترا نام ناز سے آ گیا، مرے لب پہ جب کبھی نماز میں
نہ جہاں میں راحتِ جاں ملی نہ متاعِ امن واماں ملی
جو دوائے دردِ نہاں ملی، تو ملی بہشتِ حجاز میں
کروں نذر نغمۂ جاں فزا میں کہاں سے اخترِ غم نوا
کہ سوائے نالۂ غم نہیں مرے دل کے غمزدہ ساز میں

منظومات!

بہاریہ

دھوم ہے گلزارِ ہستی میں پھر آتی ہے بہار
رنگ و بوئے خلد کا پیغام لاتی ہے بہار!

ابر گونجا باغ میں، دھومیں مچاتی ہے بہار!
رس بھرے نغموں کا طوفاں بنکے آتی ہے بہار!

غنچہ و گل کا حسیں ملبوس ہے زیبِ بدن
سر پہ رکھے چاندنی کا تاج آتی ہے بہار!

چشمِ بدبیں کی نظر لگنے نہ پائے اس لئے
پردہ ہائے گل میں چھپ کر مسکراتی ہے بہار!

ہے خس و خار و خزاں کا خوف دل کو اس لئے
ہر کلی میں رنگ بن کر لہلہاتی ہے بہار!

زہرہ و ماہ و ثریّا جھومتے ہیں ناز سے
چاندنی راتوں میں جب نغمے سناتی ہے بہار!

میکشانِ رنگ و بو کو ہو نویدِ بے خودی
جام ہائے گل لئے ہاتھوں میں آتی ہے بہار!

ابر و برق و باد کے رنگیں اشارے الاماں
آ و سلمیٰ! باغ میں ہم کو بلاتی ہے بہار!

آہ یہ برکھا کی راتیں! ہائے یہ ساون کی رُت
کیا سہانے سپنے آنکھوں کو دکھاتی ہے بہار!

بن کے بادل کی گرج، کیا جانے کس کی یاد میں
رات بھر اکثر "حسینوں" کو جگاتی ہے بہار!

تارِ مضرابِ صبا برسا رہا ہے میکدے
شاخِ گل کا بربطِ رنگیں بجاتی ہے بہار!

آہ اُس خورشید وش کی حسن آرائی کا پاس
آستانِ ناز پر سجدے لٹاتی ہے بہار!

کس قدر شوقِ رسائی ہے کہ پائیں باغ میں
اُس کے بستر کیلئے کلیاں بچھاتی ہے بہار!

کس کے گوش و گردن و گیسو کی زینت کیلئے
رات بھر بیٹھی ہوئی گجرے بناتی ہے بہار!

آج وہ جانِ بہار آنے کو ہے شاید ادھر
ورنہ یوں گلشن میں کیوں کلیاں بچھاتی ہے بہار!

ہمدم اس جانِ جہاں کی یاد میں بے اختیار — کیا کہیں کس کس طرح ہم کو رلاتی ہے بہار!
باغ میں جھولے پڑے ہیں جھولتے ہیں گلبدن — لب پہ ساون کے رسیلے گیت گاتی ہے بہار!
اک ادائے شرمگیں ہو کر شباب و حسن کی — مہ جبینوں کی نظر میں مسکراتی ہے بہار!
ایک مستانہ تبسم بن کے جذب و شوق کا — نازنینوں کے لبوں پر لہلہاتی ہے بہار!
ابر چھایا باغ پر پڑنے لگی مینہہ کی پھوار — نوعروسانِ چمن کا منہ دھلاتی ہے بہار!
ناصحِ ناداں کو سمجھا دے یہ کوئی اے ندیم — توبہ ہو جاتی ہے رخصت جبکہ آتی ہے بہار!
جنبشِ بادِ سحر سے شاخ و گل ہیں وجد میں — آبشارِ نغمہ و نکہت بہاتی ہے بہار!
مور گونجے کوئلیں کوکیں پپیہے بول اٹھے — کتنے مطرب اپنے ساتھ لاتی ہے بہار!
شاخسارِ لالہ و گل کو ہلاتی ہے نسیم — نوجواں کلیوں کو یا جھولا جھلاتی ہے بہار!
نغمہ و رقص و مے و مینا کا موسم آگیا — نشۂ کیف و طرب کے پھول اڑاتی ہے بہار!
زہد ہے میری شکستِ توبہ پر کیوں طعنہ زن — دل پہ بس چلتا نہیں جس وقت آتی ہے بہار!
ہوش والوں کو بھی اس موسم میں کب ہے اپنا ہوش — خوابِ طفلی بن کے عالم کو ہنساتی ہے بہار!
دخترانِ غنچہ تھیں زیرِ نقابِ ناامید — چہرہ ہائے ناز سے پردے اٹھاتی ہے بہار!
چاندنی پھیلی ہوئی ہے وادیٔ گلزار پر — یا محیطِ نور و نکہت میں نہاتی ہے بہار!
وہ بہارِ گلستانِ دل نظر سے دور ہے — اختر اس عالم میں کیوں ہم کو ستاتی ہے بہار!

یہ دنیا!

یہ دنیا، جو الم آبادِ افکارِ محبت ہے!
یہ دنیا، جو تظلم گاہِ جورِ دستِ قدرت ہے!

یہ دنیا جو ستم زارِ جنونِ بربریت ہے!
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!
یہ دنیا جس میں آنسو بہتے ہیں "رنگین نگاہوں" کے
یہ دنیا جس میں بادل گونجتے ہیں غم کی آہوں کے
نصیبِ اہلِ آدم کے لئے جو ایک لعنت ہے!
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

زبانِ عیش کہتی ہے بہشتِ بے خزاں جس کو
نگاہِ بے کسی سے دیکھتی ہے کہکشاں جس کو
مگر سینے میں جس کے داغِ خونِ صد لطافت ہے!
یہ دُنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

ہزاروں محفلیں آباد ہیں جس میں گناہوں کی
غموں کی حسرتوں کی، رنج کی، اشکوں کی آہوں کی
جہاں ہر وقت برپا اِک نہ اِک تازہ قیامت ہے!
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

جسے کہتے ہیں ہم گہوارۂ جنّت کی بہاروں کا
جو رہنا ہے ستاروں، سبزہ زاروں، جوئباروں کا

حقیقت ہیں مگر یہ مقتلِ حسن و صداقت ہے!
یہ دنیا دیکھنے میں کسقدر معصوم جنّت ہے!

جہاں مصروفِ ماتم ہیں اُمیدیں نا امیدوں کی
جہاں اشکوں سے لکھی جاتی ہے سرخی نویدوں کی
جہاں ہر تازہ عشرت، اک ابدگاہِ مصیبت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

تمنّائیں تڑپتی ہیں جہاں معصوم روحوں کی
مرادیں تلملاتی ہیں جہاں مغموم روحوں کی
جہاں ہر سمت آفت ہے، مصیبت ہے، اذیّت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

جہاں کا ذرّہ ذرّہ درسِ خونخواری سکھاتا ہے
جہاں حیراں ہے یزداں اور شیطاں مسکراتا ہے
جہاں حیوانیت ہر وقت مصروفِ بغاوت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے

جہاں سینوں میں رنج و غم سے اکثر دل دھڑکتے ہیں
جہاں سوزِ نہاں سے جذبہ ہائے غم بھڑکتے ہیں

جو اک پروردگارِ شعلۂ عشق و محبت ہے
یہ دُنیا دیکھنے میں کس قدر معصُوم جنّت ہے

جہاں پنہاں ہیں ماران سیہ شاخوں کے دامن میں
جہاں خونخوار کانٹے ہیں نہاں پھولوں کی چلمن میں
جہاں باطل کے پردے میں چھپا روئے حقیقت ہے
یہ دُنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

یہ دُنیا! رشک کرتا ہے سوادِ آسماں جس پر
حسد سے ڈالتی ہے اپنی نظریں کہکشاں جس پر
ہمارے دیدۂ تیرہ میں جو اک خوابِ طلعت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے!

جہاں پڑھتا رہا ہوں مرثیے میں شادمانی کے
جہاں لکھتے ہیں نوحے میں نے اپنی نوجوانی کے
جہاں میرے لئے ہر سانس، اک پیغامِ رقّت ہے
یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنّت ہے

ساقی سے

اٹھا ساغر کہ دنیا درپئے آزار ہے، ساقی!
زمانہ ہو کہ قسمت بر سرِ پیکار ہے ساقی!
پلا دے آج تو جتنی مئے گلنار ہے، ساقی!
کہ پھر ابرِ جواں رقصاں سرِ کہسار ہے ساقی!
غضب ہے یہ جوانی اور ہم اس طرح کاٹیں
کہ اک اک سانس اک چلتی ہوئی تلوار ہے ساقی!
زمانے کی طرح رنگت بدلنا کس سے سیکھا ہے
کبھی اقرار ہے ساقی، کبھی انکار ہے ساقی!
پلا دے آج تو جتنی پلائی جا سکے مجھ کو!
ہمائے عمر اُڑنے کے لئے تیار ہے ساقی!
مجھے ذوقِ بلا نوشی نے یہ کیسی سزا دی ہے؟
اِدھر پیرِ مغاں برہم، اُدھر بیزار ہے ساقی!
یہ تیرے سبز پیراہن نے کیسے گل کھلائے ہیں!
کہ میخانے کا میخانہ گُل و گلزار ہے ساقی!
پلا دے جتنی چاہے اب تو مہماں ہیں کوئی دم کے
جرس کا شور گونجا، کارواں تیّار ہے ساقی!
زمین و آسماں سرشار و بیخود ہوں تو حیرت کیوں؟

اِدھر میخانہ بیخود ہے، اُدھر سرشار ہے ساقی!
گھٹائیں ہیں کہ خاکی پوش پہ یاں مُسکراتی ہیں
اٹھا ساغر کہ دنیا حُسن سے سرشار ہے ساقی!
خمارِ شب کو رنگیں کر دے گُلہائے صبوحی سے
نسیمِ صبح جاگی، ابر بھی گلبسار ہے ساقی!
زمانے کے غموں نے یہ سبق ہم کو سکھایا ہے
جو بیخود ہے یہاں ساقی، وہی ہشیار ہے ساقی!
غنیمت جان اس صحبت کو پھر ایسی کہاں صحبت؟
کہ جو منظر ہے ہستی کا فنا آثار ہے ساقی!
ترے میخانے پر قربان کر دی دولتِ ہستی
اور اس پر بھی گلہ، میری وفا نادار ہے ساقی!
چمن بیخود، دمن بیخود، فضا بیخود، ہوا بیخود
اُفق سرمست ہے، ابرِ رواں سرشار ہے ساقی!
نسیمِ شام دل کے ولولوں کو گدگداتی ہے
خدائے کیف و رقص و وجد سے سرشار ہے ساقی!
یہ بادل ہیں کہ ہیں رنگیں پرستاں بیخود و رقصاں
عجب حشرِ حسیں برپا سرِ کہسار ہے ساقی!
پریشاں تو بھی کر دے زلفِ مشکیں دوشِ نازک پر
کہ صحنِ باغ میں اُودی گھٹا گُل کار ہے ساقی!

نہ دے فرصت کہ مجھ کو ہوش آئے اپنے زخموں کا!
کہ دنیا بجسم اک اہرمنِ خونخوار ہے ساقی!
ادب سے ماہِ نو، مرمر کی کشتی لے کر آیا ہے
تری جھوٹی فرشتوں کے لئے درکار ہے ساقی!
خریدی جا نہیں سکتی خوشی دنیائے غمگیں میں
مگر تیرے کرم سے یہ بھی کیا دشوار ہے ساقی!
دلِ غمگیں کو بہلانے کی خاطر در پہ آئے ہیں!
محبت ہے کہ جینے جی کا اک آزار ہے ساقی!
اٹھا تو شاہدِ صہبا کو خوابستانِ مینا سے
بہارِ صبح جاگ اُٹھی چمن بیدار ہے ساقی!
غموں کے ہاتھ سے مر مر کے جینا کیا قیامت ہے
خوشی کا جام لا دے، زندگی دشوار ہے ساقی!
دماغ و دل میں بال افشاں کچھ اس صورت سے رہتا ہے
چھلکتا جام گویا طائرِ افکار ہے ساقی!
خدائی ہے کہ ہے اک بزمِ گلباری و گلکاری
اِدھر گلبار ہے بدلی، اُدھر گلکار ہے ساقی!
محبت کر، غمِ دنیا ستائے تو محبت کر!
محبت اس جہاں میں اک حسیں آزار ہے ساقی!
محبت میں مزے لے لے کے مرنا تو مقدر ہے

مگر اس کے لیے کچھ زندگی درکار ہے ساقی!
عجب کیا ہے مری کی رات آنکھوں ہی میں کٹ جائے
اِدھر بیخواب ہے اختر اُدھر بیدار ہے ساقی!

چناروں کی چھاؤں میں

کشمیر کی حسین بہاروں کی چھاؤں میں
شمشاد و سرو و گل کی قطاروں کی چھاؤں میں
شاخ و شجر کے زمزمہ زاروں کی چھاؤں میں
بادل سے جھانکتے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

امیدِ وصل، ایک فریبِ خیال ہے!
یہ دل نشیں خلش خلشِ بے مآل ہے
اس زندگی میں ساتھ رہیں ہم محال ہے
سفّاک کینہ ساز ستاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

چھایا ہوا ہے ابر، ہوا خوشگوار ہے
موسم ہے، بے خودی ہے، چمن ہے، بہار ہے
اک آخری خوشی کا فقط انتظار ہے!
سرو و گل و سمن کے نظاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

اچھے بُرے زمانے کا اب انتظار کیا؟
ہم غم زدوں کے حق میں خزاں کیا بہار کیا!
ہاں اعتبارِ ہستیٔ بے اعتبار کیا؟
امید خس ہے غم کے شراروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

کہتے ہیں پُر سکوں ہے بہت محفلِ عدم
آزادیٔ کشاکشِ غم حاصلِ عدم

آچل پڑیں جہاں سے سوئے منزلِ عدم　　اس کہکشاں کے راہ گزاروں کی چھاؤنیں
آمر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

آجا کہ بعدِ مرگ، تو آرام مِل سکے!　　تسکینِ دردِ خاطرِ ناکام مِل سکے
درمانِ جورِ گردشِ ایام مِل سکے　　اس رس بھرے افق کے کناروں کی چھاؤنیں
آمر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

اس خاکداں سے دُور ہے اک خاکداں نیا　　دنیا نئی، زمین نئی، آسماں نیا
چھوڑ اس جہاں کو چل کے بسائیں جہاں نیا　　پروین و مشتری کے دیاروں کی چھاؤنیں
آمر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

زہر آبۂ فراق کا پینا نہیں قبول　　تیرے بغیر بادہ و مینا نہیں قبول
دوری کے صدمے جھیل کے جینا نہیں قبول　　مرنا قبول ہم کو بہاروں کی چھاؤنیں
آمر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

ننّھا مہمان

سارے گھر میں نو بہارِ زندگی لایا ہے تُو!　　میرے ننّھے میہماں کس دیس سے آیا ہے تُو؟
کس بہشتِ حُسن میں اب تک تھا کاشانہ ترا!　　میرے اُجڑے باغ میں کیوں کر ہوا آنا ترا؟
کس زباں میں چپکے چپکے گفتگو کرتا ہے تو؟　　کون جانے کس طرح کی ہاؤ ہو کرتا ہے تو؟
منزلِ ہستی سے پہلے کون سی منزل میں تھا؟　　آج تک اے شمعِ محفل، کہہ تو کس محفل میں تھا!
اے گُلِ معصوم، اب تک تیرا گلشن تھا کہاں؟　　طائرِ قدسی ادا تیرا نشیمن تھا کہاں؟

آرزو بن کر کسی سینے میں تو خنداں رہا! | نکہتِ گل تھا، نقابِ غنچہ میں پنہاں رہا!
میری بیوی کی نئے رخسار میں رنگت ہے کیوں! | اجنبی مہمان ہو کر اس کا ہم صورت ہے کیوں؟
انجمستانِ لطافت کا تو زندہ خواب ہے! | یا سپہرِ حسن کا سیارۂ شاداب ہے؟
تو وہ جذبہ ہے جو دل سے چھن گیا اور پاس ہے! | گم شدہ ارماں کا جیتا جاگتا احساس ہے!
دو دلوں کی التجا تعبیر ہو کر آ گئی | دو نگاہوں کی یہی تصویر ہو کر آ گئی
گرچہ پاسِ میہمانی و مروّت ہے مجھے! | اجنبی مہمان، لیکن اک شکایت ہے مجھے!
تو نے آ کر میری بیوی کی محبت چھین لی! | اس کا دل چھینا، مرے دل کی مسرت چھین لی!
میرے گھر میں میہماں ہو کر تو رہزن بن گیا | اس کا عاشق ہو گیا اور میرا دشمن بن گیا
اب وہ پہلے کی طرح مجھ پر فدا ہوتی نہیں | مجھ سے رہتی ہے جدا، تجھ سے جدا ہوتی نہیں
اُف! یہ کیسا انقلابِ آسمانی ہو گیا | اس کا میرے پاس آنا اک کہانی ہو گیا!
چشمِ ظاہر کو نظر آتا ہے طفلِ سادہ تو! | کس طرح میری رقابت پر ہوا آمادہ تو؟
عشق کا پہلا سا اب اظہار وہ کرتی نہیں | مجھ سے پہلے کی طرح اب پیار وہ کرتی نہیں
تیرا آنا تھا کہ اس نے بے وفائی سیکھ لی | ایک گھر میں رہ کے بھی مجھ سے جدائی سیکھ لی
تیرے عشقِ سحر زا میں مبتلا رہنے لگی | ساتھ رہ کر بھی مرے مجھ سے جدا رہنے لگی
میرا بستر تھا جو اک دن تیرا بستر ہو گیا | جو مقدر تھا مرا، تیرا مقدر ہو گیا
تو نے آکر غاصبانہ قبضہ گھر پر کر لیا | گھر پہ قبضہ کیا کیا، ہر دل مسخر کر لیا
نوکروں کو بھی نہیں ہے میری راحت کا خیال | سب کے دل میں موجزن ہے تیری خدمت کا خیال

تو نے آتے ہی بہارِ زندگانی لوٹ لی | میری طفلی چھین لی، میری جوانی لوٹ لی

اپنی ہستی کا خیال اور پاس اب باقی نہیں! میں بھی کچھ ہوں، تھا جو اک احساس اب باقی نہیں
عہد پیری آچلا فصلِ جوانی ختم ہے!! میرے رومانوں کی رنگیں داستانی ختم ہے!!

نوید

سیاہئ شبِ غم، منہ چھپانے والی ہے
بہارِ صبحِ طرب، لہلہانے والی ہے
نسیم، مژدۂ راحت سنانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

غم و الم کے سمندر، سمٹنے والے ہیں!!
ہراس و یاس کے طوفان مٹنے والے ہیں
سحر امید کی جلوہ دکھانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

نسیم جھوم کے مستانہ وار آتی ہے
خبر ہے، باغ میں فصلِ بہار آتی ہے
شگفتگی سی فضا میں سمانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

نظامِ عہد کہن ٹوٹ جائے گا اک دن

نیا زمانہ بہاریں دکھائے گا اک دن
سعادتوں کی بشارت پھر آنے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

زمانہ گو ہے دلآزار، دل فگار نہ ہو!
سکوں سے کام لے، غمگین و بیقرار نہ ہو
بہار، غنچۂ خاطر کھلانے والی ہے!
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

ہجومِ غم سے عبث زار زار رونا ہے
خوشی بھی ہوتی ہے دنیا میں غم بھی ہونا ہے
ٹھہر، کہ شمعِ طرب جگمگانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

چمن میں آتی ہے صبحِ بہار، جام لئے
شراب شعلہ رُخ و حُسن لالہ فام لئے
گھٹا سرُور کی عالم پہ چھانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

بنے گا میکدۂ عیش، الم کدہ دل کا!
نوائے شوق سے گونجے گا غم کدہ دل کا!
نسیمِ نغمۂ اُمید گانے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

غموں کا زہر اگر وقت لے کر آتا ہے
خوشی کا بادۂ گلکار بھی پلاتا ہے
فضا کو حورِ طرب پھر ہنسانے والی ہے!
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

اگرچہ راہ کٹھن ہے قدم بڑھائے چل
خدا کے آسرے سے آس تو لگائے چل
نہ ہار حوصلہ منزل بھی آنے والی ہے
نہ رو نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

آثارِ سحر!

آثارِ سحر ہوئے نمایاں
انوارِ سحر ہوئے نمایاں

بڑھنے لگی روشنی سحر کی
کملانے لگی ضیا قمر کی
مہتاب کا نور گھٹ رہا ہے
پردہ سا فضا سے ہٹ رہا ہے
آثارِ سحر نکھر رہے ہیں
دھندلے سائے ابھر رہے ہیں
گلشن میں نسیم چل رہی ہے
ہر سو خوشبو ابل رہی ہے
مشرق میں عروسِ نور جاگی
آہنگ و ضیا رکی خور جاگی
آفاق کا رنگ مرمریں ہے
ملبوس افق کا گوہریں ہے

بینائے افق میں نور بھر کر لایا کوئی ساقیٔ فسوں گر!
مشرق کا افق جھلک رہا ہے جامِ سیمیں چھلک رہا ہے
رنگت پھر آسماں کی چمکی قسمت سارے جہاں کی چمکی
جاگ اُٹھے ہیں طائرانِ گلشن آباد ہوا جہانِ گلشن!
شاخوں نے ستار اپنا چھیڑا جھینگر نے ملہار اپنا چھیڑا
پھولوں کو صبا نے گدگدایا

کرنوں کا گیت

ہم بستے ہیں تاروں میں جنت کی بہاروں میں
شاداب ستاروں میں شفاف نظاروں میں
ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم حوریں ہیں تاروں کی پریاں ہیں نظاروں کی
کرنیں ہیں ستاروں کی رہتے ہیں ستاروں کی
ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم نقشِ جوانی ہیں موجوں کی روانی ہیں
رقصندہ کہانی ہیں دریا کے کناروں میں
ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم کھیلتے ہیں بن میں کہسار کے دامن میں

ہم کھلتے ہیں گلشن میں ہنستے ہیں بہاروں میں
ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم بن کے ضیا برسیں ہمراہِ صبا برسیں!
با ناز و ادا برسیں دنیا کے نظاروں میں
ہم بستے ہیں تاروں میں

ہم نُور کے پارے ہیں سب کھیل ہمارے ہیں
روشن جو نظارے ہیں تاریک دیاروں میں
ہم بستے ہیں تاروں میں

گل ہیں کہ خیاباں ہیں ہم سے ہی درخشاں ہیں
ہم بزم چراغاں ہیں باغوں میں بہاروں میں
ہم بستے ہیں تاروں میں

ایک عزیزہ کی شادی پر

نویدِ رحمتِ پروردگار بن کے رہو! برنگِ سایۂ نخلِ چنار بن کے رہو!
تم اپنے گھر کے چمن میں بہار بن کے رہو

بہشتِ نو کی فضائیں تمہیں مبارک ہوں! مسرتوں کی گھٹائیں تمہیں مبارک ہوں!
نسیم گل کی طرح مشکبار بن کے رہو

زمانے بھر کی خوشی ہو تمہاری قسمت میں ہمیشہ عمر گزارو سوادِ راحت میں!

تبسمِ چمنِ روزگار بن کے رہو!
مثالِ شمع، تم اس تازہ انجمن میں رہو
برنگِ غنچہ و گل شاد اس چمن میں رہو
تمہارا گھر ہو چمن، تم بہار بن کے رہو!
نئے عزیز ہوں مسرور و شادماں تم سے
نظر فروز بنے بزمِ خانداں تم سے
فروغِ دیدۂ لیل و نہار بن کے رہو!
ستانے پائیں نہ انکار اس جہاں کے تمہیں
کریں ملول نہ آزار آسماں کے تمہیں
نزیلِ سایۂ پروردگار بن کے رہو!
سرورِ دیدۂ ملت کہے تمہیں دنیا
غرورِ عصمت و عفت کہے تمہیں دنیا
جہاں میں عصمت و عفت مدار بن کے رہو!
سعادتیں ہوں میسّر جہانِ نو میں تمہیں
نصیب برکتیں ہوں گلستانِ نو میں تمہیں
برنگِ دامنِ ابرِ بہار بن کے رہو!
تمہاری خوبیٔ قسمت کی انتہا ہو نہ کچھ
عروج و عظمت و دولت کی انتہا ہو نہ کچھ
حریفِ سطحِ یمِ بے کنار بن کے رہو!
بہارِ چشم زمانہ بنو زمانے میں
مسرّتوں کا خزانہ بنو زمانے میں
طراوتِ گہرِ آبدار بن کے رہو!
مثالِ طالعِ پروین رہو جہاں بھی رہو!
برنگِ غنچۂ نسریں رہو، جہاں بھی رہو!
حریفِ خندۂ فصلِ بہار بن کے رہو!
دعا ہے سب کی کہ آزاد و بامراد رہو
دلوں کو شاد رکھو، خود ہمیشہ شاد رہو!
قرارِ جان و دلِ بے قرار بن کے رہو!

رخصتِ دائمی

قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے
بہار لے گئے، یادِ بہار چھوڑ گئے

ہماری چشمِ حزیں کا خیال کچھ نہ کیا
وہ عمر بھر کے لئے اشکبار چھوڑ گئے

جسے سمجھتے تھے اپنا وہ اتنی مدّت سے
اسی کو آج وہ بیگانہ وار چھوڑ گئے

رگوں میں اک تپشِ دردکار جاگ اٹھی
دلوں میں اک خلشِ انتظار چھوڑ گئے

ہوائے شام سے آنے لگی صدائے فغاں
فضائے شوق کو ماتم گُسار چھوڑ گئے

نشاطِ محفلِ لیل و نہار لوٹ لیا
نصیب میں غمِ لیل و نہار چھوڑ گئے

گھٹائیں چھائی ہیں ساون ہے مینہ برستا ہے
وہ کس سمے ہیں ہمیں اشکبار چھوڑ گئے

دلِ حزیں ہے اب اور عہدِ رفتہ کا ماتم
چمن کے سینے پہ داغِ بہار چھوڑ گئے

چھڑا کے دامنِ امیّد دل کے ہاتھوں سے
سوادِ یاس میں ماتم گسار چھوڑ گئے

نہ آیا رحم، مرے آنسوؤں کی منّت پر
کیا قبول نہ پھولوں کا ہار چھوڑ گئے

تمام عمر ہے اب اور فراق کی راتیں
یہ نقشِ گیسوئے مشکیں بہار چھوڑ گئے

امید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل
امید و شوق کہاں اک مزار چھوڑ گئے

ترس رہے ہیں مسرت کو عشق کے ارماں
ہمیں ستم زدہ و سوگوار چھوڑ گئے

امیدِ خستہ، سکوں مضطرب، خوشی بسمل
جہانِ شوق کو آشفتہ کار چھوڑ گئے

نگاہِ درد کی عرضِ حزیں قبول نہ کی
ہمیں وہ غمزدہ و دل فگار چھوڑ گئے

کسے خبر ہے کہ اب پھر کبھی ملیں نہ ملیں
نظر میں اک ابدی انتظار چھوڑ گئے

ہماری یاد بھلا کر وہ چل دئیے اختر
اور اپنی یاد، فقط یادگار چھوڑ گئے

آئینے!

ہنس رہا ہوں، لبِ مجبور پہ فریاد نہیں
کوئی کیا جانے کہ خوں گشتہ ہے دل شاد نہیں

میں نے سمجھا تھا کہ ہے عہدِ وفا عہدِ وفا
سچ کہا تم نے کہ مجبور تو آزاد نہیں

کیا کہوں کس لئے رہ رہ کے تڑپ اٹھتا ہوں
دل میں اک تیر ہے پیوست، تری یاد نہیں

کیا مرے خواب میں آنے کا بھی قدغن ہی تمہیں
قید ہے جسم تو کیا روح بھی آزاد نہیں

یاد ہے وہ شبِ مہتاب میں آہنگِ رباب؟
اور وہ نکہتِ صحرا کہ چمن زاد نہیں؟

یاد ہے عکسِ شفق سے وہ دلِ دریا میں
منظرِ حسن کہ منت کشِ بہزاد نہیں

یاد ہے چھاؤں میں تاروں کی وہ سیرِ کہسار؟
اور وہ شکوۂ قدرت کہ "ہم آزاد نہیں"؟

کیا کروں آہ بھلایا نہیں جاتا مجھ سے
وہی پیمانِ محبت جو تمہیں یاد نہیں؟

بنتے بنتے تری تصویر بگڑ جاتی ہے
یاس میں آہ تصور بھی تو آزاد نہیں

چاندنی۔ موسمِ گل، صحنِ چمن، خلوتِ ناز
خواب دیکھا تھا کہ کچھ یاد ہے کچھ یاد نہیں

صبحِ دل آرا سے

کہنے لگی یوں صبح، مری صبح دلآرا
ہے سرد ہوا مست فضا، شوخ نظارہ

ہنستا ہے تمہیں دیکھ کے کیوں صبح کا تارا؟
میں نے یہ کہا آج ہے ہنگام خوشی کا
ہر موجِ صبا لاتی ہے پیغام خوشی کا
اِک دعوتِ بہجت ہے ہر اک مست نظارہ
کہنے لگی، ہو شاعرِ مدہوش وجواں تم
سر مستیٔ عشرت سے ہو رسوائے زماں تم
دنیا میں فقط عیش ہے مقصود تمہارا
کی عرض کہ بیشک ہوں میں اک شاعرِ بیخود
خوابوں کا پرستار ہوں اور ساحرِ بیخود
تقدیر کا دامن ہے مگر میرا سہارا
اے جانِ جہاں آج تو ہے زینت پہلو
شادابی آغوش ہے اور جنّتِ پہلو
ہنستا ہے مجھے دیکھ کے یوں صبح کا تارا

جامِ مئے گلنار پلادے

جامِ مئے گلنار پلادے ساغر نور و نار پلادے
خمکدۂ سرشار پلادے پھول پلادے خلد پلادے

دل میں چھپائیں چاہ کہاں تک ۔۔۔ لب پر ہر دم آہ کہاں تک
عشق میں ہوں گمراہ کہاں تک ۔۔۔ راہ بتا دے، راہ بتا دے!

نکہتِ زلفِ حور ہو جس میں ۔۔۔ خوابِ نگاہِ طور ہو جس میں
آگ ہو جس میں نور ہو جس میں ۔۔۔ ساقی ایسا نور پلا دے

کھیل رہی ہوں جس میں بہاریں ۔۔۔ دیکھ کے جس کو سب من ہاریں
ایسی پری شیشے میں اتاریں ۔۔۔ سب کو کھلا دے، سب کو کھلا دے

ساقیہ! اٹھ اک جام پلا دے ۔۔۔ بادۂ لالہ فام پلا دے
نورِ نگاہِ شام پلا دے ۔۔۔ اک پیاسے کی پیاس بجھا دے

ساغرِ رنگیں ناب پلا دے ۔۔۔ جانِ شبِ مہتاب پلا دے
روحِ گلِ شاداب پلا دے ۔۔۔ مست بنا دے، مست بنا دے

عید کا چاند دیکھ کر

افق پہ مسجد کے پاس ہے چاند عید کا محوِ جلوہ باری
کہ بحرِ نیلی پہ تیرتی پھر رہی ہے زرین اک عماری
شفق کی سرخی ہے مست و مدہوش ہو رہی ہیں فضائیں ساری

زمین کا ایک ایک ذرّہ ہے محوِ شانِ جمالِ باری
جہانِ ہستی کا چپّہ چپّہ فضائے دامانِ رنگ و بُو ہے
زمیں سے تا چرخ آج ہر سمت سازو سامانِ رنگ و بُو ہے

خوشی کے جلوے ہیں منتشر چار سو طرب زارِ گلستاں ہیں
جہاں تہاں موج ہائے خوشبوئے لالہ و گُل رَواں دواں ہیں
گھنیری شاخوں پہ جس طرف دیکھو بلبلیں مست و نغمہ خواں ہیں
حسین کلیاں خوشی سے پھولی نہیں سماتی ہیں شادماں ہیں
چمن کا ایک ایک غنچہ و گُل بہار کے گیت گا رہا ہے
ہلال ہے محوِ جلوہ کاری ۔ زمانہ خوشیاں منا رہا ہے

ہلال کو جلوہ گر جو دیکھا تو اک حسینہ نے دلبری سے
فلک کی رنگینیوں کی جانب اٹھائے ہیں ہاتھ خوشدلی سے
نگاہِ خاموش، فتنے لاکھوں برستے ہیں جن کی خامشی سے
وہ اس کا چہرہ کہ پھول کوئی کھلا ہے تاروں کی روشنی سے
زبان خاموش عالمِ سرخوشی میں مدہوش و نغمہ زا ہے
حضورِ خالق میں اس کی خاموشی اس طرح مائلِ دُعا ہے

الٰہی تیرا ہزار شکر آج پھر خوشی کا زمانہ آیا
ہلالِ عیدِ اک برس کے بعد آج تو نے پھر آنکھ کو دکھایا
ہر ایک ذرّے پہ ہو رہا ہے محیط تیرے کرم کا سایہ
خوشی سے ہے محوِ حمد دنیا میں آج ہر اپنا اور پرایا

زمانے بھر کو خوشی مبارک یہ دورۂ فرخی مبارک
جو دل شکستہ ہیں غم سے اُن کو یہ عالمِ خوشدلی مبارک
ہر ایک کو قیدِ رنج و دردِ و الم سے آزاد کر الٰہی!
غریب ناشاد ہستیوں کو کرم سے پھر شاد کر الٰہی!
ستمگروں کی ستمگری کو خراب و برباد کر الٰہی!
جہاں کے اجڑے ہوئے دلوں کے گھروں کو آباد کر الٰہی!
دلوں کی بستی میں ہو فروزاں خوشی کی یہ روشنی ہمیشہ
جہاں کے ایک ایک ذرے کے لب پہ ہو، الٰہی خوشی ہمیشہ

مکالمہ

لیلےٰ —— جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں
مجنوں —— کیا کریں جاتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں
لیلےٰ —— عشق کے صدمے اٹھائیں کب تک؟
مجنوں —— گیت امید کے گائیں کب تک؟
دونوں مل کر۔ آہ تقدیر، یہ کیا رنگ دکھایا ہے ہمیں
جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں
کیا کریں جاتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں
لیلےٰ —— کشتیِ ماہ دلادے کوئی

مجنوں — جنتِ عشق دکھادے کوئی
دونوں مل کر — عشق کی مست ہواؤں نے لبھایا ہے ہمیں
جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں
کیا کریں جاتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں

لیلےٰ — روحیں بستی ہیں جہاں وہ دنیا
مجنوں — خوشیاں بستی ہیں جہاں وہ دنیا
دونوں مل کر — ایسی دنیا کے نظاروں نے رجھایا ہے ہمیں
جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں
کیا کریں جاتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں

لیلےٰ — اے زمانے تجھے ہم چھوڑ چلے
مجنوں — تجھ سے جو آس لگی وہ توڑ چلے
دونوں مل کر — رات دن تو نے محبت میں جلایا ہے ہمیں
جگمگاتے ہوئے تاروں نے بلایا ہے ہمیں
کیا کریں جاتے ہیں دنیا نے ستایا ہے ہمیں

چرواہے کی بنسی

شفق کی چھاؤں میں چرواہا جب بنسی بجاتا ہے
تصور میں مرے، ماضی کے نقشے کھینچ لاتا ہے

نظر میں ایک بھولا بسرا عالم لہلہاتا ہے

وہ بے پروائی جس سے ایک دن آباد تھا بچپن
وہ بے فکری کی باتیں، جن سے اک دن شاد تھا بچپن
وہی نظارہ اس کے زمزموں میں مسکراتا ہے

مرے افکار طفلی کو ہے نسبت اس کے نغموں سے
میں بچپن میں کیا کرتا تھا اُلفت اس کے نغموں سے
جبھی بنسی کی لے میں عہدِ طفلی جھلملاتا ہے

وہ کھیتوں کی قطاریں اور وہ نظّارہ باغوں کا
وہ دریا کا کنارہ اور وہ گہوارہ باغوں کا
رسیلی بانسری کے ہمہموں میں جھلملاتا ہے

نظر میں جھومتا ہے بن کے رنگیں خواب کا عالم
وہ صحرا کے نظارے اور وہ مہتاب کا عالم
وہی افسانہ اس بنسی کے لب پر گنگناتا ہے

گیا بچپن مٹا وہ سن جوانی بننے آئی

سحر ہونے کو ہے، رنگین کہانی بیتنے آئی
یہ چہرہ وا ہا مجھے کیوں یاد پھر اُن کی دلاتا ہے

انقلاب

آگیا وقت کہ دنیا کی حقیقت بدلے! آسماں بدلے، زمیں بدلے، یہ فطرت بدلے!
مغربی قوموں کی بڑھتی ہوئی تہذیب رُکے مشرقی قوموں کی بگڑی ہوئی قسمت بدلے
عہدِ حاضر کا بشر کم نہیں حیوانوں سے یہ بشر بدلے، یہ رنگِ بشریت بدلے
رنگ اور خون کی تمیز زمانے سے مٹے نسل اور ذات کی تفریق کی حالت بدلے

بندگی پر بھی خدائی کے ہیں دعوے کب سے
اب تو یارب ترے بندوں کی طبیعت بدلے

بڑھ دو...

جو ہیں بد اصل اُن کو راس کب آتی ہے آزادی
غبارِ راہ کو بے راہ کر جاتی ہے آزادی
فضائے عالمِ امکاں میں شورِ حشر برپا ہے
غریبوں کی فغاں بن بن کے چلاتی ہے آزادی
غلامانِ ازل کی فطرتوں کا پاس ہے کتنا

غلامی کو لئے ہمراہ مرجاتی ہے آزادی
لہو اُن کا لہو ہے جن کی غیرت ہو شرافت ہو
مگر مشرق میں جھوٹی سرخیاں پاتی ہے آزادی
لہو رونے کی عادت ہے جنھیں آزاد کیا ہوں گے
لہو بن کر براہِ چشم بہہ جاتی ہے آزادی
وناہیت ہوتی ہے بیدار پست اقوام میں جس دم
ہوا و حرص کے پردوں میں سو جاتی ہے آزادی
جو شرمانی نہیں اپنی کمینہ طرز و خصلت سے
بجا ہے ایسی قوموں سے جو شرمانی ہے آزادی
فنا ہوتا ہے وہ گمراہ ہو کر بحرِ جوشاں میں
حبابِ بے نوا کو جب پسند آتی ہے آزادی
ہزبرانِ نبرد آرا کی قسمت میں یہ عظمت ہے
جو ہیں روباہ فطرت اُن کو کب بھاتی ہے آزادی
جہاں ذاتی ہوس صدیوں سے اک شغلِ غلامی ہو
وہاں اک داغ رہ جاتا ہے کھو جاتی ہے آزادی
تڑپ ہوتی ہے ذاتی نفع کی ہر ایک کے دل میں
بظاہر سب کے دل کو گرچہ تڑپاتی ہے آزادی

دعوتِ جہاں

مسندِ عیش سے اُٹھ، منزلِ پرخار میں آ! | بزمِ جم چھوڑ کے، بزمِ رسن و دار میں آ!
عشرت کوہ کنی سے نہیں واقفِ پرویز | کہہ دو یہ لطف اگر چاہے تو کہسار میں آ!
نذر کر مشہدِ کشمیر پہ اشکِ خونیں | دلِ غمدیدہ اس اُجڑے ہوئے گلزار میں آ!

تا بکے بندگیٔ ساغر و مینا اختر
اب تو اللہ کے بندے صفِ احرار میں آ

کبھی کچھ کبھی کچھ

کبھی سوچتا ہوں کہ تلوار اٹھاؤں | سپاہی بنوں اور میداں میں پہنچوں!
اور اعدائے انساں کو نیچا دکھاؤں | میں شبروں کی صورت بیاباں میں پہنچوں

کبھی سوچتا ہوں کہ شاعر بنوں میں | تڑپ اُٹھے دنیا، وہ اشعار لکھوں
قلم کی خدائی کا ساحر بنوں میں | ہو شرمندہ فطرت وہ اسرار لکھوں

کبھی سوچتا ہوں کہ بن کر مصوّر | بناؤں وہ تصویر خونِ جگر سے
کہ آجائے پردے سے چھن کر مصوّر | زمانے کو حیرت ہو جس کے اثر سے

کبھی سوچتا ہوں نوا گر بنوں میں
فضا کو نواؤں سے معمور کر دوں

جہانِ غنا کا پیمبر بنوں میں
خدائی کو نغموں سے مسحور کر دوں

کبھی سوچتا ہوں کہ سب کچھ بنوں میں
نہ تھا پہلے کچھ لیکن اب کچھ بنوں میں

دلیرانِ وطن کے نام

سر کٹا کر سروسامانِ وطن ہونا ہے
نوجوانو! ہمیں قربانِ وطن ہونا ہے

رگِ ہر غنچہ ہو سیراب ہمارے خوں سے
یوں فدائے گل و ریحانِ وطن ہونا ہے

صفِ اعدا کو گماں ہو کوئی طوفاں آیا
یوں صف آرا سر میدانِ وطن ہونا ہے

ان گلوں پر ہو نہ کیوں خلد کو بھی رشک جنھیں
زینتِ گورِ شہیدانِ وطن ہونا ہے

اللہ اللہ رے اُس تیغ کی قسمت جس کو
رونقِ دستِ دلیرانِ وطن ہونا ہے

موت بھی رُو رہی گی خوں اُن کی بری حالت پر
جن کو مغلوبِ دلیرانِ وطن ہونا ہے

جان دینے کے لئے کیوں نہ ہوں تیار اختر
اِک نہ اِک دن ہمیں گر جانِ وطن ہونا ہے

سال نو پر!

ایک غریب الوطن سپاہی کا پیغام

میدانِ جنگ سے

سالِ نو آیا ہے اور ہم اپنے گھر سے دُور ہیں
پھر بھی اس دُوری کا ہم کو غم نہیں، مسرور ہیں!
گھر کی خدمت ہی کی خاطر، گھر سے چل کر آئے ہیں
پاسبانیٔ وطن کا جذبہ دل میں لائے ہیں
آج کے دن دُور ہیں گھر سے تو پھر کیا فکر ہے؟
گھر کو غیروں سے بچائیں ہم کو اس کا فکر ہے!
زندگی باقی ہے تو دیکھیں گے اکثر سالِ نو!
ملک کی تقدیرِ نو، اور قوم کا اقبالِ نو!
آج تو انساں کو دشمن سے بچانا ہے ہمیں
لشکرِ دشمن کو میداں سے بھگانا ہے ہمیں!
بے ضرورت بحثوں سے ہم کو کچھ مطلب نہیں!
سالِ نو کی عشرتوں سے ہم کو کچھ مطلب نہیں!
سالِ نو پر اپنے گھر کو یاد کرنے سے غرض
ہم سپاہی ہیں، ہمیں لڑنے سے، مرنے سے غرض
حُسنِ نوروزی عیاں ہے تیغِ جوہر دار سے
سالِ نو کے نغمے ہم سنتے ہیں ہر جھنکار سے!
اپنا پرچم جب عدو کے ملک میں لہرائے گا!
اے وطن والو! ہمارا سالِ نو تب آئیگا!

نعم البدل!

جنگ کا میداں ہیں صحنِ چمن سے کم نہیں!
بوئے خوں، خوشبوئے نسرین وسمن سے کم نہیں!
کیوں نہ چومیں ہم لبِ شمشیرِ جوہر دار کو؟
اس کی لذّت نازنینوں کے دہن سے کم نہیں!
جذبۂ حُبّ وطن سے خار بھی گُل ہو گئے
دشتِ غربت، ہم کو گلزارِ وطن سے کم نہیں
آگ اور بارُود کی گلکاریاں، میدان میں
ہم کو سیرِ گلفشانیٔ چمن سے کم نہیں!
شعلوں کی بارش جگاتی ہے ہمارے ولولے
سیلِ آتش، موجِ راوی و چمن سے کم نہیں
بم کی آوازوں سے بڑھتا ہے ہمارا حوصلہ
یہ صدائیں نغمۂ باغِ عدن سے کم نہیں!
کیوں نہ سینے سے لگائیں تیغ خوں آلود کو
یہ کسی رنگیں عذارِ سیمتن سے کم نہیں!

جھونپڑی کا دِیا

اک دیا دُور سے ہنستا سا نظر آتا ہے
ننھے تارے کی طرح کرنیں سی برساتا ہے

گرچہ بجلی نہیں، شعلہ نہیں، مہتاب نہیں — پھر بھی رہگیر کو یہ راستہ بتلاتا ہے
ٹوٹ کر رہ گئی اک شاخ پہ تارے کی کرن — یا کوئی جگنو، چمک دُور سے دکھلاتا ہے
دامنِ یاس میں ہو جیسے شعاعِ اُمید — یوں ہواؤں کے تھپیڑوں سے یہ تھرّاتا ہے
جیسے ارمان کی ننّھی سی کرن ہو دل میں — یوں کسی جھونپڑی میں رنگ یہ دکھلاتا ہے
اخترِ صبح کی رقصندہ ضیا کی صورت — پہلوئے شب میں مچلتا سا نظر آتا ہے
کسی بڑھیا کے سیہ خانے کی رونق بن کر — اثرِ تیرگیٔ بخت کو بہلاتا ہے
رات کی تیرہ فضاؤں کی نظر بن بن کر — اک پُراسرار جھلک دشت کو دکھلاتا ہے

وطن کے شہیدانِ جنگ

اور

مَوسَمِ بَہارُ

پیارے وطن کی آنکھ کے تارے کدھر گئے؟ — بادِ خزاں! وہ پھول ہمارے کدھر گئے؟
حسرت سے ڈھونڈھتی ہے جنھیں آج فصلِ گُل — وہ طالعِ وطن کے ستارے کدھر گئے؟
بہرِ وطن جو کھیلتے تھے اپنی جان پر — جانبازی کے وہ زندہ نظارے کدھر گئے؟
جن کے دلوں میں عشقِ وطن تھا شرارہ ریز — ہاں وہ وطن کے عشق کے مارے کدھر گئے؟
تھی جن کی ضو سے اپنی یہ دنیا حریفِ طُور — وہ شمعِ زندگی کے شرارے کدھر گئے؟
کہہ دو کہ بہرِ فاتحہ آئی ہے نو بہار! — اور تازہ پھول قبر پہ لائی ہے نو بہار!

عشق و آزادی و شعر

بند ہے راہ مچلتی ہوئی تلواروں سے!
کہہ دو آزادیٔ کامل کے طلبگاروں سے!

دُور ہے دُور ابھی منزلِ مقصود اپنی
اور گذرنا ہے بیابانوں میں کہساروں سے!

ایک آزاد نفس، عمرِ قفس سے بہتر
یہ صدا آتی ہے ہیسور کے کہساروں سے!

خودکشی کی بھی اجازت نہیں اب تو ہم کو
کھیلتے تھے کبھی ہم غیر کی تلواروں سے!

گلشنِ دہر میں گلچینی کا ارماں ہے اگر
دست و دامن کو بچائے نہ رکھو خاروں سے!

مشرقی قوموں کی قدرت نے اگر کی امداد
ایک دن سمجھیں گی، یورپ کے سیہ کاروں سے!

مے و افیوں سے لیا کام جو کچھ قوموں نے
نہ لیا سیفر و چنگیز نے ہتھیاروں سے!

باغباں ہم کو ملا بھی تو بہ شکلِ رہزن
پھول کیا پتے بھی غائب ہیں چمن زاروں سے!

دیوِ افلاس کا نعرہ ہے فضا میں لرزاں
کہ عوض بھوک کا لو، دہر کے خونخواروں سے!

ایک بیٹے کی بھی لحد پہ یہ لکھا تھا عذرا
کہ "خدا" کو ہے "محبت" تو ہے زرداروں سے!

ہم صفیروں ہی کو بلوا دے قفس تک صیاد
ایسی ہی ضد ہے اگر تجھ کو گرفتاروں سے!

عشق و آزادی و شعر اپنا ہے پیشہ اختر
ہم کو سرکاروں سے مطلب ہے نہ درباروں سے!

کسان

رگ رگ میں جوشِ محنت و ذوقِ عمل لئے
کھیتوں سے آ رہا ہے کسان اپنا ہل لئے

تن پہ قبائے گرد، گُل افشاں کئے ہوئے
محنت کا غازہ رُخ پہ فروزاں کئے ہوئے
دنیائے ہست و بود پہ احسان اس کا ہے
خدمت کرے زمانے کی، ایمان اس کا ہے
رقصاں ہے کائنات کی رگ رگ میں اس کا خوں
لرزاں ہے شش جہات کی رگ رگ میں اس کا خوں!
گو محنت اور فکر سے فرصت نہیں اسے
قسمت سے پھر بھی کوئی شکایت نہیں اسے
آنکھوں میں اِک فسانۂ خنداں ہے جلوہ گر
ہونٹوں پہ نغمۂ طرب افشاں ہے جلوہ گر
گھر کی طرف رواں ہے کچھ اس رنگ ڈھنگ سے
جیسے سپاہی آتا ہو میدانِ جنگ سے

کسان کا مستقبل

نونہالِ آرزو پھر بارور ہونے کو ہے
قسمتِ دہقاں، مگر تابندہ تر ہونے کو ہے
ظلمت آبادِ تنزل، ہو گا روشن نور سے
حسنِ لیلائے ترقی جلوہ گر ہونے کو ہے
پنجۂ افلاس سے آزادیاں ہوں گی نصیب
پھر رہا قیدِ صدف سے یہ گہر ہونے کو ہے
جس کا خرمن ایک دن تھا صیدِ صد برقِ شرر
اب وہی صیادِ صد برقِ شرر ہونے کو ہے

جن بیابانوں پہ رہتی تھی خزاں چھائی ہوئی
اب انہی پر نو بہاروں کی نظر ہونے کو ہے

ہو رہا ہے دورِ بنئے اور بہی کا دور آج
اور ابھی رفتار اس کی تیز تر ہونے کو ہے

اب عدالت اور وکیلوں کے اٹھائیں گے نہ ناز
ملک میں پنچایتوں کا یہ اثر ہونے کو ہے

زندگیٔ تازہ آجانے کو ہے دیہات میں
چپہ چپہ ایک فردوسِ نظر ہونے کو ہے

کتنا احساں ہے تمدّن پر کسی دہقان کا
فیصلہ اس کا باندازِ دگر ہونے کو ہے

طوفان کی آمد

کسی کمزور کو جینے کا نہ ہوگا کوئی حق
اب تو کچھ ایسا ہی سامان ہوا چاہتا ہے

جو ممالک ہیں نہتّے، ہیں فنا کے قابل
اہلِ طاقت کا یہ ایمان ہوا چاہتا ہے

اس زمانے میں ہیں کم مایہ جو اقوام اُن کے
کفن و گور کا سامان ہوا چاہتا ہے

پھر برسنے کو ہیں افضائے زمیں پر فتنے
پھر بپا حشر کا طوفان ہوا چاہتا ہے

مطلعِ دہر پہ چھانے کو ہے پھر جنگ کا ابر
امن کا گلکدہ ویران ہوا چاہتا ہے

امیر و غریب

دنیا کا ہر آرام امیروں کے لئے ہے
پھر کونسی شے ہے جو فقیروں کے لئے ہے

بدبخت مریدوں پہ بھی یا رب نگہِ لطف
مانا کہ جو نعمت ہے وہ پیروں کے لئے ہے

اک سیٹھ نے گندم کی یہ تعریف نئی کی
کھانے کے لئے کب ہے ذخیروں کے لئے ہے

اب تیسرے درجے سے بھی محروم ہیں مفلس
اوّل ہے تو اوّل ہے امیروں کے لئے ہے
"اغیار" پہ کیوں ہوتے ہیں اب ان کے مظالم
یہ فخر تو صرف ان کے اسیروں کے لئے ہے
پٹرول تو کیا کروسن آئل نہیں ملتا
موٹر تو بڑی شے ہے وزیروں کے لئے ہے
اب نقل مضامین جو کمال ازلی ہے"
قیمت شدہ" اُردو کے مدیروں کے لئے ہے
غیرت جسے کہتے ہیں وہ مفلس کا ہے حصّہ
امیروں کے لئے ہے نہ امیروں کے لئے ہے

لکھواتے ہیں وہ گالیاں اخبار میں ہم کو
اختر یہ سزا ہم سے شریروں کے لئے ہے

عیادت!

تندرستی کا گلہ کیوں ہے شکایت کیا ہے؟
میری بیمار، بتا تو تیری حالت کیا ہے؟
رو دیئے جب بھی سنی درد بھری کوئی خبر
زرد ہی درد ہے یارب کہ طبیعت کیا ہے!
عشق بیماری ہے اور کتنی حسیں بیماری
کیا خبر بے خبروں کو کہ یہ لذّت کیا ہے؟
اُن کی صحّت کی خبر آئے گی۔ جلد آئے گی
دلِ ناداں تجھے آخر کو یہ وحشت کیا ہے؟
ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یارب

آج احساس ہوا دل کو علالت کیا ہے؟
سامنے ہوں تو فدا کر دیں دل و جان اُن پر
ہم نہیں جانتے۔ اختر کو عیادت کیا ہے!

ایک مزدور کی زندگی!

سوزِ دل میرے لئے، زخمِ جگر میرے لئے
زندگی ہے میری اک رقصِ شرر میرے لئے
چرخ نے میری تباہی پہ بہائے آنسو
دیدۂ انجم و ناہید ہے تر میرے لئے
قسمتِ دولتِ وجداں ہے بہ اندازۂ ظرف
رنگ و بو تیرے لئے، سوز و شرر میرے لئے
زندگی گرچہ ہے مجبوریٔ فطرت کا ثبوت
پھر بھی ہیں دشت و جبال زیر و زبر میرے لئے
خوفِ محنت سے نہیں، ہمدم آرام پسند!
خون اندر خاک تو ہے شہد و شکر میرے لئے
پاس منظور رہے فطرت کو مری رفعت کا
ورنہ گردش میں ہیں کیوں شمس و قمر میرے لئے
بوالہوس! آ کہ باندازۂ ہمت خوش ہوں

برگ و گُل تیرے لیے، تیغ و تبر میرے لئے
تا ابد روئے گی اختر جیسے چشم دوراں
کی ہے مخصوص ازل نے وہ نظر میرے لئے

فروغِ سحر

بہار آئی ہے شاداب باغِ امکاں ہے
چمن کے رُخ سے فروغِ سحر نمایاں ہے
کلی کے سانہ پہ بلبل ترانہ افشاں ہے
بچھائی سبزۂ گلزار نے بساط نئی
سجائی پھولوں نے اک محفلِ نشاط نئی
جو ذرّہ ذرّہ ہے خوش، پتّہ پتّہ خنداں ہے
ہے دیدنی گل و نسرین و نسترن کی بہار
نظر فروز ہے ریحان و یاسمن کی بہار
نگاہِ نرگسِ شاداب جس سے حیراں ہے

پھر ہوا سے دعوتِ جوشِ جنوں آنے لگی!

پھر ہوا سے دعوتِ جوشِ جنوں آنے لگی پھر بہار آئی چمن سے بوئے خوں آنے لگی

پھر ہوئی کنجشک کو حملے کی جرأت باز پر
پھر صدائے خندۂ گردُونِ دوں آنی لگی

ہے نہتّے بے کسوں پر ہاتھ اُٹھانا کب رَوا
شرم، لیکن ظالموں کو شرم کیوں آنی لگی

پھر کوئی مظلوم تیرِ ظلم سے زخمی ہوا
پھر صدائے نالۂ صیدِ زبوں آنے لگی

اشکِ خونیں سے ہوئی لبریز چشمِ سرمگیں
دل سے آوازِ امیدِ سرنگوں آنے لگی

کیا گزری...

وہ پوچھتے ہیں سپہر بریں پہ کیسا گذری
جنھیں خبر نہیں اہلِ زمیں پہ کیا گذری

ہوا ہے خبط اُنھیں خارجی سیاست کا
جو بے خبر ہیں کہ اس سرزمین پہ کیا گذری

خزاں نے لوٹ کے برباد کر دیا گلچیں
خبر نہ لے کہ تری گُل زمیں پہ کیا گذری

تو ایسے سمے میں آ پیاری

گلشن کی فضائیں سب چپ ہیں!
بلبل کی نوائیں سب چپ ہیں

کوئل کی صدائیں سب چپ ہیں!
آ پریت کے گیت سُنا پیاری

تو ایسے سمے میں آ پیاری

ہے غم کی گھٹا گھر کر آئی
اور یاس نے چھاؤنی ہے چھائی

میں ہوں اور میری تنہائی
امید کی بزم سجا پیاری

تو ایسے سمے میں آ پیاری

تنہائی ہے خاموشی ہے فطرت عرقِ مدہوشی ہے
اک عالم سکر فروشی ہے بیہوش کو ہوش میں لا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

کلیوں پر تتلی آتی ہے! اور پریت کے گیت سناتی ہے
بھولے ہوئے رنگ دکھاتی ہے بھولے ہوئے رنگ دکھاتی ہے
تو ایسے سمے میں آ پیاری

گھنگور گھٹائیں چھائی ہیں سرمست ہوائیں آئی ہیں
جو تیرا سندیسہ لائی ہیں! آ بدلی بن کر چھا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

دنیا ساری خوابیدہ ہے اور فطرت آرامیدہ ہے
بیدار نظر رنجیدہ ہے اک سپنا بن کر چھا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

ہم عشق کے مارے بیٹھے ہیں دریا کے کنارے بیٹھے ہیں
بس تیرے سہارے بیٹھے ہیں آ ایک جھلک دکھلا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

دامن پر آنکھوں کا نم ہے سینے میں شورِ ماتم ہے
اخترؔ ہے اور حشرِ غم ہے تو اور اک حشر اٹھا پیاری
تو ایسے سمے میں آ پیاری

غزلیات

(۱)

آکہ پھر بزمِ تمنا میں چراغاں کر دیں جذبۂ شوق سے ہر گُل کو گلستاں کر دیں
صحنِ میخانہ کو پھولوں سے بسا دیں ساقی اس ادا سے کہ چمن زار کو حیراں کر دیں
ایک مدت سے ہے خاموش محبت کی فضا نغمۂ عشق سے آباد نیستاں کر دیں

(۲)

ہے نشاطِ لالہ و گل میں کیا؟ ہے بہارِ سرو سمن میں کیا؟
مجھے کب دماغ ہے سیر کا، میں کروں گا جاکے چمن میں کیا؟
مرا واسطہ ہے خطا سے کیا؟ مرا کام بادِ ختن سے کیا؟
وہ شمیم روح فزا نہیں ترے گیسوؤں کی شکن میں کیا؟
ہمہ فتنہ وہمہ فتنہ گر، ہمہ تیرہ دل، ہمہ خیرہ سر
ہے یہ حالِ اہلِ وطن اگر، تو کریں گے جاکے وطن میں کیا
وہ سوادِ رنگ و نظر نہیں، وہ فضائے شام و سحر نہیں
وہ بہارِ باغ و شجر نہیں تو ہے لطفِ سیرِ چمن میں کیا؟

(۳)

کسی کی جفا بن گئی ہے جوانی الٰہی یہ کیا بن گئی ہے جوانی
حسینانِ عالم نے جس دن سے دیکھا تو اک ماسوا بن گئی ہے جوانی

جوانی ہیں لیں اس قدر بددعائیں   کہ اک بددعا بن گئی ہے جوانی
نگاہوں نے کچھ ایسا پیغام بھیجا   کہ پیکِ صبا بن گئی ہے جوانی

نہیں پوچھتا کوئی اخترؔ خدا کو
یہ کیسا خدا بن گئی ہے جوانی

(۴)

یوں تو کس پھول سے رنگت نہ گئی بو نہ گئی؟
اے محبت! مرے پہلو سے مگر تو نہ گئی
مٹ چلے میری اُمیدوں کی طرح حرف مگر
آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی
فصلِ گل ختم ہوئی، رنگِ سمن خواب ہوا
میری آنکھوں سے مگر میری سمن رو نہ گئی
کب بہاروں پہ ترے رنگ کا سایہ نہ پڑا؟
کب ترے گیسوؤں کو بادِ سحر چھو نہ گئی
ترے گیسوئے معنبر کو کبھی چھیڑا تھا
میرے ہاتھوں سے ابھی تک تری خوشبو نہ گئی

(۵)

خوشبو اڑا کے لائی نہ زلفِ نگار سے   مجھ کو شکایتیں ہیں نسیمِ بہار سے
غمگین ہو نہ کوئی غمِ روزگار سے   اک دن بدل ہی دیں گے خزاں کو بہار سے
ملتی نجات اگر غمِ لیل و نہار سے   سنتے کبھی خزاں کی کہانی بہار سے

شبنم نہیں ہے خوفِ خزاں سے حسین پھول — رو رو کے مل رہے ہیں گلے نوبہار سے
اُٹھتے نہیں ہیں اب تو دعا کے لئے بھی ہاتھ — اس درجہ ناامید ہیں پروردگار سے
جس پھول کو خزاں کا ابھی تجربہ نہیں — کہہ دو یہ اس سے دل نہ لگانا بہار سے
اُس دل کو خاک کر کے زمانے نے رکھدیا — کھیلا کیا ہمیشہ جو برق و شرار سے
کیوں شکوہ سُن کے شوخ نگاہیں بدل گئیں؟ — کیوں رنگ اُڑ چلا ترے پھولوں کے ہار سے

اختؔر کبھی تو پہنچیں گے اپنی مراد کو
مایوس ہوں نہ رحمتِ پروردگار سے

(۶)

بھلاؤ گے بہت، لیکن نہیں ہم یاد آئیں گے
بہت یاد آئیں گے پھر بھی بہت کم یاد آئیں گے!
گھٹا چھا جائے گی دل پر غبارِ رنج و حسرت کی
ہمیں جب بھی ترے گیسوئے برہم یاد آئیں گے!
بُھلا بیٹھے ہو ہم کو آج لیکن یہ سمجھ لینا!
بہت پچھتاؤ گے جس وقت، کل ہم یاد آئیں گے!
بہت روئیں گے ہمدم، دشتِ غربت میں ہمیں جس دم!
کسی کے دیدۂ غمناک و پرنم یاد آئیں گے!
دلِ غمگیں ہے میرا اور یہ حسرت رات دن اختؔر
کہ اپنے بھولنے والے کو کب ہم یاد آئیں گے؟

(۷)

وہ دُور سے نقاب اٹھا کر چلے گئے
آنکھوں پہ بجلیاں سی گرا کر چلے گئے
دامن بچا کے، ہنس کے، لجا کر چلے گئے
کیا کیا، لحد پہ پھول چڑھا کر چلے گئے
سینے میں اک تپش سی بسا کر چلے گئے
کیسے مزے کی آگ لگا کر چلے گئے
شاداب ہو سکا نہ گلستانِ آرزو
کتنے ہی ابر، باغ پہ چھا کر چلے گئے
بادِ بہار، آگ لگا کر چلی گئی
ابرِ بہار ہم کو رلا کر چلے گئے
آنسو نہ تھم سکے مری چشمِ امید کے
کتنے ہی موسم آئے اور آ کر چلے گئے

اختؔر بُرا ہو بے خودیٔ جذب و شوق کا
کس کو خبر کب آئے کب آ کر چلے گئے

(۸)

میں اپنے شوق کی دھن میں دعا بھی بھول گیا
وہ پاس آئے تو نامِ خدا بھی بھول گیا
اب اس سے بڑھ کے بھی کچھ اور بے کسی ہوگی!
الٰہی، اب تو مرا دل دعا بھی بھول گیا
امید کیا ہو کسی سے وفا شعاری کی
وفا کہاں؟ کہ زمانہ جفا بھی بھول گیا
خبر لے کون، محبت کے دردمندوں کی
جہاں میں بھیج کے ہم کو خدا بھی بھول گیا

(۹)

دنیا میں ترے عشق کا چرچا نہ کریں گے
مرجائیں گے لیکن تجھے رسوا نہ کریں گے
قربان کریں گے کبھی دل، جاں کبھی صدقے
تم اپنا بنالوگی تو کیا کیا نہ کریں گے!
گستاخ نگاہوں سے اگر تم کو گلہ ہے
ہم دور سے بھی اب تمہیں دیکھا نہ کریں گے
الختصر یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں، یہ فضائیں،
توبہ کریں اس حال میں؟ توبہ نہ کریں گے

(۱۰)

اے دل وہ عاشقی کے فسانے کدھر گئے؟
وہ عمر کیا ہوئی، وہ زمانے کدھر گئے؟
ویران ہیں صحن و باغ بہاروں کو کیا ہوا؟
وہ بلبلیں کہاں وہ ترانے کدھر گئے؟
تھے وہ بھی کیا زمانے کہ رہتے تھے ساتھ ہم؟
وہ دن کہاں ہیں اب وہ زمانے کدھر گئے؟
ہے نجد میں سکوت، ہواؤں کو کیا ہوا!
لیلائیں ہیں خموش دوانے کدھر گئے؟
صحرا و کوہ سے نہیں اٹھتی صدائے درد

Gulzar Hameed
M.A.C.

وہ قیس وکوہ کن کے ٹھکانے کدھر گئے؟
وہ چاندنی چھلکتی ہوئی چشمہ سار میں
وہ راتیں اور سمے وہ سہانے کدھر گئے؟
اُجڑے پڑے ہیں دشت غزالوں پہ کیا بنی؟
سُونے ہیں کوہسار دوانے کدھر گئے!
وہ ہجر میں وصال کی اُمّید کیا ہوئی؟
وہ رنج میں خوشی کے بہانے کدھر گئے؟
غیروں سے تو امیدِ وفا پہلے ہی نہ تھی!
رونا یہ ہے کہ اپنے بگانے کدھر گئے؟
دن رات میکدے میں گذرتی تھی زندگی
اختؔر وہ بے خودی کے زمانے کدھر گئے؟

(۱۱)

جب سے دیکھا ہے ترا روئے بہار آلودہ
چشمِ مستی نظر آتی ہے خمار آلودہ
رنگ لایا ہے کسی بلبلِ دیوانہ کا خون
سرخیٔ گُل سے ہے دامانِ بہار آلودہ
یاس وحسرت کا سماں کیوں ہے فضا پر طاری؟
غم سے ہے کیوں چمنِ لیل ونہار آلودہ؟
روئے رنگیں پہ پریشاں ہیں سنہری زلفیں
جیسے ہو اک گلِ شاداب، غبار آلودہ
شمعِ امید کی کرنیں ہیں پریشاں اختؔر
دل کا آئینہ کچھ ایسا ہے غبار آلودہ

(۱۲)

در ازل، چوں شمع، جانِ بے قرارم دادہ اند
سینۂ پرسوز و چشمِ لالہ کارم دادہ اند
قسمتم کردند عشق و سوز ساز و درد و غم
دیں ہمہ آشوبِ ہا مستانہ دارم دادہ اند
زاہدا با من نمی سازو، طریقِ زہدِ تو!
در کفِ مستی عنانِ اختیارم دادہ اند!
گریہ ہائے بے خودی را منع بے تابی حرام!
با رگِ مژگاں، رگِ ابرِ بہارم دادہ اند
چوں نہ گریم ہمچو ابر و چوں نہ خندم ہمچو برق
با محبت، فطرتِ دیوانہ کارم دادہ اند!
کس نمی داند کہ راہِ منزلِ سلمیٰ کجاست؟
ایں قدر دانم کہ دردِ انتظارم دادہ اند
جز سرشکِ شوق و سوزِ جان و آہِ صبح نیست
آنچہ اختؔر در ازل بے اختیارم دادہ اند

(۱۳)

نہ فتنہ کار، زیبِ شبستاں ہے آج کل! — کیوں محوِ خواب، شورشِ دوراں ہے آج کل؟
ہے خوفِ محتسب بھی، خیالِ حساب بھی — لاہور گرچہ جنتِ رنداں ہے آج کل
دنیا نے گو جلا کے ہمیں خاک کر دیا — پھر بھی دماغِ عشق گلستاں ہے آج کل

پھر عقدۂ حیات و فنا زیرِ غور ہے ! پھر زیبِ دوش گیسوئے پیچاں ہے آج کل!

پھر ہنس رہی ہے ساری خدائی مرے لئے پھر سامنے وہ چہرۂ خنداں ہے آج کل!

پھر ابر چھا رہا ہے بہاریں لئے ہوئے پھر سامنے وہ زلفِ پریشاں ہے آج کل!

فصلِ بہار و روئے نگار و مئے کہن ! حاصل ہر ایک طرح کا ساماں ہے آج کل!

کہہ دو سحر سے ہم کو نہیں فرصتِ نظر معمورِ حسن و رنگ شبستاں ہے آج کل!

ایمان کو عزیز رکھیں ہم تو کس طرح پیشِ نظر وہ غارتِ ایماں ہے آج کل!

بھولا نہیں سبق ابھی دیرینہ عشق کا
اختؔر کو گرچہ شکوۂ دوراں ہے آج کل

(۱۴)

اے دل آ، اپنے دل آزار کو پھر یاد کریں!
بھولنے والے جفاکار کو پھر یاد کریں!
ایک اک پھول کو آنکھوں سے لگا کر روئیں
اس بہارِ گل و گلزار کو پھر یاد کریں
دیدۂ نرگسِ بیمار کو کر دیں پُر آب
ساغرِ دیدۂ سرشار کو پھر یاد کریں!
چاند کی کرنوں میں اشکوں کے پرو دیں موتی
اپنے اس آئینہ رخسار کو پھر یاد کریں!
چشمِ مینا سے اُبلنے لگیں اشکِ حسرت
اثرِ مستیٔ رفتار کو پھر یاد کریں!

(۱۵)

پھر وہی شہر، وہی کوئے بتاں سامنے ہے!
پھر وہی دیر، وہی بزمِ مغاں سامنے ہے!
پھر وہی مست بہاریں ہیں مری راتوں پر
پھر اسی طرح ،صفِ گلبدناں سامنے ہے!
پھر مری غمزدہ آنکھوں میں خوشی ہے رقصاں
پھر مرا گم شدہ رویائے جواں سامنے ہے!
پھر مرے لب پہ ہیں اشعارِ رواں حافظ کے
پھر کوئی نغمۂ شاداب و جواں سامنے ہے!
پھر فسوں کار ہے اک میکدۂ ابر بدوش
پھر کوئی دیدۂ افسانہ چکاں سامنے ہے!

(۱۶)

خدا کو نہ بھولے کہ دُنیا نہ بھُولے — ترے عشق میں آہ کیا کیا نہ بھُولے
صبا میری حُورِ قصوری سے کہنا — قصورِ آپ کا دل سے بھولا نہ بھُولے
تمہاری تمنّا میں عمریں گنوادیں — مگر ہم تمہاری تمنّا نہ بھُولے

(۱۷)

چمن بھی ہے، ابر بھی، ہوا بھی، شراب بھی، سبزہ زار بھی ہے!
الٰہی توبہ کی خیر آغوش میں وہ جانِ بہار بھی ہے!
یہ آنکھوں آنکھوں میں تو نے ساقی، خبر نہیں کچھ، پلا دیا کیا!

بس اس نشیلی نظر کے صدقے، کچھ اس نشے کا اتار بھی ہے!
نہ جانے مجھ سے خطا ہوئی کیا کہ پھر نہ جام شراب بخشا
نگاہِ ساقی کو یوں تو میرا یقین بھی اعتبار بھی ہے!
بجا کہ اس بے وفا کے در پر، کبھی نہ جائیں گے آپ اخترؔ
خطا معاف، آپ یہ تو کہئے، کہ دل پہ کچھ اختیار بھی ہے!

(۱۸)

لاکھ بہلائیں طبیعت کو بہلتی ہی نہیں
دل میں اک پھانس چبھی ہے کہ نکلتی ہی نہیں
قاعدہ ہے کہ جو گرتا ہے سنبھل جاتا ہے
دل کی حالت وہ گری ہے کہ سنبھلتی ہی نہیں
رنگ کیا کیا فلک پیر نے بدلے لیکن
میری تقدیر! کہ یہ رنگ بدلتی ہی نہیں
کس کو کہتے ہیں محبت نہیں معلوم ہمیں
اک تمنا سی ہے جو دل سے نکلتی ہی نہیں

(۱۹)

آئینہ خانہ میں اُن کے حسن کے جوہر کھُلے
در کے کھلتے ہی ہزاروں جنتوں کے در کھُلے
شام کو یہ کون سرمستِ پرستش نازنیں
شمع کھانے چاہتی ہے، بتکدے کا در کھُلے

بن رہی ہے آج تک وہ حُورِ تصویرِ حیا!
دیکھئے کب تک کھلے، کیسے کھلے، کیونکر کھُلے
بادۂ گلرنگِ ساقی میں عجب تاثیر تھی
میکدے میں عُقدہ ہائے مومن و کافر کھُلے

(۲۰)

ہزار ضبط کروں، زار زار روتا ہوں — کسی کی یاد میں بے اختیار روتا ہوں
مثالِ برقِ فروزاں جنوں میں ہنستا ہوں — برنگِ دیدۂ ابرِ بہار روتا ہوں
کسی کی یاد میں آنسو بہائے تھے نہ کبھی — میں آج کیوں میرے پروردگار روتا ہوں
مآلِ بزمِ شبانہ کا داغ ہے دل پر — چراغِ صبح ہوں، بے اختیار روتا ہوں

(۲۱)

اب ناصحِ ناداں کے سمجھانے کو کیا کہیئے؟
دیوانہ ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہیئے؟
دو چاند ہیں پہلو میں اب چاند کہیں کس کو
ساقی کو اگر کہیئے، پیمانے کو کیا کہیئے؟
آدابِ محبت سے تھا دُور ترا شکوہ
ایّامِ جدائی کے افسانے کو کیا کہیئے؟
ہر جنبشِ مژگاں میں سو عرش چھُپے نکلے
اب کعبے کو کیا لکھیئے، تبخانے کو کیا کہیئے؟

(۲۲)

وہ مرے دل کا حال کیا جانے؟ سوز و رنج و ملال کیا جانے؟
ہر قدم فتنہ ہے، قیامت ہے آسماں تیری چال کیا جانے؟
صبر کو سب کمال کہتے ہیں عاشقی یہ کمال کیا جانے؟
خون ہوتا ہے کس کی حسرت کا میرا رنگیں جمال کیا جانے!
وہ غریبوں کا حال کیوں پوچھے وہ غریبوں کا حال کیا جانے؟
کھو گیا ہو جو دل تصوّر میں وہ فراق و وصال کیا جانے!
سیلِ خوں کیوں رواں ہے آنکھوں سے موسم برشگال کیا جانے؟

مر رہے ہیں فراق میں اخترؔ
وہ مگر اپنا حال کیا جانے

(۲۳)

پھر فصلِ بہار آ رہی ہے اور پھول نئے کھلا رہی ہے
نغمہ سا صبا سنا رہی ہے ہر ایک کا دل لبھا رہی ہے
خوشبوئیں ہیں چار سو پریشاں پھولوں کو ہوا جگا رہی ہے
جو پھول ہے مسکرا رہا ہے جو شاخ ہے لہلہا رہی ہے
ہے اودی گھٹا کہ حورِ فطرت گلزار کا منہ دھلا رہی ہے
بوندوں کے یہ مست مست اشارے گویا کہ گھٹا بلا رہی ہے
بدلی ہے کہ نیل پوش ساقی جامِ کوثر پلا رہی ہے
ساقئ بہار جامِ گُل سے رنگین بادہ پلا رہی ہے

پھر حورِ نسیمِ صبح گاہی تا ہر غنچے کو گدگدا رہی ہے
اور بر لبِ شاخسارِ گُل پر اک سازِ حسیں بجا رہی ہے
اختر چلو ہر کلی کو چُومیں
دل میں یہ دُھن سما رہی ہے

(۲۴)

پچھلی رات "دورۂ جنوں" کے عالم میں کیبے کی مخالف سمت سے آواز آئی کہ غزل کہو اور میں گاتی ہوں۔ میں نے کہا تم گاؤ اور مجھے لکھاتی جاؤ چنانچہ جو کچھ اُس نے لکھوایا میں لکھتا گیا۔ اور وہ بغیر اصلاح و نظرِ ثانی نذرِ قارئین ہے۔
اختر

گھنگھور گھٹا گر صبح کو ہو، کیا وقت سُہانے ملتے ہیں!
اس طرح کہ جیسے بچھڑے ہوئے، دوست دوانے ملتے ہیں
ہے آج فضا بھی غمگیں سی، ہے آج صبا بھی محزوں سی
کیا بات ہے یہ کیوں درد بھرے غمناک فسانے ملتے ہیں؟
کس نے یہ کہا؟ کس سے یہ سُنا؟ یوں کہنے کو ہر اک کہتا ہے
انصاف تو ہو سلمیٰ سے کہیں، لیلےٰ کے فسانے ملتے ہیں
ہم کو تو جوانی میں بھی کوئی اک منظرِ سادہ تک نہ ملا
سنتے تھے کہ اس دنیا میں کئی، نظّارے سہانے ملتے ہیں
یہ بات الگ ہے آئے کوئی! آئے تو پھر اپنا ہو کے رہے
یوں ورنہ کسی کو شام و سحر! ہر روز بہانے ملتے ہیں

بدبختیٔ الفت یہ بھی ہے ، اچھا نو زمانہ مل نہ سکا
کہتے ہیں کہ شوقِ الفت میں اچھے بھی زمانے ملتے ہیں
بلبل کے ترانے کیوں نہ پسند آئیں ہمیں دردِ فرقت میں
غمگین دلوں کو غم ہو اگر، غمگین ترانے ملتے ہیں!
اختؔر جسے دنیا کہتی ہے ، افسردہ سا ہے، بیمار سا ہے
کیا ایسی مکدّر دنیا میں ، ایسے بھی دوانے ملتے ہیں؟

سانیٹ

پیمانِ وفا

یہ کیا کہا، کہ تمہیں دل سے میں بھلا دوں گا!
تمہاری یاد مجھے بھول کر نہ آئے گی!
یہ بے رخی میری تم کو بہت رلائے گی!
کہ نقش مہر و وفا دل سے میں مٹا دوں گا

یہ کیا کہا کہ کہیں اور دل لگا لوں گا؟
دیارِ غیر میں یاد آئے گی نہ گھر کی مجھے
نہ شرم ہوگی کچھ ان دیدہ ہائے تر کی مجھے
کہ اپنے سینے میں، میں اور کو بسا لوں گا!

یہ کیا کہا، کہ کروں گا، نہ اب میں یاد تمہیں؟
تمہارے روئے نگاریں کو بھول جاؤں گا
تمہارے حُسن بہاریں کو بھول جاؤں گا
نہ رکھ سکوں گا ہمیشہ کی طرح شاد تمہیں

بربِ کعبہ نہ بھولوں گا میں کہیں تم کو
ہر ایک ذرّے میں پائے گی یہ جبیں تم کو

بیوی سے

کیا کہا "آپ تو پردیس میں آرام سے ہیں"
"آپ کی جان سے دُور، آپ پریشاں کیوں ہوں"
"ہم غریبوں کی طرح مضطر و گریاں کیوں ہوں"
"مطمئن آپ تو ہر فکر، ہر انجام سے ہیں"

لیکن اے جانِ وفا، کچھ تجھے معلوم بھی ہے؟
تیری زلفوں کی طرح، کتنا پریشاں ہوں میں؟
ابر کی طرح تری یاد میں گریاں ہوں میں!
مُطمئن کہتی ہے تو جس کو وہ مغموم بھی ہے

لیکن اتنا ہے کہ تجھ سے نہیں کہتا غمِ دل!
شعلۂ درد کو سینے میں دبا رکھا ہے!
قلزمِ اشک کو آنکھوں میں چھپا رکھا ہے!
ورنہ اس حال میں خاموش نہ رہتا غمِ دل!

تجھ سے کہہ دوں تو ترے دل پہ ملال آتا ہے!
آبگینے کی نزاکت کا خیال آتا ہے!!

تسلّیاں

نہ رو، نہ رو کہ چمن کی بہار ختم ہوئی
فضائے باغ میں چلنا صبا نے چھوڑ دیا
کلی کلی پہ مچلنا صبا نے چھوڑ دیا
کہ فصل خندہ گر و خوشگوار ختم ہوئی

نہ رو، نہ رو کہ مری لالہ رُخ، وطن سے گئی
وہ رات دن کی ملاقات اب سے خواب ہوئی
وہ پیار پیار کی ہر بات اب سے خواب ہوئی
برنگ گل، وہ مری گلبدن چمن سے گئی

نہ رو، نہ رو کہ بس اب دورِ جام رخصت ہے!
خزاں نصیب ہوئیں وہ شباب کی راتیں
نہ ہات آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
کہ موسمِ قدحِ لعل فام رخصت ہے!

دلِ حزیں، یہی ایام پھر بھی آئیں گے
بہار و لالہ رخ و جام پھر بھی آئیں گے

لذّتِ خاموش

شامِ گلشن پہ بہاروں کے سمے لہرائے!
نگہِ شوق ہے اور مست نظاروں کا ہجوم!
شفق و نور کی شاداب بہاروں کا ہجوم!
مُسکراتے ہوئے تاروں کے سمے لہرائے!

ہر طرف رقص کناں غالیہ زاروں کا سکوت!
محفلِ دہر پہ خوابوں کا سماں طاری ہے
ذرّے ذرّے پہ کوئی حُسنِ جواں طاری ہے
دلِ آفاق پہ چھایا ہے بہاروں کا سکوت!

کون آیا میرے سینے میں یہ مخمورِ جمال؟
کس کی آواز سے سرشار ہے دنیائے شباب؟
کس کی آنکھوں سے چھلکتی ہے یہ صہبائے شباب؟
بزمِ کونین ہوئی جاتی ہے مسحورِ جمال!

ایسے عالم میں ہوں دنیا کا نہیں ہوش مجھے
کر رہا ہے یہ اثر بے خود و خاموش مجھے

تاثیر

میں نے اک نغمہ سنایا تھا تری محفل میں!
ایسی حالت میں کہ تھا ساز شکستہ میرا
یعنی تارِ نفس، آواز شکستہ میرا!
دل کا خون آنکھ میں تھا، آنکھ کے آنسوؤں میں

میں نے دیکھا کہ ترے دل پہ اثر تک نہ ہوا؟
میری فریادِ حزیں، خوابِ پریشاں ہی رہی
دل میں امید جو تھی، یاس بداماں ہی رہی
رحم کا تیری نگاہوں میں گزر تک نہ ہوا!

ساز کو پھینک دیا، بادلِ غمگیں میں نے
اس کے تاروں نے کبھی پھر نہ سنائے نغمے
ناامیدی سے کبھی لب پہ نہ آئے نغمے
گرچہ کتنے ہی لکھے نغمۂ خونیں میں نے

آج حیرت، مگر اے جاں مجھے اس راز پہ ہے!
اپنی آواز کا دھوکا، تیری آواز پہ ہے!

مہاجرہ

سکوں نصیب نہیں میری جانِ بسمل کو
فضائے غم میں مرے قلب کو قرار نہیں
کوئی امید نہیں ہے کہ سوگوار نہیں
وہ گُم شدہ ہوں، ترستا رہے جو منزل کو

دیارِ غیر میں روئے نشاط محفل کو!
وہ شاخِ خشک جو معمورِ برگ و بار نہیں
فسردہ گُل، جسے امیدِ نو بہار نہیں
الٰہی کیا کروں اپنے الم زدہ دل کو!

چمن سے دور ہوں اک بُلبلِ حزین و خموش!
ستا رہی ہو جسے یاد آشیانے کی
فلک نے چھین لی جس سے خوشی زمانے کی
گلوں سے دور ہوں میں اک گُلِ حزین و خموش!

ہوائے خلد ہو دل میں تو خار بھی نہ ملے
جو مر رہوں تو کنارِ مزار بھی نہ ملے

اذان

روحِ آفاق میں جس کو شرر افشاں دیکھا!
وہ صدا، جس کو دل و جانِ مسلماں کہیے
نغمۂ بے خودِ و رحمت گہِ یزداں کہیے
سینۂ دہر میں ہر سو، جسے رقصاں دیکھا!

روز و شب اور مہ و سال گئے، پھر آئے!
اس کا مستانہ تلاطم ہے ابھی تک برپا
لبِ فطرت کا تبسم ہے ابھی تک برپا
کتنے ماضی مٹے اور حال گئے، پھر آئے!

دشت و صحرا و جبل، جس سے دہل جاتے ہیں
جس سے ہیں لرزہ براندام، ستارے اب بھی
جس سے کانپ اُٹھتے ہیں دنیا کے نظارے اب بھی
لات و عزّےٰ و ہبل، جس سے دہل جاتے ہیں

یہ اذاں ہے کہ ہے اک عظمتِ سرشار و جواں
قلبِ مسلم کی ہے اک دولتِ بیدار و جواں

رہٹ کی آواز سن کر

عمرِ رفتہ کی صدا آتی ہے آواز کے ساتھ
آہ یہ نغمۂ بے تاب و حزیں کیسا ہے؟
دقت کی آنکھ میں یہ خوابِ حسیں کیسا ہے؟
جیسے مضراب شکستہ ہو کسی ساز کے ساتھ!

آہ یہ بچّے، یہ معصوم، یہ ناداں روحیں!
جیسے آواز کی جنّت میں ہوں تارے روشن!
شفق شام میں پھولوں کے ستارے روشن!
جاں فزا کھیت میں دہقان کی دہقاں روحیں!

کوئی دھیمی سی نوا ہے کسی آہنگ کے بعد!
کوئی شیریں سی ادا ہے جو ستاتی ہے مجھے!
عالمِ خلد کا افسانہ سناتی ہے مجھے!
جیسے روئی ہوئی آنکھیں ہوں کسی جنگ کے بعد!

اپنی ہر آہ کے ہمراہ تو رونے دے مجھے
رحم کر اپنی اس آواز میں کھونے دے مجھے

شربتی آنکھیں

شربتی آنکھوں سے اک جام پلا دے مجھ کو!
آہ وہ جام کہ شیریں بھی ہے مسموم بھی ہے
سادہ بھی مست بھی، رنگین بھی معصوم بھی ہے
پھر اسی جام سے دیوانہ بنا دے مجھ کو

تیرے شربت میں نہاں مستیٔ گلہائے بہار
تیری آنکھوں میں ہیں ساون کے ستارے روشن
شفق و نور کے شاداب نظارے روشن
آہ اے روشنکِ نکہت و سلمائے بہار

تیری مستی بھری آنکھیں ہیں کہ جامِ گویا
جنتِ قدس کا افسانہ سناتے ہیں مجھے
جنتِ کیف کا نظارہ دکھاتے ہیں مجھے
صبح ناطق کہوں میں ان کو کہ جامِ گویا؟

اس طرح دیکھ کہ پھر ہوش نہ آنے پائے
میری آنکھوں میں کبھی کچھ نہ سمانے پائے

راحت رفتہ

تجھے کیوں راحتِ رفتہ کی یاد آتی ہے رہ رہ کر؟
مرے نادان دل کچھ تو بتا یہ ماجرا کیا ہے؟
پرانے قصّے دہرانے سے آخر فائدہ کیا ہے؟
بتا ماضی کی دُھن کیوں اتنا تڑپاتی ہے رہ رہ کر؟

کسی کا حال دنیا میں کبھی یکساں نہیں رہتا!
زمانے میں تغیّر ہی تغیّر کی حکومت ہے
تغیّر اصل ہستی ہے، تغیّر اصل فطرت ہے
تغیّر ہو نہ جس انساں میں، وہ انساں نہیں رہتا!

خزاں کے بعد آتی ہیں بہاریں باغ عالم میں!
بہاریں ختم ہونے پر خزاں کا دور آتا ہے
چمن روتا ہے اک دن دوسرے دن مُسکراتا ہے
غرض عمریں گزر جاتی ہیں یوں شادی و ماتم میں!

بُلا کر راحتِ رفتہ کو لا سکتا نہیں اے دل!
تو اپنے رنج کو راحت بنا سکتا نہیں اے دل!

صحنک

جلوۂ قدس، سرِ بزمِ حسیں طاری ہے!
چار سُو بال فشاں، عصمت و عفّت کی مہک
جس پہ ہوتی ہے فدا وادیٔ جنّت کی مہک
کہکشاں، محوِ ضیا باری و گُل باری ہے!

آہ یہ رات، یہ موسم، یہ ستاروں کی بہار
جمع ہیں ایک طرف چند خواتینِ حسیں
گلشنِ عفت و حرمت کی ریاحینِ حسیں
وہ ریاحیں کہ جنہیں کہیئے بہاروں کی بہار

پھیلی ہے چار طرف نکہت گلہائے نیاز
پارسائی کی بہاروں کا سماں چھایا ہے
وہ سماں جس کا کہ فردوس بریں سایہ ہے
ہائے یہ جلوۂ معصوم یہ سینائے نیاز

اِمتحاں اپنے تقدّس کا ہے مفقود ان کا
وہ تقدّس کہ دل و جاں سے ہی مسجود ان کا

سالگرہ

فضائے شام غریباں میں آئی سالگرہ
یہ انقلاب لکھا تھا نصیب قسمت میں
کٹے یہ لمحۂ مسرور، رنجِ غربت میں
خدا نے دہلی سے باہر دکھائی سالگرہ

زمانہ سخت دل آزار و بے وفا نکلا
ہر اک کے حصے میں دنیا کی سختیاں آئیں
بقدرِ حوصلہ یہ تیرہ بختیاں آئیں
سکوں نصیب جو دل تھا، ستم زدہ نکلا

جنہیں نصیب تھا گھر بار، آج بے گھر ہیں
جو خوش تھے اپنے وطن میں وہ بے وطن ہیں آج
جو شادماں تھے، رہینِ غم و محن ہیں آج
رہینِ جورِ سپہر فساد پرور ہیں!

اس طرح دیکھ کہ پھر ہوش نہ آنے پائے
میری آنکھوں میں کبھی کچھ نہ سمانے پائے

فکاہات

مرد اور عورت کی یک رنگی

عورتوں کے مردانہ فیشن پر طنزیے

ذوقِ ہم رنگی

کل شب کو تھیں اک بال میں، جلوہ کناں حور و پری
یا محوِ رقص و نغمہ تھے، صد ہا بتانِ آذری!
دل موہ لینے کے لئے، ہر شوخ ادا آمادہ تھی
آنکھوں میں کفرِ ساحری ہونٹوں پہ کفرِ سامری!
تہذیبِ نو کے رنگ سے، لبریز تھی ہر اک ادا
ملبوس کی عریانیاں، انداز کی عریاں گری!
تھے زلف و گیسو کی جگہ، مردانہ فیشن سر کے بال
وہ تھیں کہ صد ہا منچلے، مستِ شرابِ دلبری!
یہ دیکھ کر میں نے کہا اک شوخِ "صبر آشوب" سے
اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری"!
یوں تو مکمل ہے ترا، ہر طرح حسنِ بے مثال!

"ہرچند وصفت می کنم اور حسن ازاں زیبا تری!
لیکن ذرا راہِ لطف مجھ کو دے، جواب اس بات کا
کیونکہ گوارا ہے تجھے، یہ گیسوؤں کی ابتری؟
پہلے تو سوچا دیر تک، پھر مسکرا کر ناز سے
یوں بولی وہ کا فر ادا "مست ادائے کافری!
مردانہ فیشن سے غرض، اس کے سوا کوئی نہیں
"تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری"

(۲)

شاعروں کا دامِ گیسو

ہمارے شاعروں کو رات دن بیتاب رکھتی تھی
تمنا، خود کو دامِ زلف و گیسو میں پھنسانے کی
مگر اب سنتے ہیں گیسو بُری کا چل پڑا فیشن
بڑھائیں جا کے یہ حضرات رونق جیل خانے کی

(۳)

انقلابِ معنی

لغاتِ خانہ میں گیسو بُریدہ گو ایک گالی تھی
مگر گیسو بُریدہ، آج کل ہر ایک عورت ہے
فقط گیسو بُری کا ذکر کیا ہے اس زمانے میں
کہ عریانیٔ تن بھی داخلِ تقلیدِ فطرت ہے

لطفِ تمثیل

مغرب کی نعمتیں یوں، مشرق میں بٹ رہی ہیں
چہرے چمک رہے ہیں، اور زلفیں کٹ رہی ہیں
ہے حُسن زادِ نسواں، میں انقلاب برپا
دن بڑھ رہے ہیں اختر اور راتیں گھٹ رہی ہیں

اے کشتۂ فولاد

اس نظم کے شانِ نزول کے اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ ہمیں شملے جانے کا اتفاق ہوا جن دوست کی کوٹھی پر ما بدولت نزول اجلال فرما تھے ان کے صاحبزادے کو ایک بزرگوار کہ نام جن کا مامون الرشید ہارونی تھا۔ ریاضی اور تاریخ پڑھانے پر مامور تھے۔ ملازمین عام طور پر از راہ غایت عقیدت ان کو "خلیفہ" صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ گویہ امر ہنوز بدستور ایک راز بنا ہوا ہے کہ ان خلیفہ صاحب کا کوئی نسلی یا بیعتی تعلق خلفائے عباسی کے خاندان سے تھا یا نہیں؟ بہر حال قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ از بسکہ ہمارے خلیفہ صاحب "کشتگانِ خنجر تسلیم" امراض سے تھے۔ اور... ع۔۔ ہر زماں از غیب جانِ دیگر است، کی زندہ مثال بنے رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ کو کشتوں اور خاص طور پر "کشتۂ فولاد" کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب عباسی ہونے کے بجائے شاید کشتگانِ

"ضروب صلیبی"[1] کی اولاد ہوں۔

الغرض ان کی کُشتہ خوری کی "فولادی" عادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہ نگاہِ قدر شناسی ہم نے ان کی خدمت میں "کشتۂ فولاد" کا خطاب پیش کر دیا۔ اور چونکہ رسمِ خطاب یافتگی سے ایک روز پہلے وہ ہم سے وعدہ خلافی کر کے تنہا سیر کو چلے گئے تھے۔ اس لئے ہم نے اس پیش کش کے ساتھ بطور "مستزاد" چند اشعار بھی تقدیم کرنے مناسب سمجھے۔

کل چھوڑ کے تنہا تو ہمیں چل دیا اُستاد!
اے کُشتۂ فولاد!

کیا راہ میں ملتی تھی کوئی طرفہ پری زاد!
اے کشتۂ فولاد!

دُنیا تجھے کہتی ہے فلاطون کا بیٹا
ہارون[2] کا بیٹا

مامون ترا نام ہے، اے صاحبِ اولاد!
اے کشتۂ فولاد

ہر سُو نظر آتی ہیں دواؤں کی قطاریں
کُشتوں کی بہاریں

کمرہ ہے ترا یا ہے شفاخانہ سا آباد
اے کشتۂ فولاد

۱۔ خلیفہ صاحب کے ایک خاص مرض کی طرف اشارہ ہے۔ ۲۔ خلیفہ صاحب کے مورثِ اعلیٰ کا نام تھا۔

اک گاؤں کا کھانا تو اُڑا جاتا ہے تنہا
کھا جاتا ہے تنہا

معدہ ترا کرتا ہے سدا درد سے فریاد
اے کُشتۂ فولاد!

ہر وقت شکایت ہے تجھے دردِ جگر کی
اور ضعفِ بصر کی

کُشتہ ہو کہ سُرمہ ہو ترے دم سے ہے آباد
اے کُشتۂ فولاد!

کُشتوں کے سوا تجھ کو کوئی دھیان نہیں ہے
ارمان نہیں ہے

دنیا کے اطبّا کے مطب تجھ سے ہیں آباد
اے کُشتۂ فولاد!

دنیا تجھے کہتی ہے محبّت سے خلیفہ
اے رشکِ "خلیفہ"!

روتے ہیں جدائی میں ترے دجلہ[1] و بغداد
اے کشتۂ فولاد!

وہ باج و خراج اور ترا تاج کہاں ہے؟
وہ راج کہاں ہے؟

---

[1] نام کے اثر سے خلیفہ صاحب اپنے آپ کو عراق، عرب اور مصر کا جائز وارث خیال کرتے تھے

کی گنبدِ گردوں نے "خلافت" تری برباد[1]
اے کشتۂ فولاد!

اگلی سی تری عظمت و شوکت نہیں باقی
سطوت نہیں باقی

اب نائی ہی کہتے ہیں "خلیفہ" تجھے اُستاد
اے کشتۂ فولاد!

ہے پیٹ ترا یا کوئی پنساری کی دکّاں
عطّار کی دُکاں!

آنتیں ہیں تری یا کہ دواخانہ ہے آباد
اے کشتۂ فولاد!

سیروں ہی اڑا جاتا ہے شبرات کا حلوا
خیرات کا حلوا!

تاثیر سے کُشتوں کی ہوا تجھ کو یہ گُر یاد
اے کُشتۂ فولاد

کُشتوں کا کچھ اس طرح تجھے روگ لگا ہے
گویا کہ ہوا ہے

دنیا کا ہر اک کُشتہ ترے واسطے ایجاد
اے کُشتۂ فولاد

---

[1] ہم سے ملاقات کے وقت خلیفہ صاحب برے حالوں میں تھے۔

ہر وقت تجھے صرف دوا پینے کی ہے فکر
اور جینے کی ہے فکر

گو تیرا جگر موت کو آتا ہے بہت یاد
اے کشتۂ فولاد

کھیلے تو اگر تاش تو بازی ہی اُلٹ جائے
قسمت ہی پلٹ جائے

ہر کھیل میں رہتی ہے نحوست تری ہمزاد
اے کشتۂ فولاد!

غش کھا کے گریں دیکھ کے تو اتنا حسیں ہے
ہر اک کو یقیں ہے

کھینچیں تری تصویر اگر مانیؔ و بہزاد
اے کشتۂ فولاد!

ہر موجِ صبا ہے تری رفتار کے صدقے
گفتار کے صدقے

ہے نکہتِ گلزار ترے عشق میں برباد
اے کشتۂ فولاد!

لکھّے تری تعریف میں کیا ابن بطوطہ
چل جائے نہ جوتہ

تاریخ میں کو دن ہے ریاضی میں تو استاد
اے کشتۂ فولاد

مطائبہ

پوسٹ مین اس بت کا خط لاتا نہیں
اور جو لاتا ہے پڑھا جاتا نہیں

کون سا بُت ہے جو تڑپاتا نہیں
مال پر ہم سے پھرا جاتا نہیں

عاشقی سے کیوں ہم استعفا نہ دیں
ہوٹلوں کا بل دیا جاتا نہیں

شیخ جی موٹر پہ حج کو جائیے
عہدِ نو میں اونٹ کام آتا نہیں

بوسہ لیں اُس سرو قد کا کس طرح
تاڑ پر ہم سے چڑھا جاتا نہیں

پھیر لیں کیوں دل نہ اس ظالم سے ہم
عشق ہے، رشتہ نہیں، ناتا نہیں

عاشقوں پر ظلم کرنا چھوڑ دیں
کیوں بے قاصد جا کے سمجھاتا نہیں!

رات دن فرمائشیں زیور کی ہیں
ہم سے اب عاشق رہا جاتا نہیں

بزم میں دشمن ہے کیوں خاموش آج
بھائی چھیلا کس لئے گاتا نہیں؟

جل گئی سگرٹ سے داڑھی شیخ کی
یہ مگر فیشن سے باز آتا نہیں؟

فربہی کا طنز کیوں عشاق پر؟
تیری چکّی سے تو پسواتا نہیں

فیس پہلے جب تلک رکھوا نہ لے
ڈاکٹر اپنے بھی گھر جاتا نہیں

بیکری میں نوکری کرلی پڑی
وہ سوائے کیک کچھ کھاتا نہیں

تیری فرقت میں بہت فاقے کئے
آ کہ اب بھوکا رہا جاتا نہیں

گھس گھسُدے لکھنے لگے ہیں ٹاکیاں
دیسی فلموں میں مزا آتا نہیں!

کب سے ہے مہمان نذرِ اے ہجرِ یار؟
بھائی میرے گھر سے کیوں جاتا نہیں؟

او ستمگر! روکنا موٹر ذرا
میرے خچر سے چلا جاتا نہیں

لانڈری کھولی تھی اس کے عشق میں پر وہ کپڑے ہم سے دھلواتا نہیں
حضرتِ ابنِ بطوطہ[1] کی غزل ضد کے مارے وہ صنم گاتا نہیں

---

[1] حضرت اختر شیرانی نکاہی نظموں میں بالعموم اپنے آپ کو ابن بطوطہ لکھتے ہیں۔

ماہیئے

سوالات

(۱) وہ جب کبھی یاد آتے ہیں

وہ جب کبھی یاد آتے ہیں!
کیوں چھیڑتے ہیں مجھ کو، کیوں مجھ کو ستاتے ہیں؟
چُپ چپ سے وہ رہ رہ کر
کچھ آنکھوں میں کہہ کہہ کر، کیوں مجھ کو ہنستاتے ہیں؟
تنگ آئی ہوں عادت سے
ہر وقت کی شرارت سے، کیوں مجھ کو جلاتے ہیں؟
اظہارِ محبّت سے
اقرارِ محبّت سے، کیوں مجھ کو بناتے ہیں؟
جب ہوتی ہوں رنجیدہ،
تب ہوکے وہ سنجیدہ، کیوں مجھ کو مناتے ہیں؟
کرتی ہوں گلہ جب میں
ہوتی ہوں خفا جب میں، کیوں پیار جتاتے ہیں؟
وہ جب کبھی آتے ہیں

(۲)

کیا دل میں سمائی ہے؟
پردیس میں جاکر یوں، کیوں چھاونی چھائی ہے؟
باغوں پہ گھٹا چھائی
کیوں ایسے سمے آئی، ساون کی دُہائی ہے؟
کب سے ہیں جدا ہم سے؟
کب سے ہیں خفا ہم سے، کب سے یہ لڑائی ہے؟
یہ تو نہیں کچھ مشکل!
خط لکھنے میں بھی اے دل، کیا کوئی بُرائی ہے؟
کیا دل میں سمائی ہے؟

یاد

(۳)

پھر یاد وہ آتے ہیں
ساون کے بھرے بادل، دل میرا دکھاتے ہیں!
پھر بدلیاں چھاتی ہیں!
امیدیں دلاتی ہیں، ارمان رُلاتے ہیں!
جاکر کوئی سمجھائے!
کیوں اب بھی نہ گھر آئے، سب اپنے گھر آتے ہیں!
رہ رہ کے ہیں یاد آتے

وہ بھولے نہیں جاتے ، ہم لاکھ بھلاتے ہیں !
کس طرح مِٹے یہ غم ؟
بیتے ہوئے دن ہمدم رہ رہ کے رُلاتے ہیں!
پھر یاد وہ آتے ہیں!

سوزِ ناتمام

اس عنوان کے ماتحت ہم جستہ جستہ وہ بعض اشعار اور مصرعے درج کرتے ہیں، جو ہمیں ناتمام غزلوں اور نظموں کی صورت میں آپ کی بیاض سے ملے ہیں۔

سحر کے وقت یہ مژدہ لئے ابرِ بہار آیا
مبارک اے زمیں! پیغمبرِ گردوں وقار آیا

دل دیوانہ وہ دن آئے، وہ دن پھر آئے
میں ہوں آنکھیں ہوں مری، اور مزارِ خواجہ
خاکِ اجمیر ہے گہوارۂ شان و عظمت
اختر اس خاک میں روشن ہے وقارِ خواجہ

عشق کی دُنیا میں رسوا ہو چکے ــــ ہم تو پامالِ تمنّا ہو چکے
اک زمانے کا تماشا ہو چکے ــــ رحم کر اے عشق رسوا ہو چکے
تجھ کو کیا دیکھیں کہ تجھ کو دیکھ کر ــــ ہم تو آپ اپنا تماشا ہو چکے

اے گیت ذرا مجھے سُلا دے ــــ اور خواب میں خلد کو دکھا دے
وہ خلد کہ جس میں حور ہے وہ ــــ وہ رشکِ چراغِ طور ہے وہ
جس ماہ جبیں پہ جاں ہے قرباں ــــ مہر و مہ و کہکشاں ہے قرباں

مرے ندیم مجھے لے چل اُن بہاروں میں
جہاں بہشتیں ہیں رقصاں بنفشہ زاروں میں

جہاں ہیں نغمہ سرا حوریں شاخساروں میں
جوانیاں سی بُر افشاں ہیں جوئباروں میں
مرے ندیم مجھے لے چل اُن بہاروں میں

پہلے ہی کب امید تھی تم شاد کروگے
معلوم تھا ہم کو یونہی برباد کروگے!
کہتے ہو نکل جاؤ نکل جائیں گے جس دن
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے!

خون کے آنسو

رگ رگ میں بیٹھی بیٹھی خلش سی سما گئی
بے اختیار جب کبھی تری یاد آگئی
ابر بہار جب کبھی آیا رُلا گیا
بادِ بہار آگ سی دل میں لگا گئی

میرے اظہارِ محبّت پہ یہ اصرار کیا
پہلے کس کس سے یہ اقرار کیا
عرض کی میں نے کہ دل نے مجھے ناچار کیا
بولے کیوں تم نے نہ انکار کیا

میرے اقرارِ محبّت پہ کسی نے یہ کہا پہلے کس کس سے کیا؟
آہ میں کیا کہوں کہتے ہوئے آتی ہے حیا مجھ سے کیا جرم ہوا؟
کیا ہوا میں نے اگر عشق کا اظہار کیا آپ سے پیار کیا
آپ نے کیوں مرے ارمانوں کو بیدار کیا دل کو سرشار کیا
نہ وہ رنگِ باغِ جہاں رہا، نہ وہ کیفِ عمرِ جواں رہا
نہ وہ ذوقِ بزمِ مغاں رہا نہ وہ شوقِ کوئے بتاں رہا

وہ نسیمِ صبحِ چمن نہیں وہ شمیمِ زلفِ سمن نہیں
وہ نشاطِ باغِ وطن نہیں وہ کہاں رہیں یہ کہاں رہا

دنیا ہے سیہ خانۂ غم شمع جلا دے — اُٹھ ساقیِ مہوش مجھے پیمانہ اُٹھا دے
اُس لغزشِ مستانہ کا ارمان ہے ساقی — جو تیرے مچلتے ہوئے قدموں پہ گرا دے

یا یہ دل دکھانا ہے یا وہ جی لبھانا تھا — یہ بھی اک زمانہ ہے وہ بھی اک زمانہ تھا
مر گئے ہم آخر کو اس طرح بھی کیا جیتے — زندگی کا ہر لمحہ موت کا فسانہ تھا
اے گیت اُسے بتا دے جاکر — میرا غمِ دل سنا دے جاکر

یادِ شبِ وصال کو دل سے مرے بھلا بھی دے
یہ خلش آہ یہ خلش آ اور اِسے مٹا بھی دے
ہستیٔ بے ثبات کو منہ نہ لگائیں ہم کبھی
کہتے ہیں جس کو موت وہ ہم کو کچھ آسرا بھی دے
شکوہ سنجِ غمِ پنہانی ہوں — غمزدہ اخترِ شیرانی ہوں
آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو — آپ کا اخترِ شیرانی ہوں

دنیائے آرزو کو نہ برباد کر کے جا! — یوں تو مجھے نہ مائلِ فریاد کر کے جا
اتنا ستم نہ اے ستم ایجاد کر کے جا!

فتنہ و شور ہے برپا یہ حرم میں کیسا　　جس نے میخانہ کی دیوار ہلا دی ساقی

میرا ہر شعر ہے اخترؔ مری زندہ تصویر　　دیکھنے والے نے ہر لفظ میں دیکھا ہے مجھے

کس نے پھر چھیڑ دیا ذکرِ دیارِ سلمیٰ　　لہلہانے لگی آنکھوں میں بہارِ سلمیٰ

جب سے بے پردہ ترا حُسنِ جواں دیکھا ہے　　ہر طرف خلد کے جلووں کو رواں دیکھا ہے

دنیا کے رنج و عیش ہیں کس اعتبار کے　　دو دن خزاں کے ہوتے ہیں دو دن بہار کے

تم تو سولن میں گزارو بھری برسات کی رات
اور یہاں آنکھوں میں کٹ جائے یہ جذبات کی رات

شبِ بہار میں کیوں نیند سے وہ چونک اُٹھے　　مرے خیال نے شاید جگا دیا ہوگا!

نسیم صبح بہار مجھ کو سنا رہی ہے پیام کس کا
الٰہی! رہ رہ کے آ رہا ہے مری زباں پر یہ نام کس کا

چمن میں بادۂ گل نے عجب دھوکہ دیا مجھ کو
کہ میں نے شوقِ مے نوشی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

سیلابِ اشک دیکھ کے حیرت سے یہ نہیں　　کس طرح چھپ گئے ہیں یہ دریا حباب میں

کسی شوخ کی یاد آنے لگی ہے!　　محبت ہمیں پھر ستانے لگی ہے

کیوں صبا آئے ترے کوچے میں؟　　پھرنے والی ہزار ہا گھر کی!!

دل نے بری طرح سے ستایا تمام رات　　رویا خود اور ہمیں بھی رُلایا تمام رات

میکدے میں اب بھی ذکر آتا ہے مینوشی کے وقت　　کیا خبر تھی اختر اتنا پارسا ہو جائے گا

بہت تڑپائیگی دل کو ہماری داستاں اک دن　　کرے گا یاد رو رو کر ہمیں سارا جہاں اک دن

شیر کو شیر کبھی صدمہ نہ پہنچائے گا　　مگر انساں ہے کہ انسان کو کھا جائے گا

باز دل می بردم ذوقِ اسیری بلبل　　گر روم سوئے قفس خوردہ نگیری بلبل

مژدہ اے مرغِ گرفتار کہ صیاد آمد　　باز از صیدِ فراموش خودش یاد آمد

چہ باک ار قفا قیہ شد تنگ مارا ہیچو عیشِ من
قفس از نغمہ کے مانع شود مرغِ خوش الحاں را

ہمیں بھول جانے والے ہمیں کیوں بھلا رکھا ہے

عشرت کو بکنی ہے نہیں وافقت پرویز کہہ دو یہ لطف جو چاہے تو کہستاں میں آ

ہم جو آنکھوں سے رواں سیل بہاراں کرتے
چشمۂ چشم سے شاداب گلستاں کرتے
ہم ہی مجبور ہوئے عشق میں حیراں ہو کر
ورنہ اکثر انہیں غمناک و پریشاں کرتے

میری تنہائی کی توہین نہ ہوتی یارب کوئی آنسو میری آنکھوں کا سہارا ہوتا

اس دل کی حسرتوں کا ماتم کریں گے ہم لیکن وہ خونفشانی چشم حزیں کہاں

نگاہوں میں مستی لبوں پر تبسم بہار آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں

سنتے ہیں آپ نے کچھ ہم سے شکایت کی ہے
آپ کی جان سنے دور آپ سے فریاد نہیں

اے دل آ اپنے دل آزار کو پھر یاد کریں اس طرح روئیں کہ گلزار بھی فریاد کریں

مصرع

لے کے آئی ہے جنوں فصلِ بہار اب کے برس

سچ پوچھو تو اب جینے کی فرصت ہی نہیں ہے

کیا ہوا میں نے اگر عشق کا اظہار کیا آپ سے پیار کیا

کسی پہ کبھی کسی حالت میں اعتبار نہ کر

ہم اپنی عید کو دل میں چھپائے بیٹھے ہیں

میں ہوں مبتلائے غم و محن، مرے ماہ رو مرے گلبدن

یہ حضرت ہیں مہمان بھلا کتنے دن کے

وہ فصلیں وہ بہاریں وہ گلستان یاد آتے ہیں

اے ہجومِ آرزو تو ہی بتا ہم کیا کریں

رخصت اے بزمِ جہاں

یہ ہے کون سرمست گفتار شیریں

تقدیر ہنس رہی ہے تدبیر رو رہی ہے

ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

محبت ہے اختر اک آزار شیریں

قبر کو میری مٹایا ہے غنیمت ہے بہت

باغباں کیسی خوشی آئی ہے اس گلشن میں

خوابِ رفتہ کو بہت یاد کیا ہے ہمدم

کس قدر آج پریشاں ہیں غیاض و اختر

بطحا کے جانے والو اے رہروانِ بطحا

مصرعہ جو موت سے چند لمحات پہلے ہونٹوں پر جاری تھا:۔

ہو گئی بزمِ میکدہ خاموش

مرثیہ

محمد نظیر الدین خاں

محمد نظیر الدین ۔ ایف ۔ ایس ۔ سی علیگ جن کی شادی ۲۲ ، اگست ۱۹۴۷ء کو اختر مرحوم کی دخترِ نیک اختر سے ہوئی تھی ۔ شادی کے تقریباً چالیس یوم بعد ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو 'بناس' ندی کے کنارے قبلہ حافظ محمود صاحب شیرانی کے مزار پر فاتحہ کے لئے اپنی اہلیہ محترمہ اور دیگر متعلقین کے ساتھ گئے فاتحہ خوانی سے فراغت کے بعد آپ اس ندی سے پانی لینے گئے صاف پانی لینے کے خیال سے پانی میں کچھ دور اور آگے قدم بڑھایا بد قسمتی سے پانی میں گڑھا تھا ۔ پاؤں پھسلا اور ڈوب گئے ۔ ادھر کنارے پر اختر مرحوم کے صاحبزادے مظہر محمود خوشنود کھڑے تھے جب کچھ دیر نظیر الدین پانی سے باہر نہ نکلے تو انھوں نے شور مچایا ۔ اِدھر اُدھر سے آدمی جمع ہو گئے اور لاش نکالی گئی ۔ نظیر الدین ختم ہو چکے تھے۔

مذکورہ ذیل اشعار ۔ ۔ ۔ ۔ اختر کے اسی احساس غم و الم کی یادگار ہیں۔

ہے غرق ظلمتِ یاس آسماں آج
مہِ روشن ہے نظروں سے نہاں آج
خدائی بحرِ غم میں کیوں نہ ڈوبے
اجل ڈوبا نظیر الدیں جواں آج

۱۳۶۶ھ

نغمۂ حرم

اختر شیرانی کے کلام کا ساتواں مجموعہ

بنامِ ایزدِ بخشائندۂ دادگر

دعا!

الٰہی! مجھ کو ایسی نالہ سامانی عطا کر دے!
جو بزمِ دہر میں ہنگامۂ محشر بپا کر دے!
سرودِ آبادِ ہستی میں میں اِک سازِ شکستہ ہوں
مرے خاموش تاروں کو ترنّم آشنا کر دے!
اگر تیرے سوا بھی مدعا ہو سکتا ہے کوئی!
تو میرے دل کو یکسر، بے نیازِ مدعا کر دے!
سوادِ عالمِ حیرت میں ہوں گمراہ مدّت سے
مرے پائے طلب کو اب تو منزل آشنا کر دے!
چمن زارِ فنا میں ایک مرغِ پر شکستہ ہوں!
مجھے نذرِ آزمائے ذوقِ پروازِ بقا کر دے!
سکھا دے طفلِ دل کو درس، اخلاص و محبّت کا
زباں کو بے نیازِ شکوۂ مکر و دغا کر دے!
کسی سے مجھ کو کینہ ہو، عداوت، ہو نہ نفرت ہو
ایاغِ دل کو لبریز ئے صدق و صفا کر دے!

مرے آغاز میں انجام کی صورت نظر آئے!
مری ہر ابتدا کو ہم صفیرِ انتہا کر دے!

مصیبت میں بھی صبر و شکر کے نغمے زباں پر ہوں
اسیرِ گیسوئے رسمِ شہیدِ کربلا کر دے!

مزے دیتی ہے کیا کیا بے قراری کی ادا یارب
مرے دردِ خلش پرور کو دردِ لا دوا کر دے!

صنم خانے میں ذوقِ وحدت اک دشوار منزل ہے
حریمِ معرفت میں بے نیازِ ماسوا کر دے!

نزا اختر، تری سرکار میں اک عرض لایا ہے
عجب کیا ہو، اگر تو کامیابِ التجا کر دے!

سالِ نو

سالِ نو کا مضطرب رنگیں نوا گاتا ہوا!
آ رہا ہے عیش و غم کے نغمے برساتا ہوا

سینے پر مہتاب و انجم کی سنہری آب و تاب
سر پہ سورج کا سنہری تاج چمکاتا ہوا

رات کے گیسوئے مشکیں دوش پر ڈالے ہوئے
دن کے جلوے مرمریں چہرے سے دکھلاتا ہوا

زندگی کے مختلف رنگوں کو دامن میں لئے!
زندگی کی مختلف راہوں پہ کتراتا ہوا
پیچھے پیچھے تیغِ عریاں کے ہلالی جام سے!
ایک مجمع وحشیوں کا خون برساتا ہوا
آگے آگے نازنینانِ تمدّن کا ہجوم
اپنے رنگیں دامنوں سے پھول برساتا ہوا
اک طرف دولت کی پریاں بیخودِ رامشگری
دیو افلاس ایک جانب ٹھوکریں کھاتا ہوا
ایک جانب ہیں خوشی کی نازنینیں محوِ رقص!
ایک جانب پیرِ غم ہے اشک برساتا ہوا
لیکن ان میں سب سے آگے حاکمِ تقدیر ہے
سالِ نو کے خواب کی کیا جانے کیا تعبیر ہے

شمعِ حرم

یاد آیا میکہ رشکِ طور تھی ہستی مری!
جلوہ ہائے قدس سے آباد تھی ہستی مری
سوزِ عشقِ احمدؐی سے دل مرا لبریز تھا!
خندہ زن تھی اوجِ مہر و ماہ پر پستی مری

سازکے تاروں پہ لہراتے ہیں نغمے جس طرح
یوں فضائے عشق میں آوارہ تھی مستی مری
جس کے دو دا د نی سے پروانے تھے سلمانؓ و بلالؓ
ہاں وہ موجِ شعلۂ الہام تھی ہستی مری

آ کہ سوزِ عاشقی کے نغمے بر ساتی ہوں میں
سُن کہ پھر افسانۂ ماضی کو دہراتی ہوں میں
جب کہ یہ دنیا سراسر ایک ظلمت خانہ تھی
محفلِ ہستی شعاعِ نور سے بیگانہ تھی
نغمۂ آدم سے تھا محروم خوابستانِ دہر
سطحِ عالم ایک ہیبت آفریں ویرانہ تھی
روحِ انساں تھی ابھی نامحرمِ رازِ الست
ہستیٔ شیطاں سراسر قدس، اک افسانہ تھی
جرعہ نوشِ بادۂ ہستی تھے سرمستِ الست
گرچہ فطرت جلوہ زارِ ساغر و پیمانہ تھی
تب بھی ان رنگین ستاروں کی طرح روشن تھی میں!
فطرتِ آدم کی گہرائی میں طوفاں زن تھی میں!
میں فضائے عرش کا ٹوٹا ہوا ستارہ تھی!
جلوہ ہائے نَو بہ نَو میں مائلِ نظارہ تھی!

ذوقِ موسےٰ بن کے تھی خود حیرتی جلوہ میں
خود ہی موجِ نور بن کر طور پر آوارہ تھی

آتشِ نمرود تھی جب آسماں تک شعلہ زن
خلد بن کر تب میں ابراہیم کا گہوارہ تھی

دیدۂ یعقوب میں تھی جلوۂ امید میں
نوح کی کشتی میں حسنِ چارۂ بےچارہ تھی

شکلِ یوسفؑ میں برنگِ حسنِ جانانہ تھی میں !
سینۂ عیسیٰ میں قُم کا سازِ مستانہ تھی میں !

کاملانِ دہر کے سینوں میں تھا مسکن مرا
انبیائے عرش کا آغوش تھا گلشن مرا

سوز بن کر قلبِ اسمٰعیلؑ میں پنہاں تھی میں !
خلد زارِ نکہتِ یوسفؑ تھا پیراہن مرا

بربطِ روحِ سلیمانؑ جس سے تھا لبریزِ درد
ایسا پُر تاثیر تھا ہنگامۂ شیون مرا

میں فضائے دہر میں اک آسمانی نغمہ تھی
عصمتِ مریم سے تھا پاکیزہ تر دامن مرا

یک بیک فطرت میں اک ہیجان برپا ہو گیا !
ایک قطرہ چھلکا اور طوفان برپا ہو گیا !

آخری اُمید

مرا ننّھا جواں ہو گا!

کبھی تو رحم پر آمادہ بے رحم آسماں ہو گا!
کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر مہرباں ہو گا!
کبھی تو سر پہ ابرِ رحمتِ حق گُل فشاں ہو گا!
مسرّت کا سماں ہو گا!
مرا ننھا جواں ہو گا!

کسی دن تو بھلا ہو گا غریبوں کی دعاؤں کا
اثر خالی نہ جائے گا، غم آلود التجاؤں کا
نتیجہ کچھ تو نکلے گا فقیرانہ صداؤں کا
خدا اگر مہرباں ہو گا!
مرا ننھا جواں ہو گا!

خدا رکھے جواں ہو گا! تو ایسا نوجواں ہو گا
حسین و کارداں ہو گا! دلیر و تیغ راں ہو گا
بہت شیریں زباں ہو گا! بہت شیریں بیاں ہو گا
یہ محبوبِ جہاں ہو گا!

مرا ننھا جواں ہوگا!
وطن اور قوم کی سو جان سے خدمت کرے گا یہ
خدا کی اور خدا کے حکم کی عزت کرے گا یہ
ہر اپنے اور پرائے سے سدا الفت کرے گا یہ
ہر اک پر مہرباں ہوگا!
مرا ننھا جواں ہوگا!
مرا ننھا بہادر ایک دن ہتھیار اُٹھائے گا!
سپاہی بن کے سوئے عرصہ گاہ رزم جائے گا!
وطن کے دشمنوں کے خون کی نہریں بہائے گا!
اور آخر کامراں ہوگا!
مرا ننھا جواں ہوگا!
وطن کی جنگِ آزادی میں جس نے سر کٹایا ہے!
یہ اُس شیدائے ملت باپ کا پُرجوش بیٹا ہے!
ابھی سے عالمِ طفلی کا ہر انداز کہتا ہے!
وطن کا پاسباں ہوگا!
مرا ننھا جواں ہوگا!
ہے اس کے باپ کے گھوڑے کو کب سے انتظار اس کا
ہے رستہ دیکھتی کب سے فضائے کارزار اس کا

ہمیشہ حافظ و ناصر رہے پروردگار اس کا
بہادر پہلواں ہوگا!
مرا ننھا جواں ہوگا!
وطن کے نام پر اک روز یہ تلوار اٹھائے گا
وطن کے دشمنوں کو کنج تربت میں سلائے گا
اور اپنے ملک کو غیروں کے پنجے سے چھڑائے گا
غرورِ خانداں ہوگا!
مرا ننھا جواں ہوگا!
صفِ دشمن میں تلوار اس کی جب شعلے گرائے گی
شجاعت بازوؤں میں بن کے بجلی لہلہائے گی
جبیں کی ہر شکن میں مرگِ دشمن تھرتھرائے گی
یہ ایسا تیغ راں ہوگا!
مرا ننھا جواں ہوگا!
سرِ میداں جس دم دشمن اس کو گھیرتے ہوں گے
بجائے خوں رگوں میں اس کی شعلے تیرتے ہوں گے
سب اس کے حملۂ شیرانہ سے منہ پھیرتے ہوں گے
تہ و بالا جہاں ہوگا!
مرا ننھا جواں ہوگا!

رات کے فرشتے

ہواؤں میں، رات کے فرشتے، روپہلی پر پھٹ پھٹا رہے ہیں
سکوت کے میٹھے میٹھے لہجوں میں نیند کے گیت گا رہے ہیں

نظام ہستی پہ سربسر غفلتوں کے پردے گرا رہے ہیں
نظر سے نقشے، سروں سے خاکے، دلوں سے باتیں مٹا رہے ہیں

زمین سے آسمان تک ایک مرمریں فرش بچھ رہا ہے
بہار کی چاندنی کے رمنوں میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں

خموش و مدہوش ہیں فضائیں! صدا فراموش ہیں ہوائیں
پروں سے گویا تھپک تھپک کر زمانہ بھر کو سلا رہے ہیں

مناظر کائنات پر اک سکوت کا نشہ چھا رہا ہے
نگاہوں کی شوخ مستیوں سے ہزاروں نیندیں لٹا رہے ہیں

چمن کی کرنوں بھری فضاؤں میں نور کا راستہ بنا کر
کبھی اِدھر اُڑ کے آ رہے ہیں، کبھی اُدھر اُڑ کے جا رہے ہیں

یہی خدا سے کریں گے جا کر شکایتیں سب کی غفلتوں کی
یہی ہمیں لوریاں سنا کر، خدا سے غافل بنا رہے ہیں

اُدھر ستاروں کی بزم میں، زہرہ اپنا بربط بجا رہی ہے
اِدھر یہ پھولوں کی انجمن میں، رسیلے نغمے سُنا رہے ہیں

زمانہ خاموش ہو چکا ہے! خدائی مدہوش ہو گئی ہے
چمن کی خوشبوؤں سے لپٹ کر پری فطرت بھی سو گئی ہے

پردیسی پی کی یاد!

ایک ہجراں نصیب بیوی کی زبانی

خوشا وہ دن کہ دل ناآشنائے لذّتِ غم تھا!
مآلِ عیش کی تلخی کا اندازہ ہمیں کم تھا!
خوشا وہ دن کہ لطف و عیش کے ہم پھول چنتے تھے
خوشا وہ دن کہ یوں تکلیفِ غم سے سر نہ دھنتے تھے

مسرّت موجزن تھی، باغِ عالم کی فضاؤں میں!
خوشی کے خواب رقصاں تھے محبّت کی صداؤں میں!
صدا آتی تھی عشرت کی محبّت کے ترانوں سے
فضائیں جاگ اٹھتی تھیں مسرّت کے فسانوں سے

مگر اب اُن کے جاتے ہی قیامت ہو گئی برپا
جس آفت کا تھا اندیشہ وہ آفت ہو گئی برپا
اسیرِ رنج ہوں، محوِ الم ہوں، نذرِ کلفت ہوں
میں اس دنیا میں اک افسانہ سوزِ محبّت ہوں

کسی کا ہجر ہے، بتیابیاں ہیں اور دل میرا
سیہ راتیں ہیں، اور بے خوابیاں ہیں اور دل میرا

دلِ غمگین میں ارمان مرجھائے ہوئے ہیں سب
پڑی ہے سیج سونی، ہار کملائے ہوئے ہیں سب

ان ہی ہاروں میں پنہاں ہیں مری الفت کے افسانے
وصال و ہجر کے قصّے، غم و راحت کے افسانے

کبھی فرطِ مسرت سے یہ کلیاں مسکراتی تھیں
اور ان کے سامنے اک نغمۂ عشرت سناتی تھیں

مگر اب اس طرح اُجڑا ہے مستانہ سہاگ اُن کا
جگر میں تیر بن کر چبھتا ہے غمگین راگ اُن کا

مرا کیا اس طرح ناشاد ہونا ہی مقدر تھا
الٰہی کیا مرا برباد ہونا ہی مقدر تھا

یہ بھیگی رت، یہ مستانہ ہوا، برسات کا موسم
بہاروں کا سماں، یہ رس بھرے جذبات کا موسم

سُرودِ حیات

بربطِ کائنات پر نغمہ سرا ہے زندگی! | مست نوا ہے زندگی
ذادیٔ مہر و ماہ تک بال کشا ہے زندگی! | جلوہ نما ہے زندگی

جس کی کچھ ابتدا نہیں! جس کی کچھ انتہا نہیں! — جس کو کبھی فنا نہیں

خوابگہِ فضا میں وہ، موجِ صدا ہے زندگی — عکسِ صبا ہے زندگی

موسمِ شعلہ بار میں، دامنِ کشت زار میں — سینۂ کاشت کار میں

بن کے لہو کا اضطراب ہمہمہ زا ہے زندگی — نغمہ سرا ہے زندگی

جام ہیں مختلف تو ہوں، ان میں شراب ایک ہے — بادۂ ناب ایک ہے

سازِ فنا میں مشترک، ایک صدا ہے زندگی — ایک نوا ہے زندگی

رہروِ راہِ ارتقا کے لئے اک مقام ہے — راہزنِ خرام ہے

لے کے عدم سے تا عدم ایک فضا ہے زندگی — راہ نما ہے زندگی

اُس کی ہوائے صبح پر تیر رہی ہے کائنات — مستِ شرابِ حسیات

طائرِ دہر کے لئے، ایک فضا ہے زندگی — ایک ہوا ہے زندگی

نارضامندی کی شادی

بغیر مرضی کی شادی بھی کیا قیامت ہے
یہ عمر بھر کے لئے اک مہیب لعنت ہے

ہے اس کا غم کدہ ہند میں رواج بہت
بغیر مانگے ملا کرتے ہیں یہ تاج بہت

یہ شادی وہ ہے جسے والدین کرتے ہیں
ادا سمجھ کے اسے فرضِ عین کرتے ہیں!

یہ کچھ ضرور نہیں جانبین راضی ہوں
یہ شرط ہے کہ فقط والدین راضی ہوں
کہو اب ان زن و شوہر کا حال کیا ہوگا!
اس ازدواج کا آخر مآل کیا ہوگا؟
تمام عمر رہینِ الم ہوئی کہ نہیں!
تمام زندگی اب صرفِ غم ہوئی کہ نہیں
یہ نوشِ زہر اشراب کوئی پیئے کہ مرے
کوئی بتائے یہ معصوم اب جیئے کہ مرے
یہ شادی آہ جہنم کا راج کہیئے اسے
سریرِ عیش پہ کانٹوں کا تاج کہیئے اسے
یہ شادی کیا ہے فقط تلخیوں کا مخزن ہے
جواں دلوں کی جواں حسرتوں کا مدفن ہے
قدیم دورِ جہالت کا اک شعار ہے یہ
کہ والدین کا ناجائز اختیار ہے یہ
حسین آرزوؤں کا یہ ذبح خانہ ہے
سرودِ درد کا اک دوزخی ترانہ ہے
جواں دلوں کو یہ شادی تباہ کرتی ہے
شگفتہ ہونٹوں کو مصروفِ آہ کرتی ہے

سرورِ زہر ہے یہ نورِ تیرہ فام ہے یہ!
نشاطِ تلخ ہے یہ عشرتِ حرام ہے یہ !
گلوئے عیش میں اک لعنتوں کا ہار ہے یہ
سوادِ ہند میں شیطاں کی یادگار ہے یہ
یہ بادہ وہ ہے کہ جس میں ملا ہوا ہے زہر
یہ شہد وہ ہے کہ جس میں چھپا ہوا ہے زہر
جوان روحوں کی خاموش قتل گاہ ہے یہ
خدا کے نام پہ سب سے بڑا گناہ ہے یہ

ماں

میکسم گورکی کے خیالات کا قلم برداشتہ ترجمہ

وہ کون نغمہ ہے ساری دنیا کے نغمہ ہائے طرب سے شیریں
جو انجمِ آسمان و گل ہائے باغ کا عکس بن رہا ہے!
کوئی بتائے بھلا وہ کیا ہے ؟
زمانے کے اہلِ ذوق میں سے ہر ایک کا یہ خیال ہو گا
کہ وہ محبت ہے جس سے یہ خاکدانِ تیرہ چمک رہا ہے
حریمِ ہستی مہک رہا ہے

وہ چیز، جو آفتاب النہار اُردی بہشت سے بھی!
ہزار درجہ زیادہ روشن ہے، خوبصورت ہے، خوشنما ہے
کوئی بتائے بھلا وہ کیا ہے؟
فلک کے دامن میں میں نے دیکھے ہیں مسکراتے ہوئے ستارے
میں جانتا ہوں کہ چشمِ محبوب سارے پھولوں سے خوشنما ہے
شراب گوں ہے بہار زا ہے
میں جانتا ہوں کہ اس کا اک ہلکا سا دل نشیں تبسم
دل شکستہ کے حق میں کس درجہ مہرانگیز و مہرزا ہے
شگوفۂ لب کا معجزہ ہے
کرشمہ آرائی ہائے احساسِ حسن کے باوجود اب تک
نہ کہہ سکا کوئی شاعر آخر وہ نغمۂ دل پذیر کیا ہے؟
جو سب سے دلکش ہے دلربا ہے
مگر میں کہتا ہوں اب کہ وہ نغمہ —— اور وہ دلگداز نغمہ
جو ساری دنیا کے سارے رنگیں ترانوں کی اصل وابتدا ہے
جو قلب فطرت کا آئینہ ہے
وہ نغمہ — وہ کائنات کا — کائنات کا سحر کار دل ہے
وہ دل کہ جس کا جہان والوں نے پیار سے نام "ماں" رکھا ہے
وہی محبت کی ابتدا ہے وہی محبت کی انتہا ہے

اُن کا خیال

گاگر بھرنے جاتے ہوئے شوہر کی یاد میں

سرِ شام، یوں کسی گہری فکر میں کوئی مستِ شباب ہے
کہ چمن کی گود میں جیسے حورِ بہار مائلِ خواب ہے
ابھی نہر تک بھی نہ آئی تھی، کہ کسی خیال میں کھو گئی!
نہ تو خوفِ آمدِ شام اُسے ہے، نہ فکرِ بندِ نقاب ہے
یہ حسینہ محوِ خیال ہے کہ کہیں حسینہ کی شکل میں!
کسی مست پھول کا جلوہ ہے کوئی کھویا کھویا سا خواب ہے
اسے اپنے حُسن و شباب کے کسی ولولہ کی خبر نہیں
کہ نگاہِ مست کی گود میں کوئی اور مستِ شباب ہے
وہی جس کے وصل میں ایک دن اسے دو جہاں کی خبر نہ تھی
وہی جس کے ہجر میں آج یوں یہ اسیرِ دامِ عذاب ہے
وہی جس کی یاد نے یک بیک اُسے بے قرار سا کر دیا
وہی اس کا اصلِ جمال ہے، وہی اس کا اصلِ شباب ہے
یہ اسی جمال کا رنگ ہے، یہ اسی شباب سے مست ہے
یہ اسی نشہ کی ترنگ ہے، یہ اسی شراب سے مست ہے

عورت

سانیٹ

فنونِ لطیفہ کی دنیا میں

کہیں وہ شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے
مصوّر کی نظر میں اُس کی تصویریں پریشاں ہیں
ادب کی محفلوں میں اس کی تنویریں پریشاں ہیں
مغنّی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہے
نقابِ ساز میں آہنگ ہو کر تھرتھراتی ہے
نقوشِ آب و گِل میں اس کی تعمیریں پریشاں ہیں
صنم سازوں کے دل میں اس کی تفسیریں پریشاں ہیں
حریمِ رنگ و بو میں نشہ بن کر لہلہاتی ہے

ہر اک تصویر کے رنگوں میں نکہت اس کی آوارہ
حسیں اور خوشنما اشعار شاداب اس کے نغموں سے
ہمارے بربطوں کے تار بیخواب اس کے نغموں سے
بتوں کے مرمریں پردوں میں رنگت اس کی آوارہ
غرض جب تک یہ دنیا ہے اور اس کی خوشنمائی ہے
ہماری زندگی پر عرف عورت کی خدائی ہے

مدرسے کی لڑکیوں کی دُعا!

بچیوں کے لئے

یارب یہی دُعا ہے تجھ سے سدا ہماری
ہمت بڑھا ہماری، قسمت بنا ہماری

تعلیم میں کچھ ایسی، ہم سب کریں ترقی
غیروں کی انتہا بھی، ہو ابتدا ہماری.

نفرت بُرائی سے ہو، اُلفت بھلائی سے ہو
رغبت صفائی سے ہو، یہ ہے دعا ہماری

کہنا بڑوں کا مانیں، اچھا بڑوں کو مانیں
سب اپنے جی میں ٹھانیں، یہ ہے رضا ہماری

تیرے کرم کا سایہ، ہر دم ہو سر پہ چھایا
تیری مدد خدایا، ہو رہنما ہماری

ہر علم کے خزانے، پائیں نئے پرانے
اس طرح سے ٹھکانے، محنت لگا ہماری

پڑھ لکھ کے نام پائیں، کچھ کام کر دکھائیں
تیرے حضور میں ہے، یہ التجا ہماری

ساون کی گھٹا

بچیوں کے لئے

مسکراتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی
جی لبھاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

گیت کوئل کے، پپیہوں کی صدا، مور کا شور
گنگناتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

کیوں نہ ہمجولیاں گلزار میں جھولا جھولیں
لہلہاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

کوہساروں کا، خیابانوں کا، گلزاروں کا
مُنہ دھوتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

موجِ نکہت سے خدائی مہک اٹھی اختر!
پھول اڑاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

جھولا

بچیوں کے لئے

آیا ساون کا مہینہ نظر آیا جھولا
دل کو بھایا، مری آنکھوں میں سمایا جھولا

سال بھر رہ کے بہشتوں کی فضا میں پنہاں
ابر کی گود میں بیٹھا ہوا آیا جھولا

چولی دامن کا ساتھ ہے ساتھ گھٹا کا اس کا
اس طرف آئی گھٹا، اس طرف آیا جھولا

رُت ہی جھولے کی نہ کیوں آج خدائی جھولے
ننھی کلیوں کو ہواؤں نے جھلایا جھولا

پینگ بڑھنے لگی، آنچل کو گھٹا کے چھونے
باغ میں سکھیوں نے اس طرح جھلایا جھولا

جھومتی آتی ہیں مستانہ گھٹائیں کیسی!
ڈھونڈ کر ہے انہیں کس دیس سے لایا جھولا

گیت سن سن کے گھٹائیں بھی بہک اٹھی ہیں
مل کے سکھیوں نے کچھ اس دھوم سے گایا جھولا

پھول ہلتے ہیں ادھر، شاخ لچکتی ہے اُدھر
یا بہاروں کو ہے قدرت نے جھلایا جھولا

دور پردیس میں ہم کس کو جھلائیں اختر
حسرت و یاس کا پیغام ہے لایا جھولا

باغوں کی بہاریں

بچّوں کے لئے

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
برکھا کی ہوائیں آ رہی ہیں

پودوں کو صبا ہلا رہی ہے
پھولوں پہ بہار آ رہی ہے

باغوں کی بہار کوئی دیکھے
پھولوں کا سنگھار کوئی دیکھے

جھونکا جو صبا کا آ رہا ہے
سبزہ کیا لہلہا رہا ہے

پھولوں میں بسی ہوئی فضا ہے
خوشبو سے لدی ہوئی ہوا ہے

پودے ہوں کہ پتے دھل گئے ہیں
اور غنچوں کے منہ بھی کھل گئے ہیں

چڑیاں خوش ہیں چہک رہی ہیں
کلیاں کیسی مہک رہی ہیں

باغوں میں بہار آ رہی ہے
ہر شے پہ خوشی سی چھا رہی ہے

نہروں میں بھی آ گئی روانی
برسات کی رت ہے کیا سہانی

خاموش ہوائیں جاگ اٹھیں
موروں کی صدائیں جاگ اٹھیں

کوئل کی بھی آ رہی ہے آواز
گل باغ پہ چھا رہی ہے آواز

بھونرے نے اپنا فسانہ چھیڑا
جھینگر نے ترانہ اپنا چھیڑا

باغوں میں ہوا پکار آئی !
ہنس دو کلیو ! بہار آئی !

ایک لڑکی کا گیت

بچّوں کے لئے

جہاں، چڑیاں گھنیری جھاڑیوں میں چہچہاتی ہوں!
جہاں، شاخوں پہ کلیاں نت نئی خوشبو لٹاتی ہوں!
اور ان پر کوئلیں کوکو کے میٹھے گیت گاتی ہوں!
وہاں میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

جہاں برسات کے موسم میں سبزہ لہلہاتا ہو
ہوا کی چھیڑ سے ایک ایک پتہ تھرتھراتا ہو
جہاں چشموں کا پانی نرم لے میں گنگناتا ہو
وہاں میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

جہاں اونچے پہاڑوں پر گھٹائیں گھر کے آتی ہوں
ہوا کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہوں
اور اپنے نیلگوں ہونٹوں سے موتی سے لٹاتی ہوں
وہاں میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

جہاں، نہروں میں بہتا پانی موتی سا چھلکتا ہو
جہاں، چاروں طرف گلزار میں سبزہ لہکتا ہو

جہاں پھولوں کی خوشبوؤں سے بن کا بن مہکتا ہو
وہاں، میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو
جہاں، پھولوں کی خوشبوؤں سے بن کا بن مہکتا ہو
جہاں، باغوں میں اور کھیتوں میں ہریاول لہکتا ہو
جہاں، ٹیسو کے اک اک پھول میں شعلہ دہکتا ہو
وہاں میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو
جہاں، آموں کے ہوں باغ اور کوئی رکھوالا نہ ہو ہرگز
کوئی کتا بھی مالی نے جہاں پالا نہ ہو ہرگز
اور اماں جی سا کوئی دیکھنے والا نہ ہو ہرگز
وہاں، میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو
الٰہی! میرے دل کی آرزو جلدی سے پوری ہو!
وہاں لے چل جہاں اس فصل میں جانا ضروری ہو!
مری ہو، شملہ ہو، سولن ہو، ڈلہوزی، مسوری ہو!
وہاں، میں ہوں مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

نورجہاں

خدائی نیند میں سرشار ہے، برکھا کا موسم ہے
زمینِ شہدرہ پہ ہر طرف کھویا سا عالم ہے

افق پر منتشر مہتاب کی سرشار لہریں ہیں!
فضا کے دامنوں میں موجزن چاندی کی لہریں ہیں

ردائے آسماں میں ننھے تارے جھلملاتے ہیں
کہ بحرِ نیل میں گلہائے زرّیں کھلکھلاتے ہیں

غبارِ مرمریں سا اُڑ رہا ہے صحنِ ہستی سے
ہوا کی پیالیاں لبریز ہیں پھولوں کی مستی سے

چراغاں ہو رہا ہے چاند کے نیلے شبستاں میں
کہ پریوں نے کہیں موتی بکھیرے ہیں پرستاں میں

چمن کی ہر کلی سے نور کی مستی چھلکتی ہے
در و دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے

رسیلی بو کی موجیں اڑ رہی ہیں سرو و سوسن پہ
نشہ کا سا سماں چھایا ہوا ہے سارے گلشن پر

پرندے سو چکے ہیں جا کے اپنے آشیانوں میں
بھیانک سنسنی سی چھا رہی ہے گلستانوں میں

خموشی کا سماں، اک ہُو کا عالم ہے زمانے پر
سکوں طاری ہے قدرت کے انوکھے کارخانے پر

نہا کر آئی ہیں اِندر کی پریاں عطر کے جل میں
نشے کی موجیں اڑتی پھرتی ہیں سنسان جنگل میں

سکونِ شب سے ہیں ٹھہری ہوئی پانی کی نہریں بھی
کہیں گہرائیوں میں سو چکی ہیں جاگے لہریں بھی
رو پہلی رات پر طاری ہے اندوہِ حسیں کوئی
کہ گہری فکر میں لپٹی ہوئی ہے مہ جبیں کوئی
زمین و چرخ نے چپ سادھ لی ہے ہر صدا چپ ہے
اِدھر اُجلی فضا چپ ہے، اُدھر ٹھنڈی فضا چپ ہے
یہ بھیگی رات، یہ مستانہ رُت، یہ نور کا عالم!
زمرّد فام نخلستاں پہ برقِ طور کا عالم!
ہوا سے ننھی کرنیں کھیلتی ہیں شاخساروں پر
کہ کچھ چینی کی گڑیاں جھولتی ہیں سبز تاروں پر
اسی سنسان نخلستاں میں اک اُجڑی عمارت ہے
جہاں دفن اک شہنشاہِ گرامی کی محبّت ہے
یہاں وہ بانویِ عفت نشاں سوتی ہے تربت میں
کٹی تھی جس کی ساری عمر آغوشِ حکومت میں!
ادب اے دل ادب کر! روضۂ نورِ جہاں ہے یہ
مقدّس خواب گاہِ ملکۂ ہندوستاں ہے یہ

بعض تاریخی تصوّرات

کوئی زائر جب اُس کے مرقدِ انور پہ جاتا ہے
تو اس کو سب سے پہلے وہ زمانہ یاد آتا ہے

جب اُس کا باپ نکلا تھا وطن سے بے وطن ہو کر
چلا تھا ہول صحرا کی طرف زیبِ چمن ہو کر

نکل کر ملک سے اپنے وہ جب قندھار تک پہنچا
لئے بیگم کو ساتھ اک وادئی پُرخار تک پہنچا

تو اس ہیبت فزا جنگل میں اک دختر ہوئی پیدا
قمر کی گود سے اک زہرۂ انور ہوئی پیدا

مگر ماں باپ پر قسمت نے ایسا وقت ڈالا تھا
کہ دل میں درد تھا، آنکھوں میں آنسو لب پہ نالہ تھا

پریشانی کے بادل چھا رہے تھے ان کی قسمت پر
غم و حسرت کے دریا موجزن تھے ان کی حالت پر

نہ سوجھی جب کوئی تدبیر انہیں اُس کی حفاظت کی
تو رکھ لی ہار کر چھاتی پہ سل دونوں نے فرقت کی

لٹا کر چل دیئے آخر اُسے سبزہ کے بستر پر
ستارے رو رہے تھے خون اس غمگین منظر پر

کہ یوں لختِ جگر کو چھوڑ کر جاتا نہیں کوئی!
ذراسی جان کو بے دودھ تڑپاتا نہیں کوئی!
وہ دختر کون تھی؟ اے ملکۂ نورِ جہاں تو تھی!
وہ بے کس کون تھی؟ اے بانوئے ہندوستاں تو تھی!
مگر تقدیر کے آگے کسی کی چل نہیں سکتی
مسرت مٹ نہیں سکتی! مصیبت ٹل نہیں سکتی
یکایک رحمتِ خلاقِ باری جوش میں آئی
دلِ قدرت میں بندوں کی محبت ہوش میں آئی
صدا سن کر ترے رونے کی اک سردار آپہنچا
عقب سے قافلہ کا قافلہ سالار آپہنچا
محبت سے وہ ہاتھوں پر اُٹھا کر لے گیا تجھ کو
تو گویا مرچکی تھی، وہ جلا کر لے گیا تجھ کو
تری معصوم قسمت نے بھی کی پھر یاوری تیری
ہوئی تفویض تیری ماں کو ہی دایہ گری تیری
غرض تو پرورش پانے لگی قصرِ حکومت میں
بسر ہونے لگی طفلی تری دامانِ راحت میں
یونہی آپہنچی جب طفلی تیری حدِ جوانی میں
شباب اک موج بن کر اُٹھا بحرِ زندگانی میں

تو شادی کر دی شاہنشہ نے تیری شیر افگن سے
خوشی کا غلغلہ اُٹھا نوا سنجانِ گلشن سے

مگر کچھ دن میں لایا رنگ یہ چرخِ کہن آخر
کہ غارت ہو گئی تیری خوشی کی انجمن آخر

زمانے نے لباسِ بیوگی پہنا دیا تجھ کو
مسرت زار سے غم خانہ میں پہنچا دیا تجھ کو

نگاہوں سے تصوّر اک نیا پردہ اُٹھاتا ہے!
تجھے ملکہ بنا کر قصرِ شاہی میں بُلاتا ہے!

جہانگیر اک طرف مصروف ہے صہبا پرستی میں
لگائے ساغرِ مے لب سے، ہے سرشار مستی میں

اِدھر مشغول ہے تو انتظامِ ملک و دولت میں
اُمورِ سلطنت میں، اور مہماتِ سیاست میں

حکومت کر رہی ہے عقل و دانش کے سہارے پر
مدبّر ناچتے ہیں تیرے اک ادنےٰ اشارے پر

کچھ اس انداز سے چھیڑا حکومت کے ترانے کو
شہنشہ کی ضرورت ہی نہیں گویا زمانے کو

یہ نیرنگِ تصور ہے کہ اک خوابِ پریشاں ہے
فضائے شہدرہ میں جیسے تو اب بھی خراماں ہے

جلو میں تیری کم سن لڑکیاں زہرہ شمائل ہیں!
زمیں کو آنکھوں آنکھوں میں اُلٹ دینے پہ مائل ہیں
یہ پریاں ہیں جو بہر سیر نکلی ہیں گلستاں سے
کہ کچھ حوریں اُتر کر آگئی ہیں باغ رضواں سے
بلا کی شوخیاں ہیں ان پری وش نازنینوں میں
کسی نے بجلیاں بھر دی ہیں گویا آبگینوں میں
یہ کم سن حسن کی چڑیاں مگن ہیں رنگ رلیوں میں
کہ تیرے سحر لب سے پڑ گئی ہے جان کلیوں میں
بہار آئی فضا میں گونجتے ہیں قہقہے اُن کے
خمار آگیں ہوا میں اُڑ رہے ہیں چہچہے ان کے
کبھی یہ کھیلتی ہیں آکے راوی کے کناروں پہ
کبھی یہ لوٹتی ہیں بے خودی میں سبزہ زاروں پر
زمیں پر ہے شرابِ حُسن کا طوفان سا برپا
فضا میں ہے بہار ناز کا ہیجان سا برپا
برس جاتی ہیں پنکھڑیاں وہ جس دم بات کرتی ہیں
لبوں کی سُرخ قینچی سے ہزاروں گل کترتی ہیں
دو لعلِ آبدار و صد ہزاراں گل فشانیہا!
دو چشم کیف بار و صد ہزاراں مُل چکانیہا

تصور اس تماشا زار میں جی بھر کے رونے دے
مجھے اک اک کرن کی تار میں موتی پرونے دے

یکایک دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدلتا ہے
نیا عالم نکلنے پر نیا عالم نکلتا ہے

ادھر تو اور جہاں گیر اک طرف خاموش بیٹھے ہیں
شرابِ عشق سے سرشار او رمدہوش بیٹھے ہیں

ترے ہاتھوں میں اک زرین جامِ نور افشاں ہے
کہ آغوشِ سحر میں ایک خورشیدِ درخشاں ہے

کبھی تو بھر کے ساغر اپنے ہاتھوں سے پلاتی ہے
کبھی حالت پہ اُس کی دل ہی دل میں مسکراتی ہے

دلِ میکش میں اب ارماں کوئی باقی نہیں ہوگا!
کہ جنت میں بھی تجھ سا نازنیں ساقی نہیں ہوگا

کبھی مدہوش سلطاں دیکھتا ہے پیار سے تجھ کو
نگاہِ حسرت آلود و تمنا بار سے تجھ کو

عبث دنیا میں کیوں بدنام اُس کی مے پرستی ہے
شہنشہ جس سے ہے مخمور وہ کچھ اور مستی ہے

وہ مستی کیا ہے بہتیرے دیدۂ میگوں کی سرشاری
یہیں سے ملتی رہتی تھی اسے تعلیمِ مے خواری

تخیل اس نظر آباد میں کروٹ جو لیتا ہے
تصور ہاتھ سے ماضی کا دامن چھوڑ دیتا ہے

تو میں ہوتا ہوں تنہا اور تیری قبر ہوتی ہے
دلِ غم آشیاں کو جستجوئے صبر ہوتی ہے

اسی حالت میں اپنی آنکھ سے موتی لٹاتا ہوں
تری سرکار میں کچھ دُکھ بھرے نغمے سناتا ہوں

کہ تیرے غم میں ہیں ٹھنڈی ہوائیں بیقرار اب تک
تری فرقت میں ہیں باغوں کے لالے داغدار اب تک

یہاں کی ہر کلی، ہر پھُول اک تصویر ہے تیری
تُو ہے اک خواب اور یہ گل زمیں تعبیر ہے تیری

تری راتیں ابھی تک سو رہی ہیں سبزہ زاروں میں
تری باتیں ابھی تک گونجتی ہیں جوئباروں میں

جو خوشبو کھیلتی رہتی تھی اک دن تیری کاکل سے
وہی اب جھلکی پڑتی ہے یہاں کے لالہ و گل سے

چمن بکھرا ہوا اک خواب تری زندگانی کا!
کلی بگڑا ہوا اک نقش تیری نوجوانی کا

ادیبوں کی زباں پر آج تک تیرے فسانے ہیں
لبِ شاعر پہ اب تک تیری عظمت کے ترانے ہیں

تری موزونیٔ طبع خداداد ایسی حالت تھی!
جسے سن سن کے خود تخئیل فطرت کو بھی حیرت تھی
نہیں دیکھا کبھی تاریخِ ہستی نے خدائی میں
کہ شوہر کی جگہ بیوی نے لی فرمانروائی میں
تری تیمارداری کرتی تھی بیمار کو اچھا
مریضِ عشق اُس شاہنشۂ مے خوار کو اچھا
دلیروں کی دلیری تیرے آگے سرد ہوتی تھی!
تری تلوار سے شیروں کی شیری گرد ہوتی تھی!
ترے دیدار کا ہے منظروں میں اضطراب ابتک
زمیں کا ذرّہ ذرّہ دیکھتا ہے تیرے خواب ابتک
تری خوشبو مہکتی ہے ابھی تک غنچہ زاروں میں
ترے نغمے مچلتے ہیں ابھی تک آبشاروں میں
غمستانِ جہاں میں تُو مجسّم اک تبسّم بھی
سکوتِ آبادِ ہستی میں سراپا اک ترنّم تھی
ترے جلوے ہیں وجہ زینتِ رنگِ لبِ آب تک
غبارِ قبر تیرا رونقِ ذوقِ مئےناب تک
نوازا یہ جہاں میں تُو وفا کا ساز تھی گویا
کہ سازِ عشق کی اک جاندار آواز تھی گویا

سپہرِ حکمرانی کا تجھے ماہِ مبیں کہئے
حکومت کی جہاں افروز خاتم کا نگیں کہئے
دلِ غم دیدہ کے حق میں تو اک سازِ مسرت تھی
جہانگیر ابنِ اکبر کا، تو اک خوابِ محبت تھی
تری نکہت سے پتہ پتہ جنگل کا لہکتا تھا
تری خوشبو سے قطرہ قطرہ رادہی کا مہکتا تھا
تجھے باغِ حرم کی بلبلِ رنگیں نوا کہئے
تجھے فطرت کی اک محبوبۂ شیریں ادا کہئے
بہارِ آفرینش تھی شبابِ زندگانی تھی!
جواں فطرت کا اک کھویا ہوا خوابِ جوانی تھی
تو جانِ عاشقی! کانِ وفا! شانِ حکومت تھی!
تری سب سے بڑی توصیف یہ ہے ایک عورت تھی
زمانہ جانچتا رہتا ہے سچے آشناؤں کو
ہمیشہ یاد رکھے گا تری خالص وفاؤں کو
ہوئی مر کر بھی خوابیدہ تو شوہر ہی کے پہلو میں
جگہ پائی جہانگیر ابنِ اکبر ہی کے پہلو میں
چمن میں بلبلیں برسات میں جب گیت گاتی ہیں
حسینانِ چمن کو رس بھرے نغمے سناتی ہیں

ہزاروں پھول کھل جاتے ہیں جس دم لالہ زاروں میں
جب آجاتی ہے بارش سے روانی جوئباروں میں
سپہر نیلگوں پر جب ستارے جگمگاتے ہیں
کسان اپنے گھروں کو لوٹ کر کھیتوں سے آتے ہیں
سرِ شام اک خموشی ہوتی ہے طاری مکانوں میں
پرندے جا کے سو جاتے ہیں جس دم آشیانوں میں
سحر کو جب ہزاروں ننھی چڑیاں چہچہاتی ہیں
ہوا کی چھیڑ سے منہ بند کلیاں مسکراتی ہیں
غرض دنیا میں اک اک رسم جس دم رنگ لاتی ہے!
زمینِ شہدرہ تیرے لئے آنسو بہاتی ہے!

وادیِ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیِ گنگا ترے شاداب نظارے
یہ بکھرے ہوئے پھول، یہ نکھرے ہوئے دھارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے

یہ چاندنی رات، اور یہ پُرخواب فضائیں!

اک موج طرب کی طرح بے تاب فضائیں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں
مہکے ہوئے نظارے ہیں، بہکے ہوئے تارے

یہ تارے ہیں یا نور کے میخانے ہیں آباد
معصوم و حسیں حوروں کے کاشانے ہیں آباد
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں آباد
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے

مہتاب ہے، یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی مے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں
گلزار ہیں گل ریز، گہر بار ہوائیں
ہیں نور میں ڈوبی ہوئی سرشار ہوائیں
یا بالِ فشاں مستیٔ نکہت کے نظارے

صحرا ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی پُرکیف بہاروں کے شبستاں
شاعر کو تمنّا ہے یہیں رات گزارے

شبِ برات!

لئے ہجومِ تجلّی شبِ برات آئی
ہزار ماہ فدا جس پہ ہوں وہ رات آئی

یہ رات آئی کہ آیا سعادتوں کا ہجوم
کہ بامِ عرش سے موجِ تجلیات آئی

عُروجِ بخت کا مُژدہ ہو اہلِ ایماں کو
کہ آج دولتِ کونین اُن کے ہات آئی

زمیں سے چرخ تلک نورِ قدس رقصاں ہے
وہ رات جس کو کہیں شمعِ کائنات آئی

بجا ہے گر دلِ اختؔر ہلاکِ سجدہ ہو!
کہ آج سجدہ گہِ روحِ شش جہات آئی!

ایک سہیلی کی یاد!

سُسرال میں

گھر کے دھندوں سے ذرا فرصت اگر پاتی ہوں میں
اپنی حسن آرا ترے خوابوں میں کھو جاتی ہوں میں

اس نئی دنیا میں جس دم، یاد آجاتی ہے تُو!
دو گھڑی کو اور سب کچھ بھول سی جاتی ہوں میں

جب نہیں ہوتا تصور میں کوئی آ کر مخل
بے خودی میں دوڑ کر تجھ سے لپٹ جاتی ہوں میں

آنکھ میں پھر جاتے ہیں بچپن کے وہ میٹھے سمے
اور اُن کے دل نشیں جلوؤں میں کھو جاتی ہوں میں

وہ رضیہ، خالدہ اور صادقہ کی صحبتیں
آج جن کے دیکھنے کو بھی ترس جاتی ہوں میں

اور ہاں لو، کیسی بھولی ہوں مری زہرہ بتول
جس کی شوخی یاد کر کے اب تڑپ جاتی ہوں میں

جب کہ ہم سب ساتھ مل کر کھیلتے تھے کوئی کھیل!
خواب میں بھی جس کا نقشہ اب نہیں پاتی ہوں میں

یاد آتا ہے وہ جانا سوئے مکتب ساتھ ساتھ
اک خوشی سی دل میں اب بھی موجزن پاتی ہوں میں
الغرض تنہائی میں جب یاد آجاتی ہو تم!
پھر سے اس بچپن کی دنیا میں پہنچ جاتی ہوں میں
تو نے لیکن بے مروّت خط تلک بھیجا نہیں
جب خیال آتا ہے دیوانی سی ہو جاتی ہوں میں
روز کہتی ہوں کہ اب آتا ہے حُسن آرا کا خط
روز لیکن نا اُمیدی کی خبر پاتی ہوں میں
نوج کوئی اپنے دل کو اس طرح پتھر بنائے!
جس میں اِک ذرّہ بھی نرمی کا نہیں پاتی ہوں میں
تجھ سے ایسی بے وفائی کی کسے اُمید تھی!
آسماں کو دیکھ کر خاموش رہ جاتی ہوں میں
ساس نندوں سے چھپا کر دیکھتی ہوں ڈاک جب
اور اُس میں کوئی خط تیرا نہیں پاتی ہوں میں
آنکھ میں آنسو بھر آتے ہیں وفورِ یاس سے
گرچہ اُن کو آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جاتی ہوں میں
جمع ہو جاتی ہیں جس دم چار ملنے والیاں
تیری فرقت کے اثر سے بُت سی بن جاتی ہوں میں

کھانا بھاتا ہے نہ پینا جب سے تجھ سے دُور ہوں
خونِ دل پیتی ہوں میں، لختِ جگر کھاتی ہوں میں
دیکھتی ہوں لڑکیوں کو جس دم اُٹھتے بیٹھتے!
تیری فرقت کے اثر سے بُت سی بن جاتی ہوں میں
زہر لگتا ہے مجھے اوروں کا ہنسنا بولنا!
جب سے تیرے غم میں دل کو مُبتلا پاتی ہوں میں
میں نہ سمجھی تھی تجھے، تو اس قدر بے درد ہے
اچھی اب تو اپنے جینے سے بھی گھبراتی ہوں میں
جانتی ہوں تیرا پیارا خط نہ آئے گا کبھی
ہائے اس نادان دل کو پھر بھی سمجھاتی ہوں میں
روز کے صدموں سے تنگ آکر بھلا تو دوں تجھے!
لیکن اپنے دل پہ کچھ قابو نہیں پاتی ہوں میں
فرطِ غم سے سُوکھ کر آنسو کہاں سے لائیں گی!
آہ! اب تو اپنی آنکھوں سے بھی شرماتی ہوں میں
تیری فرقت میں کسی پہلو نہیں آتا ہے چین!
گرچہ اس کم بخت دل کو لاکھ سمجھاتی ہوں میں
اور کچھ کہتی نہیں عذرا یہ تبلادے فقط!
اچھی حسن آرا کبھی تجھ کو بھی یاد آتی ہوں میں

پنہاریاں

گیت

پنگھٹ پر، پنیا بھرن کو آئی ——— پنہاری!
پنگھٹ پر!

روپ انوکھا سج دھج نیاری مد بھری انکھیاں ہیں متواری
سُندر مورت پیاری پیاری

پنگھٹ پر، پنیا بھرن کو آئی ——— پنہاری!

گورے گورے ہات سجیلے کالے کالے نین نشیلے
میٹھے میٹھے ہونٹ رسیلے

پنگھٹ پر، پنیا بھرن کو آئی ——— پنہاری!

چاند سا مکھڑا، بالی عمریا! دیکھنے والے بھول ہیں ڈگریا
نازک کندھا، بھاری گگریا!

پنگھٹ پر، پنیا بھرن کو آئی ——— پنہاری!
پنگھٹ پر!

انجامِ ہستی

بہشت زارِ نظر اک حسین منظر ہے
اور اس کی گود میں اک حورِ ماہ پیکر ہے
بہارِ شام کا اک مستقل نظارہ ہے
سپہرِ حُسن کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے
غرض وہ کچھ بھی ہے اک نوجوان عورت ہے
کمالِ صنعت و فطرت کی جان عورت ہے
وہ اس طرب کدے میں سیر کرنے آئی تھی
بہارِ گل کی کشش، گھر سے کھینچ لائی تھی!
نگاہیں کر رہی تھیں جذب کیفِ منظر کو!
کہ اُس نے دیکھ لیا ایک کاسۂ سر کو
جھجک کے رہ گئی نیرنگِ آرزو ہو کر!
ٹھٹک کے رہ گئی آہنگِ جستجو ہو کر!
اور اب کھڑی ہوئی حسرت سے دیکھتی ہے اُسے
عجیب دیدۂ عبرت سے دیکھتی ہے اُسے
اِدھر ہوائے نوازِ پرشور کرتی ہے!
اُدھر وہ دل میں کچھ اس طرح غور کرتی ہے

کہ "یہ نہ جانے کس انسان کا کاسۂ سر ہے
الٰہی کس قدر اندوہناک منظر ہے!
پڑا ہے خاک پر نام و نشاں کچھ بھی نہیں
عزیز، دوست، مکاں جسم جاں کچھ بھی نہیں
شباب و حسن پہ ہوگا کبھی غرور اسے
شراب عیش کا ہوگا کبھی سرور اسے
کبھی ہماری طرح یہ بھی نازنیں ہوگا!
حسین ہوگا اور اتنا کہ مہ جبیں ہوگا
مچلتا ہوگا انہی گالوں پر شباب کبھی
ابلتی ہوگی انہی آنکھوں میں شراب کبھی
مگر اب اس میں وہ پہلی سی کوئی بات نہیں
جہاں میں آہ! کسی چیز کو ثبات نہیں
نصیب تھے کبھی زرّیں پیرہن اس کو
ملا نہ بعدِ فنا ایک گز کفن اس کو
ستم نصیب کا کوئی مزار بھی تو نہیں!
مٹا ہے اتنا کہ باقی غبار بھی تو نہیں
مرا بھی ایک دن ایسا ہی حال ہونا ہے
مجھے بھی اس کی طرح پائمال ہونا ہے

یہ جسم جس میں شباب آج لہلہاتا ہے
یہ جسم جس کو حجاب آج گدگداتا ہے
یہ آنکھیں جن میں جواں مستیاں جھلکتی ہیں
یہ ہونٹ جن میں شرابیں پڑی چھلکتی ہیں
یہ حُسن آج جو اس طرح جگمگاتا ہے!
جو ساری بستی میں اک آگ سی لگاتا ہے
لباس جس سے یہ کُل وادیاں مہک جائیں
یہ بال جن سے کُل آبادیاں بہک جائیں
خدا ہی جانے کہ کل ان کا حال کیا ہوگا؟
مجھے خبر نہیں میرا مآل کیا ہوگا؟
جفائے مرگ سے محفوظ اگر خدا کر دے
مجھے فنا گہِ ہستی میں لافنا کر دے
وہ حُسن بخش دے جس کو کبھی زوال نہ ہو
وہ جسم بخش دے جس کا کبھی یہ حال نہ ہو
مگر محال ہے یہ آرزو زمانے میں
فقط فنا ہی کی باتیں ہیں اس فسانے میں
کہاں نہیں ہے فنا، ہاں کہاں نہیں ملتی
کسی کو زندگیِ جاوداں نہیں ملتی

زمانہ کیا ہے تخیل کا کارخانہ ہے
مصورانِ فنا کا نگار خانہ ہے
تضاد خانہ افکارِ اوج و پستی ہے
شہود زارِ طلسماتِ مرگ و ہستی ہے
یہ وہ گھروندا ہے جس کو کبھی قیام نہیں
یہ وہ کھلونا ہے جس کو کبھی دوام نہیں
نمودِ گُل سے بھی ناپائدار ہے دُنیا!
طلسم خانۂ برق و شرار ہے دُنیا!
قیامِ دہر کی حالت حباب کی سی ہے!
ہماری زندگی اک مست خواب کی سی ہے
یہاں کے رنج، یہاں کی مسرتیں فانی!
یہاں کے حسن، یہاں کی محبتیں فانی!
یہ وادی و دمن و کوہسار کے منظر!
یہ سبزہ و چمن و جوئبار کے منظر!
یہ دل فریب سمے مٹنے کے قریب ہیں سب
یہ جاں فروز مناظر فنا نصیب ہیں سب
یہ سُرخ و زرد نئے موسم بہار کے پھول
یہ لالہ زار کے پھول اور بنفشہ زار کے پھول

یہ زندگی کے صحیفے بکھرنے والے ہیں
یہ جتنے زندہ ہیں اک روز مرنے والے ہیں
جہاں کے رنج و تعب راحت و طرب فانی
فقط خدا کو بقا! اور باقی سب فانی
فنا کے راز کی دنیا کو کچھ خبر ہی نہیں
یہ شام وہ ہے کہ جس کی کوئی سحر ہی نہیں
فنا اک آئینۂ شور زارِ ہستی ہے
یہ وہ سکون ہے جو پردہ دارِ ہستی ہے
شکستِ زمزمۂ سازِ زندگانی ہے
کتابِ عمر کی اک آخری کہانی ہے
یہ وہ شراب ہے جس کا کوئی خمار نہیں
یہ نشہ وہ ہے کہ جس کا کوئی اُتار نہیں
اجل کے ہات میں انسان اک کھلونا ہے!
جسے کبھی نہ کبھی دن تباہ ہونا ہے!
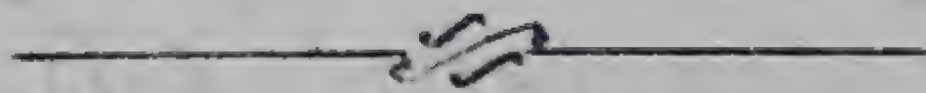
دیکھ اے کنول کے پھول

دیکھ اے کنول کے پھول مرے نورِ دیدہ کو میرے بہشتِ دل کے گُلِ نورسیدہ کو
اس پیکرِ بہار کو! دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول!

دیکھ اے کنول کے پھول مرے مہ جمال کو میرے ریاضِ عمر کے رنگیں نہال کو
اس پیکرِ بہار کو! دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

تجھ میں یہ رنگِ حُسن کی گلکاریاں کہاں جو اس میں ہیں وہ تجھ میں سمن باریاں کہاں
ہاں! میرے گلعذار کو! دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول!

معصومیت کے عرش کا یہ اک فرشتہ ہے سرتا بپا جمالِ محبت سرشتہ ہے
اس ماہِ در کنار کو! دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول!

شامِ بہارِ حُسن کا روشن ستارہ ہے باغِ اُمید کا گلِ رنگیں نظارہ ہے
اس حسنِ پر بہار کو! دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول!

اے پھول تجھ میں اس کی سی بو باس ہے کہاں؟ بتلا تو ایسا تاج ترے پاس ہے کہاں؟
اس ننھے تاجدار کو! دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

تیری طرح کھلے گا چمن زارِ دہر میں! پھولے پھلے گا گلشنِ اسرارِ دہر میں
اس نکہت بہار کو! دیکھ اے کنول کے پھول! دیکھ اے کنول کے پھول

عورت اور پھول

(موازنہ)

عورت :-

"معطر ہو رہی ہے کُل فضائے گلستاں تجھ سے
منور ہو رہا ہے ظلمت آبادِ خزاں تجھ سے
لطافت تیری رنگت میں، نزاکت تیری نکہت میں
حقیقت میں عبارت ہے بہارِ گلستاں تجھ سے
طلوعِ ماہ ہو جس طرح تاریکیٔ صحرا میں
یوں ہی سرمست و روشن ہے حریمِ بوستاں تجھ سے
مگر اے پھول مجھ کو دیکھ کر شاعر یہ کہتے ہیں
کہ میرے یاسمیں لب ہیں سراسر ارغواں تجھ سے
بتا کیا تجھ میں بھی ہے جلوہ پرور ایسی شادابی!
جو بحرِ رنگ و بو کی موج بن کر ہے عیاں تجھ سے
مری صورت سے بھی کیا ایسی ہی شوخی ٹپکتی ہے
جو ہے سیلِ بہارِ دتازگی بن کر رواں تجھ سے
مرے ہونٹوں پہ بھی ہے کیا تبسم کی یہ گل کاری
جو نقشِ رنگ کی صورت میں ہے مستی چکاں تجھ سے

یہ سن کر پھول نے اپنی زبانِ بے زبانی سے
کہا "اے رونقِ بزمِ بہارِ گلستاں تجھ سے
سپہرِ نیلگوں پر ہیں ستارے مدح خواں تیرے
فضائے باغ میں ہے موجِ بوئے گل رواں تجھ سے
سراپا اک شعاعِ حُسن ہے تُو بزمِ خاکی میں
لطافت اخذ کرتا ہے چراغِ آسماں تجھ سے
جہاں میں زینت افروزِ گلستانِ جہاں تُو ہے
عبارت، پیکرِ شادابیٔ باغِ جہاں تجھ سے
نوائے زہرہ گم ہے، تیرے نغموں کی فضائیں میں
نزاکت سیکھتا ہے خندۂ حُورِ جناں تجھ سے
ترے خوابوں میں تارے رات بھر سرشار رہتے ہیں
گلستاں میں ہے آغوشِ سحر نکہت فشاں تجھ سے
تو سازِ دہر کا نہ جانے کیا اسرارِ مستِ نغمہ ہے
کہ موسیقی کے لب پر سیلِ نغمہ ہے رواں تجھ سے
اُفق پر صبح کی پہلی کرن جب مسکراتی ہے
سبق لیتی ہے بیداری کا روحِ گلستاں تجھ سے
ترے گیسوئے مشکیں، موجِ نکہت کے شبستاں میں
مہکتی ہے فضائے سادہ آبادِ جہاں تجھ سے

چمن زارِ جہاں میں طوطیٔ رنگیں نوا ہے تو!
ہے زندہ لطفِ عیشِ زندگی کی داستاں تجھ سے
کہاں میں اور کہاں تو، ذرّہ میں، مہرِ درخشاں تو
جو امرِ واقعی ہے میں وہ کرتا ہوں بیاں تجھ سے
تری صورت تو مجھ سے بڑھ کے شادابی کا پیکر ہے
بجا ہے گر ہو شرمندہ بہارِ گلستاں تجھ سے
مجھے اس پر ہزاروں افتخار و ناز ہیں سلمےٰ!
کہ نسبت دے رہی ہے مجھ کو شاعر کی زباں تجھ سے"

ایک عزیزہ کی شادی پر!
سسرال جاتے ہوئے دعا

اُمید دل میں، نگاہوں میں نور بن کے رہو
حریمِ رُوح میں رُوحِ سرور بن کے رہو
بہشتِ زارِ معیشت میں حُور بن کے رہو

تمھیں نصیب ہوں کُل رحمتیں خدائی کی!
خدا کی رحمتیں اور راحتیں خدائی کی!

نگاہِ دہر میں رنگِ غرور بن کے رہو

Lubna Ali Hameed M.A (Pre)

ہمارے دل کی دعا کو قبول ہونا تھا
تم اک کلی نہیں جسے کھل کے پھول ہونا تھا
جہاں رہو، گُل نُور و سرور بن کے رہو

حیاتِ نو کی یہ زریں فضا مبارک ہو
عُروج زندگی کی ابتدا مبارک ہو
کمالِ آرزوئے شمعِ طور بن کے رہو

حریمِ زندگی روشن ہو سر بسر تم سے
سوادِ محفلِ عفّت ہو جلوہ گر تم سے
جہاں میں ماہِ صفت سیلِ نور بن کے رہو

حیات و حرمت و مہر و وفا کی جان بنو
حجاب و عصمت و شرم و حیا کی کان بنو
بہارِ حُسنِ طرب کا وفور بن کے رہو

نئے عزیز تمہیں رحمتِ خدا سمجھیں
تمہارے سایہ کو بھی سایۂ ہُما سمجھیں
سحابِ فضلِ خدائے غفور بن کے رہو

تمہاری ذات سے اپنوں کے دل کو راحت ہو
نہ صرف اپنوں کو غیروں کو بھی مسرّت ہو
پسندیدہ نکہتِ نزدیک و دور بن کے رہو

چمن میں بلبلِ بیدل ترانہ افشاں ہے
کہ ہو عزیزوں سے رخصت خدا نگہباں ہے
نشانِ رحمتِ ربِّ غفور بن کے رہو

نظامِ اختری جب تک شعاع بار رہے
تمہارے باغ میں شادابئ بہار رہے
دعا ہے سب کے دلوں میں سرور بن کے رہو

عورت اور پردہ

پردۂ برگِ گُلِ تر میں ہے نکہت پنہاں
دلِ انساں میں ہے جذبِ محبت پنہاں
ظلمتِ بحر میں ہے گوہرِ رنگیں مستور
پردۂ قبر میں ہے چشمۂ شیریں مستور
حُسنِ فطرت ہے گلستاں کی بہاروں میں نہاں
نغمۂ روح فزا ساز کے تاروں میں نہاں
لعل پنہاں ہے اگر کان کے گنجینے میں!
برق رخشاں ہے نہاں ابر کے آئینے میں
جب ہر اک طرفہ لطافت ہو نہاں پردے میں
پھر بُرا کیا ہے جو عورت ہے نہاں پردے میں

نویدِ عید!!!

فلک پر پھر ہلالِ عید محوِ نور باری ہے
فضائے دہر پر اک جلوۂ مستانہ طاری ہے
افق پر نکہت و مستی کا اِک طوفان برپا ہے
بہارِ رنگ و بو کا چار سو ہیجان برپا ہے

ہلالِ عید کے آغوش میں اک حور بیٹھی ہے
حریمِ زر میں گویا اک عروسِ نور بیٹھی ہے
حسین و نازنیں کہیئے اُسے زہرہ جبیں کہیئے
سراپا پیکرِ مستیٔ بوئے یاسمیں کہیئے
تلاشِ نغمۂ رنگین میں صرفِ تخیل ہے
سوادِ شام کے عالم میں مصروفِ تامل ہے
وہ نغمۂ چاہتی ہے جس سے دنیا مست ہو جائے
اور اس کی مستیوں میں محفلِ آفاق کھو جائے
ملی ہے نو بہارِ عیش و عشرت کی نوید اس کو!
اور اس دنیائے غم میں کہتے ہیں سب لوگ عید اس کو

شوہر کے تابوت پر

خاک میں چھپ جائے گی صورت تمہاری ہائے ہائے
میری قسمت میں لکھی تھی یہ بھی خواری ہائے ہائے
اپنی رخصت کا ابھی سے دل کو گر دینا تھا غم
پہلے کر لینی تھی کچھ دن غم گساری ہائے ہائے
آسماں! او آسماں! بیدرد! کچھ انصاف کر
یہ دلِ نازک مرا یہ زخم کاری ہائے ہائے

کس لئے مرجھا گئے ہنستے ہوئے ہونٹوں کے پھول
مرنے والے کیا ہوئی وہ لالہ کاری ہائے ہائے
آہ جن آنکھوں میں بستی تھی تری صورت کبھی
اب وہی آنکھیں ہیں صرفِ اشکباری ہائے ہائے
داغِ دل کس کو دکھائیں ، دردِ دل کس سے کہیں
کون سنتا ہے جہاں میں آہ وزاری ہائے ہائے
شمعِ تربت کی طرح اے کاش میں بھی جل بجھوں
تیرے غم سے کس قدر ہے شرمساری ہائے ہائے

لیلائے شب

چمن میں لیلائے شب، ہواؤں کی گود میں سوتی آرہی ہے
بہار کے خوابِ ناز کا خوشگوار پیغام لارہی ہے
سفید برّاق بادلوں کا روپہلی گہوارہ سا بنا ہے!
افق کی دھندلی فضا بھی جس کے سرو پہ جگمگا رہی ہے
سیاہ ساری پہ سینکڑوں زرفشاں ستارے جڑے ہوئے ہیں
جو اس کے گلفام جسم کو اپنی ظلمتوں میں چھپا رہی ہے
کچھ ایسی دلکش ادائیں برتی گئی ہیں بے باک چتونوں میں
فضا کی رنگینیوں پہ جیسے کوئی پری اُڑتی آرہی ہے

کوئی ہو غافل کہ ہوش میں ہو کسی کی پروا نہیں ہے اس کو
زمیں پہ تاریکیاں بچھاتی ہوئی دبے پاؤں آ رہی ہے
جبیں پہ خاموش اک تبسّم، لبوں پہ مدہوش اک ترنّم
کہ جیسے کوئی کلی ہواؤں کی چھیڑ سے مسکرا رہی ہے
ہوائیں خاموش ہو چکی ہیں، فضائیں مدہوش ہو چکی ہیں
مگر وہ اب تک برابر اپنے سکوت کے گیت گا رہی ہے
غرض یونہی سوتی اور سلاتی، نشے پلاتی، ترانے گاتی
ہوا کی پریوں کے ساتھ اپنی سواری آگے بڑھا رہی ہے
سرک کے چہرہ سے اس کا آنچل کمر تلک کھل کے اڑ رہا ہے
حیا کی تاثیر گھٹ رہی ہے، برہنگی بڑھتی جا رہی ہے
جو کھل گئی پوری ساری لے لے گا گود میں آفتاب اس کو
سنہری کرنوں کی روشنی کا لے گا زرّیں حجاب اس کو

اندھی لڑکی!

آسماں پر ہیں گھنیری بدلیاں چھائی ہوئی!
نیلگوں پریاں اڑی جاتی ہیں گھبرائی ہوئی!
سارے عالم پر ہے اک گہرا نشہ پھیلا ہوا
ساری دنیا پر ہے اک دوشیزگی چھائی ہوئی

ساحلِ دریا کا منظر کس قدر دلچسپ ہے
جس پہ گرتی ہے نگاہِ شوق للچائی ہوئی
ایک اک ذرّہ پہ ہیں رنگینیوں کی بارشیں
ایک اک پتّی پہ ہیں شادابیاں چھائی ہوئی
اس بہارستان کے دامن میں ہے محوِ خرام
ایک محرومِ نظر، دوشیزہ گھبرائی ہوئی
سینہ پر معصومیت کا نور، مہتاب آفریں
چہرہ پر دوشیزگی کی سرخیاں چھائی ہوئی
سینہ و بازو پہ عریانی کے جلوے موجزن
شانہ و گردن پہ کافر زلف بکھرائی ہوئی!
ایک لکڑی کے سہارے ہاتھ میں پانی لئے
آرہی ہے ساحلِ دریا سے گھبرائی ہوئی
چاند سے سینہ میں اک ننھا سا دل دھڑکا ہوا
پھول سے گالوں پہ اک افسردگی چھائی ہوئی
پاؤں رکھتی ہے کہیں، جلدی میں پڑتا ہی کہیں
سبزہ پر مچلی ہوئی ٹھوکر ہے گھبرائی ہوئی
راستے میں سوچتی جاتی ہے دل ہی دل میں یوں
مجھ پہ فطرت کی یہ کیسی ظلم فرمائی ہوئی

آج کے دن کیوں نہ حاصل ہو گئیں آنکھیں مجھے
آج کے دن کیوں نہ حاصل ان کو بینائی ہوئی
اک اندھیرے کے سوا کچھ بھی نظر آتا نہیں!
چارسو ہے دھندلی دھندلی سی گھٹا چھائی ہوئی
آہ! لیکن یہ ہوا، یہ شام کی ٹھنڈی ہوا!
کہہ رہی ہے جنگلوں پر ہے بہار آئی ہوئی
آ رہی ہے ہر طرف سے مست خوشبو کی لپٹ
وادیاں قدرت نے ہیں پھولوں سے مہکائی ہوئی
کاش میں بھی دیکھ سکتی، یہ مناظر ایک بار
سبزہ و گل کی ہے کیا کچھ محفل آرائی ہوئی
رات دن، شام وسحر، یکساں ہیں سب میرے لئے
اک سیاہی سی ہے ہر دم ہر طرف چھائی ہوئی
سنتی ہوں یہ محفلِ ہستی بہت دلچسپ ہے
اس کے ہر ذرّہ پہ ہیں رنگینیاں چھائی ہوئی
سنتی ہوں تارے چمکتے ہیں فلک پر رات کو
جن کی تابانی سے ہیں شمعیں بھی شرمائی ہوئی
کوئی کہتا ہے زمیں سے آسماں تک ہو فضا
اور اس میں دھندلی رنگتیں چھائی ہوئی

میں سمجھتی ہوں کہ ہر سو اک دھوئیں کی نہر ہے
اور اس میں تیرتی پھرتی ہوں گھبرائی ہوئی
ایک دن کے واسطے آنکھیں جو مل جائیں مجھے
تو وہ سب کچھ دیکھ لوں جس سے ہوں ترسائی ہوئی
ہاں، مگر میرے نصیبوں میں نہیں کوئی خوشی
یوں تو دنیا میں سبھی پر لطف فرمائی ہوئی
میرے مالک! رحم! مجھ کو میری آنکھیں بخش دے
مجھ سے غافل کیوں تری شانِ مسیحائی ہوئی
الغرض وہ اس طرح کی آرزو دل میں لئے
جا رہی ہے اپنے گھر کی سمت گھبرائی ہوئی

پہلا خط

ایک بیوی کی طرف سے اپنے شوہر کے نام

لیلائے رازِ شوق کا محمل ہے ہات میں
یعنی بجائے خامہ مرا دل ہے ہات میں
احوالِ دل لکھوں، خلشِ مدعا لکھوں؟
رکتی ہوں لفظ لفظ پہ آخر میں کیا لکھوں؟

دل اپنی دھڑکنوں کو چھپا جائے کس طرح
پہلے پہل کا خط ہے لکھا جائے کس طرح!
لکھنے کو تو میں لکھتی ہوں تم کو ہزار خط
لکھ لکھ کے پھاڑ دیتی ہوں پر بار بار خط
گستاخی کا خیال گر آئے تو کیا کروں؟
دل شرم سے جو بات دبائے تو کیا کروں؟
خط کے خیال نے مجھے تم سے رلا دیا!
اور میری بے خودی پہ قلم مسکرا دیا!
پہلے پہل کی مشق کو مجبور جانیئے!
بے ربطیٔ خیال کو معذور جانیئے
مجھ سے بیانِ شوق کو ظاہر کیا بھی جائے
لکھنے کا حوصلہ ہے مگر کچھ لکھا بھی جائے
کیا میری بے خودی کا پتہ پا گیا ہے کچھ؟
کاغذ سے جھک کے میرے قلم نے کہا ہے کچھ
کر جائے گا خفا کہ ہنسا جائے گا یہ خط
اللہ! کس نظر سے پڑھا جائے گا یہ خط
پہلے پہل کے خط میں، میں کیا ماجرا لکھوں
کہہ دو" یہ کیا لکھا ہے"" بس کہتی ہوں" کیا لکھوں"

طاری جو اک ہجومِ خیالات دل پہ ہے!
اک ہات میں قلم ہے اور اک ہات دل پہ ہے!

بازی گاہِ ہستی

یہ دنیا جو عدم کی خاک کے پُتلوں کی بستی ہے
حقیقت میں اگر دیکھو تو بازی گاہِ ہستی ہے

بساط اک خاک کی، اُستادِ قدرت نے بچھادی ہے
ہماری زندگی اک کھیل کی صورت بنادی ہے

جو تازہ وارد اس بازیچۂ رنگیں میں آتا ہے
دماغی روشنی میں اک نہ اک بازی لگاتا ہے

مصنّف اپنے ہیجانِ قلم سے کام لیتا ہے
سپاہی اپنی شمشیرِ دو دم سے کام لیتا ہے

مدبّر کی دماغی طاقتیں ہوتی ہیں صرف اس میں
مقنّن کو بنانے پڑتے ہیں کچھ خاص حرف اس میں

اطبّا سارے اگلے پچھلے نسخے یاد کرتے ہیں!
مریض اپنے ہر اک آرام کو برباد کرتے ہیں

شرابی ناصیہ سائے درِ پیرِ مغاں ہو کر
مؤذّن بادلِ ناخواستہ، محوِ اذاں ہو کر

معلم چند پارینہ کتابوں پر نظر رکھ کر
وکیل از یادرفتہ چند جرموں کی خبر رکھ کر
کسان، ابر و ہوا کے ساتھ محنت کی نمائش سے
بہادر جنگ میں جوشِ شجاعت کی نمائش سے
حصولِ علم میں جو شمع کی صورت پگھلتا ہے
حقیقت میں اسی بازی کی وہ بھی چال چلتا ہے!
غرض بازیچۂ دُنیا میں جو سیاح آتا ہے
یُونہی ہر ایک اپنی اپنی بازی کھیل جاتا ہے

عورت

حیات و حرمت و مہر و وفا کی شان ہے عورت!!
شباب و حُسن و انداز و ادا کی جان ہی عورت
حجاب و عصمت و شرم و حیا کی کان ہے عورت
جو دیکھو غور سے ہر مرد کا ایمان ہے عورت
اگر عورت نہ آتی کل جہاں ماتم کدہ ہوتا
اگر عورت نہ ہوتی ہر مکاں اک غم کدہ ہوتا
جہاں میں ایک سچے مرد کی تقدیر ہے عورت!
طلسمِ عالمِ بالا کی اک اکسیر ہے عورت!

یدِ قدرت میں اک چلتی ہوئی شمشیر ہے عورت
زمیں پر فطرتِ معصوم کی تصویر ہے عورت
جہاں میں کرتی ہے شاہی مگر لشکر نہیں رکھتی
دلوں کو کرتی ہے زخمی مگر خنجر نہیں رکھتی
کہیں معصوم طفلی اس کے نغموں سے بہلتی ہے
کہیں بے خود جوانی اس کے نوشِ لب سے پھلتی ہے
کہیں مجبور، پیری اس کی باتوں سے سنبھلتی ہے
کہیں آرام سے جاں اس کے قدموں پر نکلتی ہے
نہیں ہے کبریا لیکن یہ شانِ کبریائی ہے
ہماری ساری پیاری عمر پر اس کی خدائی ہے
اُسی کی بو ہے دُنیا کے لہکتے غنچہ زاروں میں!
اُسی کا رنگ گلشن کی مہکتی نو بہاروں میں
اُسی کے نغمے جنّت کے مچلتے آبشاروں میں
اُسی کا نور، قدرت کے بہاریں جلوہ زاروں میں
بہارِ آفرینش ہے شبابِ زندگانی ہے!
جواں فطرت کا اک کھویا ہوا خوابِ جوانی ہے!
وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے
وہ ہنستی ہے تو فطرت، بے خودی سے مسکراتی ہے

وہ سوتی ہے تو ساتوں آسماں کو نیند آتی ہے
وہ اٹھتی ہے تو کل خوابیدہ دُنیا کو اٹھاتی ہے
وہی ارمانِ ہستی ہے! وہی ایمانِ ہستی ہے!
بدن کہیئے اگر ہستی کو تو وہ جانِ ہستی ہے!
وہ چاہے تو الٹ دے پردۂ دُنیائے فانی کو
وہ چاہے تو مٹا دے جوشِ بحرِ زندگانی کو
وہ چاہے تو جلا دے نخل زارِ حکمرانی کو!
وہ چاہے تو بدل دے رنگِ بزمِ آسمانی کو
وہ کہہ دے تو بہارِ جلوہ مٹ جائے نظاروں سے
وہ کہہ دے تو لباسِ نور چھن جائے ستاروں سے

حُسنِ معصوم
اور
اُس کی محافظ حُور

تمام بستی کو آگ اک آتشیں ترانہ سنا رہی تھی!
فضائے شب گوں میں سرخ شعلوں کا تند طوفاں اٹھا رہی تھی
مکان ہو یا مکیں ہو ہر اک کو اک سرے سے جلا رہی تھی
بھڑکتی، بڑھتی، مچلتی، اٹھتی، تڑپتی، لہراتی آ رہی تھی

غریب لوگوں کے شور و شیون سے ایک ہنگامہ سا بپا تھا!
خدا کا قہر ایک آتشیں سیل بن کے گویا اُبل پڑا تھا!
غرض، جہاں یہ مہیب شعلے ہر اک مکاں کو جلا چکے تھے
وہیں کسی خستہ جاں کے گھر کو بھی شعلہ ساماں بنا چکے تھے
مکیں تھے جتنے وہاں ہر اک کا چراغِ ہستی بجھا چکے تھے
بس ایک ننھی سی جاں تھی جس پہ ابھی وہ قابو نہ پا سکے تھے
اِدھر سے شعلوں میں گھر رہی تھی اُدھر سے شعلوں میں گھر رہی تھی
یہاں وہاں، گرتی پڑتی، دیوانہ وار کمرے میں پھر رہی تھی
وہ اس کا معصوم و سادہ حسن اور وہ اس کا چہرہ گلاب کا سا
وہ کچھ رسیلی کنول سی آنکھیں وہ ان میں نشہ شراب کا سا
وہ اُس کی مبہوت بے حجابی، وہ اس پہ عالم حجاب کا سا
وہ اس کی شاداب کم سنی اور وہ اُس کا نقشہ شباب کا سا
وہ بال جن پہ گماں تھا اُن سے ہزاروں رنگیں جھلک پڑیں گی
وہ لب کہ ہر دم خیال ہوتا تھا اب شرابیں چھلک پڑیں گی!
وہ اک پری تھی کہ آسماں سے کوئی ستارہ اچھل پڑا تھا
کہ خلد کا کوئی پھول، اس تیرہ خاک داں میں مچل پڑا تھا
شرابِ کوثر کا جاندار اک حسین قطرہ ابل پڑا تھا
کہ ذہنِ فطرت سے اک اچھوتا خیال باہر نکل پڑا تھا!

یقیناً ایسی کہ شاعر اہنگِ فکر کا منتہا بنا لیں!
اور اس کے آگے بڑھیں تو مجھ کو خبر نہیں کیا ہے کیا بتا لیں
غرض کہ قسمت جب اسکو ان ہولناک شعلوں میں کھینچ لائی!
ستارے غصے سے کانپ اٹھے زمین دہشت سے تھرتھرائی
یہ دیکھ کر دستِ ابرِ رحمت نے اپنی دریا دلی دکھائی
اشارہ پاکر بہشت سے ایک ماہِ تمثال اڑ کے آئی!
خیال کی آنکھ دیکھتی ہے کہ آگ ساری بجھی پڑی ہے!
اور ایک لڑکی کو حور آغوشِ نازنیں میں لئے کھڑی ہے!

ایک سہیلی کا پیغام

دوسری کے نام

کیوں نہ رہ رہ کے اٹھے دل سے فغاں تیرے بغیر
میری عذرا دشمنِ جاں ہے جہاں تیرے بغیر۔
باغ صحرا بن گئے اور پھول کانٹے ہو گئے
جنتِ لاہور ہے وقفِ خزاں تیرے بغیر
ایک دن لاہور تھا، سارا جہاں میرے لئے
آج ہے بے کیف یہ سارا جہاں تیرے بغیر

پیاری عذرا دور ہی سے اک نگاہِ التفات
کر رہا ہے ظلم ہم پہ آسماں تیرے بغیر
تیری قربت ، مایۂ تسکینِ دل تھی، اے سکھی!
پھر ستاتا ہے ہمیں دورِ زماں تیرے بغیر
کون لے جائے ہمیں تیری طرح اصرار سے
کون جائے بہرِ سیرِ گلستاں تیرے بغیر
چاندنی راتوں میں جاتے ہیں پہاڑی پر مگر
کاٹے کھاتا ہے پہاڑی کا سماں تیرے بغیر
کس قدر بے تاب ہے قلبِ حزیں تیرے لئے
کس قدر مضطر ہے جانِ ناتواں تیرے بغیر
آ! بنا لوں زندگی کو نغمہ زارِ انبساط
زندگی ہے وردِ آبادِ فغاں تیرے بغیر
پچھلے وعدے یاد کر، پچھلی وفائیں یاد کر
بے وفا! کب تک رہوں محوِ فغاں تیرے بغیر
رہگذر پر ناز سے اب پھول برسائے گا کون؟
کیا کریں اب جا کے سوئے گلستاں تیرے بغیر
جا کے کہہ دینا سبک ساراں مرحلے سے صبا
غرقِ موجِ غم ہے، دل کا کارواں تیرے بغیر

چاک ہونے کو ہے دامانِ بہارِ زندگی
تاک میں ہے خارِ مرگِ ناگہاں تیرے بغیر
وادیٔ سرحد کے اوجِ سیاحت آشنا!
زندگی ہے ایک خوابِ رائگاں تیرے بغیر
آہ تیرے ہجر سے پہلے کسے معلوم تھا!
یوں ستائے گا یہ ظالم آسماں تیرے بغیر
میری عذرا سے خدارا کوئی اتنا جا کہے!
ہو رہے ہیں مہرباں، نامہرباں تیرے بغیر
بے مروّت! تو نہ بھیجے بھول کر بھی خط کبھی
اور جُدائی کی سہیں ہم سختیاں تیرے بغیر
دن کو ہیں بے نا بیاں، راتوں کو ہیں بےخوابیاں
مر مٹے تیرے بغیر، اے جانِ جاں تیرے بغیر
کیوں یہ خیاؔطی کے لب ہوں شکوہ سنجِ درد و غم
کر رہا ہے تنگ دورِ آسماں تیرے بغیر

ماؔمتا

وُہ جذبہ جو سائے جذبوں کا منتہا ہے
دُنیا میں نام اس کا اک ماں کی مامتا ہے

آغوشِ ناز گنجِ اقبال سے بھرا ہے
یا خواب، رُوحِ مستِ تعبیر ہو رہا ہے
رہ رہ کے مامتا کا اظہار کر رہی ہے
بے تاب ہو رہی ہے اور پیار کر رہی ہے

جذباتِ مادری کا اعجاز کہیئے اس کو
روحانیت سے لبریز اک ساز کہیئے اس کو
حوّا کے سوزِ جاں کی پرواز کہیئے اس کو
فطرت کے دردِ دل کی آواز کہیئے اس کو
الفت کی انتہائیں چہرے پہ چھا گئی ہیں!
دل کی امیدیں کھنچ کر چہرے پہ آ گئی ہیں!

جو نونہال زیبِ آغوشِ مدعا ہے!
اک پاک راز بن کر سینے میں رہ چکا ہے!
اب بھی مگر یہ عالم اک ماں کے پیار کا ہے!
گویا وہ راز اس کے دل ہی میں سو رہا ہے!
دیوانہ وار اس کے گالوں کو چومتی ہے
آنکھوں کو چومتی ہے، بالوں کو چومتی ہے

دنیا یہی ہے اور اس کی دین بھی یہی ہے
پہلوئے سادگی کی تزئین بھی یہی ہے
غم ہائے زندگی میں تسکین بھی یہی ہے
ہاں ماں کی مامتا کا آئین بھی یہی ہے

بچّے سے خوش پر اُن کے خوابوں میں کھو رہی ہے
اک آنکھ ہنس رہی ہے اک آنکھ رو رہی ہے

چاندنی رات میں

مغلیہ شہزادیوں کی چوگان بازی

حصارِ دہلی پہ ماہِ تاباں بساطِ سیمیں بچھا رہا ہے
کہ آسماں سے کوئی فرشتہ، زمیں پہ موتی لٹا رہا ہے
افق کی دُھندلی فضاؤں میں کوئی مرمریں گرد اڑا رہا ہے
زمین کا چپہ چپہ پارے کی ندیوں سے نہا رہا ہے
جگہ جگہ، آسمان پر، خوشنما ستارے جڑے ہوئے ہیں
اِدھر کوئی جھلملا رہا ہے! اُدھر کوئی جگمگا رہا ہے
ہواؤں کے ہلکے ہلکے نغمے کچھ اس ادا سے بکھر رہے ہیں
کہ جیسے کوئی تھکا ہوا گانے والا کچھ گنگنا رہا ہے

وہ دیکھو! چوگان بازی میں محو مغلیہ شاہزادیاں ہیں
جو دیکھ لے شاعر ان کے چہرے تو بول اُٹھے ماہزادیاں ہیں

ہوا میں تیزی سے اس طرح اپنا اپنا گھوڑا بڑھا رہی ہیں
کہ جیسے پریاں، زمیں سے اُڑ کر دیارِ انجم کو جا رہی ہیں
یہ ان کی اُٹھتی جوانیاں ہیں، جوانیاں ہیں دیوانیاں ہیں
کہ حسن کی کچھ کہانیاں ہیں، جو ذہنِ شاعر پہ چھا رہی ہیں
حسین پھولوں کے دامنوں پر نشہ میں لہرا رہے ہیں کالے
کہ ان کی کافر سواد زلفیں لٹک کے شانوں پہ آ رہی ہیں
پڑی ہے سبزہ کے فرش پر ایک ململی گیند جس کے پیچھے
وہ اپنے گھوڑے اُڑا رہی ہیں، ادا سے چوگاں بڑھا رہی ہیں

یہ گیند ہے یا اُبھر رہا ہے حسین چہروں پہ تل کسی کا!
کہ گر پڑا ہے مچل کر ان کی سیاہ زلفوں سے دل کسی کا!

عید!

دنیا کو ایک عرصہ سے تھا انتظارِ عید
شکرِ خدا کہ پھر نظر آئی بہارِ عید
دوڑی خوشی کی لہر رگِ کائنات میں
ہر ذرّہ سے مچل پڑا کیفِ بہارِ عید

بچھڑی ہوئی سہیلیاں یوں ملتی ہیں گلے!
ہو جس طرح کہ عید کوئی ہمکنارِ عید

دُنیا سرور و نور کی لہروں میں غرق ہے
کس درجہ جانفزا ہے نسیمِ بہارِ عید

معصوم بچے جاگتے ہیں کس خوشی سے آج
گویا کہ ہیں ملائکِ شب زندہ دارِ عید

کوثر لٹاتی آتی ہیں مستانہ بدلیاں!
کہ تشنہ لب رہے نہ کوئی میگسارِ عید

رحم اے ہوائے صبح! غریب الوطن ہیں ہم
ہم کو سُنا نہ مژدۂ بے اختیارِ عید

تاروں کی بستی!

شرابِ نور میں ڈوبی ہوئی تاروں کی بستی ہے
قمر پاروں کی بستی ہے

بہشتِ حسن کے بکھرے ہوئے پاروں کی بستی ہے
کہ گلزاروں کی بستی ہے

پریٔ فطرت اک دوشیزۂ زہرہ جبیں ہو گی!
حسین و نازنیں ہو گی

یہ اس کے قصرِ رنگیں کے نگہداروں کی بستی ہے
نمک خواروں کی بستی ہے

حسینانِ فلک، مصروف ہیں جلوہ فروشی میں
قمر کی تاج پوشی میں

دیارِ کہکشاں کے شوخ رفتاروں کی بستی ہے
طرحداروں کی بستی ہے

فضاؤں میں مقدس مستیاں سی چھائی جاتی ہیں ہوائیں مسکراتی ہیں
خراباتِ الٰہیّت کے سرشاروں کی بستی ہے یہ میخواروں کی بستی ہے

بانسری کی آواز!

برسات کا یہ موسم یہ نیلگوں گھٹائیں!
یہ باغ و بَن کا عالم یہ گل فشاں فضائیں
یہ رس بھری ہوائیں

یہ رنگ و بو کے طوفاں یہ بُرج کے نظارے
یہ جنّتی خیاباں جمنا کے یہ کنارے
یہ سین پیارے پیارے

دامانِ گلستاں میں! یہ سبزہ کی بہاریں
آغوشِ آسماں میں! یہ بگلوں کی قطاریں
یہ مینہ کی پھواریں

یہ کوئلوں کی کُوکُو! یہ مور کی صدائیں!
یہ نازنین آہو! اور یہ غریب گائیں!
یہ نشہ گوں فضائیں

سبزہ نکھر رہا ہے! وادی مہک رہی ہے
نشہ بکھر رہا ہے! بلبل چہک رہی ہے!

فطرت بہک رہی ہے

ٹھہرو! اگر یہ آواز
دیکھو! کہاں سے آئی
یہ نکہتِ فسوں ساز
کس گلستاں سے آئی
کس آسماں سے آئی

یہ بانسری کی لَے ہے
یہ جانِ بے خودی ہے
یہ نغمہ ساز مے ہے
یہ کانِ بے خودی ہے
ایمانِ بے خودی ہے

اس بانسری کی لَے میں
اللہ کیا اثر ہے!
اس اُڑنے والی مے میں
کیا سحر کار گر ہے!
جو ہے وہ بے خبر ہے

یہ کون اس سمے میں!
بنسی پہ گا رہا ہے!
اس درجہ مست لَے میں
بنسی بجا رہا ہے!
نغمے سنا رہا ہے

دیکھو! تو پاس چل کر!
شاید ہے کوئی جوگی!
یا گاؤں سے نکل کر!
آیا ہے کوئی روگی!
سنسار کا بروگی

شاید کوئی رشی ہے
سنیاس کی لگن میں
شاید کوئی مُنی ہے
مصروف کیرتن میں

توحید کے بھجن میں

ہاں آؤ پاس چل کر! پوچھیں کہ نام کیا ہے
تلوؤں سے آنکھیں مل کر پوچھیں کہ کام کیا ہے
اس کا پیام کیا ہے

ٹھہرو! نذرانہ لگا ہیں پہچانتی ہیں اس کو
قدرت کی جلوہ گا ہیں سب جانتی ہیں اس کو
اندر جانتی ہیں اس کو

ہاں ہاں یہ بنسی والا چوکی منظر ہماری!
گجرات کا گوالا! ہے کرشنا مراری!
اور آرزو ہماری

کیا چشم سرمگیں پر! فتنے اُبھر رہے ہیں
اور رو دِ دلکش نازنیں پر! گیسو بکھر رہے ہیں
پھر بنسی سنور رہے ہیں

اک جوشِ سرمدی ہیں بنسی بجا رہا ہے!
دنیائے بے خودی ہیں فتنے اُٹھا رہا ہے!
محشر جگا رہا ہے!

بنسی ہیں ہے پریشاں! نغمے مچل رہے ہیں
یا سینکڑوں گلستاں کروٹ بدل رہے ہیں

اور پھول اُگل رہے ہیں

دنیا پہ اس کی لَے سے مدہوشی چھا گئی ہے
گھبرا کے اس نشے سے (جو وہ لٹا گئی ہے)
خود فطرت آ گئی ہے

یہ نغمے سن کے فطرت کھوئی سی جا رہی ہے
موسیقیٔ محبت! کے زخم کھا رہی ہے
اور مسکرا رہی ہے!

عبادت

ایک دفعہ سلمیٰ بیمار ہوئیں، تو اختر نے یہ منظوم خط لکھا

تندرستی کا گلہ کیا ہے شکایت کیا ہے
میری بیمار بتا تو تری حالت کیا ہے
عشق بیماری ہے اور کتنی حسیں بیماری
کیا خبر بے خبروں کو کہ یہ لذت کیا ہے
ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یارب!
آج احساس ہوا ہے کہ علالت کیا ہے

رو دئیے جب بھی سُنی درد بھری کوئی خبر
درد ہی درد ہے یارب کہ طبیعت کیا ہے

ان کی صحت کی خبر آئے گی جلد آئے گی!
دلِ ناداں تجھے آخر کو یہ وحشت کیا ہے

سامنے ہوں تو فدا کر دیں دل و جاں ان پر
ہم نہیں جانتے اختر کہ عیادت کیا ہے

سالگرہ!

اختر کے دوست نیّر واسطی کے بچہ کی سالگرہ پر یہ نظم لکھی گئی ہے۔

سنا رہی ہے نویدِ بہار سالگرہ
مسرتوں کی ہے پروردگار سالگرہ

زبسکہ سالگرہ ہے میاں سکندر کی
بجا ہے کہیئے سکندر وقار سالگرہ

سما رہی ہے نگاہوں میں بن کے عالمِ کیف
بسا رہی ہے دلوں میں بہار سالگرہ

دیارِ فارس سے آئی ہے حُور کی صورت
مسرّتیں لئے بہرِ نثار سالگرہ

خوشی کے پھول برسنے لگے فضاؤں سے
لُٹا رہی ہے بہشت و بہار سالگرہ
خوشی سے پھولے سماتے نہیں ہیں خورد و کلاں
بڑھا رہی ہے ہر اک دل میں پیار سالگرہ
اسی فروغ سے تا حشر بار بار آئے!
دعائیں کرتی ہے یہ بار بار سالگرہ
دعا ہے عمرِ سکندر کا رشتۂ محکم!
اسی بہار سے دیکھے ہزار سالگرہ
خوشی سے رقص کریں مل کے ساقی و اخترؔ
پلا رہی ہے مئے خوشگوار سالگرہ

رونقِ کاشانہ آگئی

نیرؔ واسطی کی بیوی اور بچی (رخسانہ) کی واپسی پر جو ناراض ہو کر چلی گئی تھیں

دل کا سکوں لئے ہوئے رخسانہ آگئی
نیرؔ کدے میں رونقِ کاشانہ آگئی
بھوپال کی خبر ہے کہ بھاوج بھی آگئیں
بھائی کے گھر میں عشرتِ جانانہ آگئی

اپنے پرائے آج محبت سے خوش ہوئے
ہر ایک کو گماں ہے کہ سلطانہ آگئی

بھائی گئے تھے لینے فقیرانہ جس کو وہ
لاہور میں بہ شوکتِ شاہانہ آگئی

آنے کا ان کے سب کو ہوا اُن کے یہ خیال
وہ جانِ کعبہ، روحِ صنم خانہ آگئی

نیّر کے دل کو آج نہ ہو کس طرح خوشی
وہ رشکِ صد پری و پری خانہ آگئی

مانا خلوص میں ہوئی جو کچھ ہوئی کمی!
شمعِ خلوص کی وہی پروانہ آگئی

ہر چند تھی خفا، مگر اظہارِ شوق پر
بھاوج ہماری اخترِ دیوانہ آگئی

ختم شد